ماہنامہ
فاران

جلد ۱۷ | ماہ مئی ۱۹۶۵ء | شمارہ ۲

ترتیب

چندہ سالانہ: سات روپے

مقام اشاعت: دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

پبلشر: مسرور حسین

طابع: انٹرنیشنل پریس کراچی

قیمت فی پرچہ: ۶۲ پیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

"اقامتِ دین" ایک جامع کلمہ ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت و خیر خواہی اور اُسے عملاً برپا کرنے کی ہر کوشش اور جدوجہد شامل ہے۔ دل سے، زبان سے، ہاتھ سے اور جان و مال کے ایثار سے ہر امکانی سعی اور تگ و دو اس کا موضوع ہے! "اقامتِ دین" کی جدوجہد میں اللہ تعالیٰ کی خشیت، اُس کی رضا کے حصول کا جذبہ اور آخرت کی نجات و فلاح کا تصور و عقیدہ اس طرح شامل — اور گھلا ملا ہوا ہے، جیسے پھول میں خوشبو، چاندنی میں اُجالا اور شہد میں مٹھاس! اقامتِ دین کی جدوجہد میں دین و دنیا کے مسائل اور جسم و روح کے تقاضوں کا وہ صحیح امتزاج پایا جاتا ہے جو دین میں مطلوب ہے۔

اقامتِ دین کی تحریک کسی خلا، قبرستان یا ویرانے میں نہیں انسانوں کی آبادیوں میں چلا کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی اس وسیع زمین پر ملکوں، خطوں، آبادیوں اور ریاستوں کے مختلف حالات اور شئون و مظاہر ہوتے ہیں، اس جدوجہد میں حالات کی نزاکتوں، مصلحتوں اور ساتھ ہی دینی تقاضوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے، اس مقصد کے حصول کے ذرائع حالات کے اعتبار سے بدل سکتے ہیں دنیا کے ہر ملک اور ہر خطہ میں ایک ہی منہاج اور کسی خاص لگے بندھے انداز پر اس تحریک کو نہیں چلایا جاتا۔ اقامتِ دین کے علمبرداروں کو مسجد و مدرسہ اور خانقاہوں ہی سے نہیں ایوان ہائے تجارت، مزدوروں کی یونینوں، صنعت گاہوں، پارلیمنٹوں، حکومت کے اداروں اور سیاسی جماعتوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے، اس لئے بعض اوقات اس راہ میں ایسے پیچیدہ موڑ بھی آتے ہیں کہ دین ہی کی خیر خواہی کے لئے کبھی کبھار بادل ناخواستہ "اہون البلیتین" کو "بہ سبیل تنزل" گوارا کرنا پڑ جاتا ہے، ایسے موقعوں پر وہ لوگ جو ساحل ہی سے طوفان کا تماشا کرتے ہوتے ہیں، چیخنے چلّانے اور شور مچانے لگتے ہیں کہ اقامتِ دین کی یہ دعوت دینے والے تو اپنے موقف سے ہٹ گئے، یہ جماعت تو گمراہ ہوگئی، ان لوگوں نے تو دین و شریعت کو رسوا کر دیا...... وہلم جرا!

کوئی شک نہیں کہ دین کے ارکان و احکام اور شریعت کی قدروں اور معمولی سے معمولی جزئیہ کی حفاظت و احترام کے لئے وہ عزیمت، جوش و ولولہ اور دینی غیرت درکار ہے جس کا مظاہرہ حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مانعین زکوٰۃ کے ساتھ کیا تھا! مگر ایسا موقعہ اگر کبھی پیش آجائے کہ ایک طرف مسجد کے ڈھانے کا سوال ہو اور دوسری طرف مسجد سے ملحق فوٹوگرافر کی دکان بحال رکھنے کی شرط، تو ایسی صورت میں اس شرط کو نظر انداز کر کے مسجد کا ڈھایا جانا کون ہوشمند مسلمان گوارا کر سکتا ہے! اس شرط کو بادل ناخواستہ عارضی طور پر گوارا کر کے اس کی جدوجہد کی جائے گی کہ فوٹوگرافر کی دوکان کسی طرح وہاں سے ہٹ جائے اور مسجد کو منہدم ہونے سے بچا لیا جائے، حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے احتساب کا ایک تو وہ عالم تھا کہ حضرت عیاض بن غنم کو گورنری سے معزول کر کے صوف کے کپڑے پہنا کر بکریاں چرانے کے لئے جنگل میں بھیجا گیا اور دوسری طرف حضرت امیر معاویہؓ کے ترفہ اور امیرانہ زندگی کو گوارا کیا گیا، کیا کوئی مسلمان اس انداز پہ سوچ کر اپنی عاقبت خراب کر سکتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے یہاں عمل و احتساب کا تضاد پایا جاتا ہے اور وہ معاذ اللہ اپنے موقف سے کبھی ہٹ بھی جایا کرتے تھے، حالانکہ حق یہ

مقدار میں بہت کم یکسر نہیں پائی جاتی، مگر عام اصول یہ ہے کہ خیر و شر اور صواب و ناصواب میں جس چیز کی کمیت و کیفیت غالب ہوتی ہے اُسی کا حکم لگایا جاتا ہے، مثلاً فتاویٰ عالمگیری میں قرآن کے منظوم ترجمہ کو "کفر" بتایا گیا ہے، یہ فتویٰ اپنی جگہ درست نہیں ہے مگر یہ اور اس قسم کی اور کمزوریوں کے ہوتے ہوئے فتاویٰ عالمگیری قابلِ قدر کتاب ہے، اسی طرح ہمارے زمانے کے بعض علمار نے اس افراط کے مقابلہ میں یہ تفریط اختیار کی کہ قرآن کریم کے منظوم ترجمہ پر تحسین آمیز پیش لفظ اور دیباچے لکھے، عجیب تضاد ہے کہ فتاویٰ عالمگیری میں جس فعل کو "کفر" کہا گیا ہے، اُس فعل کی یہ علمار کرام اور مفتیان عظام تحسین فرماتے ہیں، اس قسم کے تسامحات اور غلطیوں کے باوجود ان علمار کا احترام کیا جاتا ہے۔

متحدہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جمہور علماء نے تحریکِ آزادی میں حصہ لیا خاص طور سے دیوبند کے اکابر علماء نے اس تحریک کی قیادت کی مگر حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ تحریکِ مذکور سے بے تعلق اور الگ تھلگ ہے دوسری طرف بعض علمار نے شردھانند جیسے معاندِ اسلام کو انگریز دشمنی کے جذبہ اور آزادی کے جوش میں جامع مسجد دلی کے منبر پر تقریر کرنے کے لئے بٹھا دیا! اس افراط و تفریط کے باوجود دینی رہنماؤں اور سیاسی لیڈروں کو گمراہ اور منہدم دین و شریعت نہیں ٹھیرایا گیا، متحدہ ہندوستان کے علمار کی غالب اکثریت نے انگریزوں سے موالات کو ناجائز اور حرام قرار دیا، پھر چند برس کے بعد ملک کی آزادی کی خاطر جن قانون ساز اداروں اور حکومت کی ملازمتوں کا بائیکاٹ کیا گیا تھا، اُن سے تعاون و اشتراکِ عمل کیا گیا، مگر ہماری نگاہ سے آج تک اس قسم کی تنقید نہیں گزری کہ ان علمار کرام نے اپنے قول و فعل سے تضاد اور دورنگی کا ثبوت دیا جو چیز اُن کے نزدیک ایک زمانے میں شرعاً ناجائز اور حرام تھی وہ کچھ دنوں کے بعد جائز کیسے ہوگئی؟ انگریزوں سے ترکِ موالات (NON COOPERATION) کے بعد یہ "موالات" (COOPERATION) کیوں؟؟ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی بعض تحریروں سے جو لوگ "تضاد" ثابت کرتے ہیں اور سیاسی حالات اور اُس کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں، کاش! وہ انگریزوں سے ترکِ موالات اور پھر موالات کے بارے میں جو علمار کا موقف رہا ہے، اس پر غور فرمائیں تو اُن کے ذہن کی بہت سی الجھنیں دُور ہو سکتی ہیں!

انگریز کے دور میں ہندوستان کے بعض علمار نے جن میں علمار دیوبند کے نام سرِ فہرست نظر آتے ہیں ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر اس کا فتویٰ دیا کہ یہاں کے مسلمان ہجرت کر کے کسی دارالاسلام میں چلے جائیں، اس فتوے کے جو پریشان کن نتائج برآمد ہوئے، اس کا حال ظفر حسن (ایم۔اے) سے سنئے، جو اپنی دینداری، فکر و عمل اور انگریزوں کے خلاف عملاً باغیانہ جدوجہد میں خاصی شہرت رکھتے ہیں:-

"نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں سادہ لوح مسلمان اپنے گھر بار سے محروم ہوئے، افغانستان پر مالی بوجھ پڑا، ہندوستانی مسلمان افغانوں سے اور افغان ہندوستانی مسلمانوں سے کبیدہ خاطر ہوئے، اگر کسی نے اس سے فائدہ اُٹھایا تو وہ انگریز تھے" (الفرقان ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ)

سیاسی کشمکش اور سیاست و حکومت کے مسائل و معاملات میں بعض اندازے بھی غلط نکلتے ہیں، سیاسی احوال و کوائف کو دین و شریعت کے تقاضوں سے تطبیق دینے میں اونچ نیچ بھی ہو جاتی ہے فلاں چیز "اضطرار" کی حالت تک واقعی پہونچی ہے یا نہیں، اس بارے میں بھی علمار کے درمیان اختلاف واقع ہو جاتا ہے مگر ان تمام تسامحات اور کمزوریوں کے باوجود علمار کرام سے دین و شریعت کا انہدام منسوب نہیں کیا نہ اُن کے بارے میں عوام کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ان بزرگوں سے "خیر" کی توقع ہی نہیں رہی، یہ تو دین و ملت کے لئے "فتنہ" بن گئے ہیں۔

آج جو اہلِ قلم اور اربابِ علم و فکر جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کو دین و ملت کے لئے "فتنہ" قرار دے رہے ہیں!

ے علماء دینی اداروں اور جماعتوں کے ساتھ یہ سلوک روا نہیں رکھا، وہاں ان حضرات نے ان کی کمزوریوں پر نہیں خوبیوں پر نگاہ
خیر کا حکم لگایا ہے، مگر جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کی صرف کمزوریوں پر نگاہ پڑتی ہے اور ان کی خوبیوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے
نصافی کے ظہور میں آنے کی دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو جماعت اور مودودی صاحب کے معاملہ میں ان حضرات کی نگاہیں صرف "عیب بیں" ہو
ئی ہیں اور ان میں محاسن دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی یا پھر جان بوجھ کر ایسا کیا جاتا ہے کہ ان کے تسامحات اور کمزوریوں کو تو خوب
تے ہیں مگر ان کے محاسن اور خوبیوں کا ذکر تک نہیں کرتے، حالانکہ ہندوستان اور پاکستان کے اکثر و بیشتر شہروں اور قصبوں میں ایسے
ن ملیں گے، جو جماعت اسلامی سے قرب و تعلق کی بدولت دین سے قریب ہوئے ہیں اور کتنے ملحدوں اور کمیونسٹوں کو توفیقِ ایمان کی
ن نصیب ہوئی ہے، پھر خود جماعت کے ارکان کی زندگیاں ہیں، جن میں خشیت، دین کی محبت، ارکانِ اسلام کی پابندی، صدق
اور اکلِ حلال ملتا ہے، وابستگانِ جماعت میں کتنے ایسے ہیں جنہوں نے اللہ اور رسول کی خاطر نہ صرف ملازمت بلکہ آمدنی کے مشتبہ
ع کو چھوڑا ہے! انہوں نے حق کی خاطر قید و بند کی مصیبتیں بھی اٹھائی ہیں! خدا کے لئے انصاف سے بتایئے کہ اس دورِ انحطاط میں
تقویٰ اور شرافتِ نفس کے یہ نمونے قدر و ستائش کے قابل ہیں یا نفرت و مذمت کے مستحق ہیں، یہ شخصیتیں اور کردار دین و ملت کے
فتنہ ہیں یا "رحمت" ہیں!

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ایک جامع شخصیت کے حامل ہیں، تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، تاریخ، معاشیات، عمرانیات،
ن و دستور...... ان تمام موضوعات پر انہوں نے مقالے اور کتابیں لکھی ہیں، اُن کی تحریریں ہزارہا صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، اُن
تابوں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ بعض کتابیں ایک لاکھ سے بھی زاید تعداد میں چھپی ہیں، مولانا موصوف کی متعدد کتابوں کے ترجمے
کی مختلف پندرہ سولہ زبانوں میں ہوئے ہیں، خاص طور سے عرب دنیا نے اُن کی کتابوں کو قدر و ستائش کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور
و شام، الجزائر، عراق اور نجد و حجاز کے چوٹی کے اہلِ قلم اور علماء نے مولانا مودودی کی تحریروں کو سراہا ہے اور اُن کی دینی فکر کی
بت کا اعتراف کیا ہے، دین و شریعت کے خلاف آج جتنے علمی محاذ پائے جاتے ہیں، ہر محاذ پر مولانا موصوف نبرد آزما نظر آتے ہیں، اس دور
دو تشکیک اور عہدِ آزاد خیالی میں اُن کے قلم نے اللہ تعالیٰ کے دین کی جس جرأت و حوصلہ مندی، یقین و خود اعتمادی اور فراست و ذہانت
سے مدافعت کی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے، خاص طور سے اُن کی قوتِ استدلال کا جواب نہیں، اسلوبِ نگارش اور افہام و تفہیم کا انداز اس
ا دل نشین ہے کہ بڑے سے بڑے ملحد اور زندیق کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ؎

سا غر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

مولانا مودودی کی تحریروں نے زندگیوں میں دینی انقلاب پیدا کیا ہے، وہ اس دور کے صاحبِ دعوت مفکر اور عالمِ دین ہیں، انہوں
دین اور سچائی کی خاطر برسوں قید و بند کی مصیبتیں برداشت کی ہیں یہاں تک کہ پھانسی کا حکم سن کر بھی اُن کی پیشانی پر بل نہیں آیا، اس طرح
ںنے ایثار و قربانی کے سلسلۃ الذہب کو استوار کر دیا ہے اور کڑی سے کڑی ملا دی ہے، غلطیاں کس مصنف، عالم اور اہلِ قلم سے سرزد
ب ہوتیں، مولانا مودودی بھی انسان ہیں فرشتہ نہیں ہیں وہ بھی غلطیوں سے محفوظ نہیں ہیں، مگر کمیت و کیفیت کے اعتبار سے مجموعی طور پر
ں کی کتابیں اصابتِ فکر کی ترجمان اور خیر و فلاح کا مظہر ہیں!

——— لیکن ———

اُن کے معاندین نے اُن کی تحقیر کا کوئی پہلو اُٹھا نہیں رکھا، جس طرح وکیلوں کے محرر، کچہریوں کے عرائض نویس، پرائمری اسکولوں کے ہیڈ یا زمینداروں کے کارندے ہوتے ہیں، اُنہی کی سطح پر لاکر مولانا مودودی کو "منشی مودودی" لکھا جاتا ہے! ان لوگوں کے اندر یہ احساس کمتری پایا جاتا ہے کہ مولانا مودودی کی شخصیت جیسے اُن کے اکابر کی حریف بنی ہوئی ہے، لہٰذا شخصیت کے اس بت کو توڑنا ہی دینی خدمت اور اکابر کی عقیدت مندی کا عملی ثبوت ہے۔ حالانکہ دین کے معاملہ میں شخصیتوں کے ٹکراؤ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس قسم کی رقابتیں اور حریفانہ چشمکیں وہاں رونما ہوتی ہیں جہاں تحزب، گروہ بندی اور اکابر کی عقیدت مندی کا غلو پایا جاتا ہے، یہ باتیں ہم کسی خیالی مفروضے کی بنا پر نہیں کہہ رہے ہیں، ان حضرات کے مدرسوں سے طلباء اور اساتذہ جماعت اسلامی سے وابستگی رکھنے کے سبب نکالے گئے ہیں اور اس صریح ظلم کے بعد بھی ان کے علم و تقویٰ، شرافتِ نفس اور دینی اخوت پر ذرہ برابر آنچ نہیں آئی، یہ بزرگ مطمئن ہیں، بلکہ :—

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

عورت کی صدارت کے مسئلہ میں جماعت اسلامی پر ان حضرات نے جس انداز میں تنقید کی ہے، اس کی حق شناس دل و دماغ سے کسی عنوان توقع نہیں ہو سکتی، کتنے علماء ہیں جو اس مسئلہ میں جماعت کا موقف رکھتے تھے مگر ان سب کو چھوڑ کر صرف جماعت کو مطعون کیا گیا، پاکستان کے حالات کا پس منظر، اہون البلیتین کی فقہی حیثیت، پھر جماعت کا یہ اعلان کہ عورت کی امارت بے شک دین میں ممنوع ہے یہ اصول اپنی جگہ درست ہے، جس چیز کو وقتی طور پر اضطراری حالت میں گوارا کیا گیا ہے وہ آئندہ کے لئے نظیر بھی نہیں بن سکتی ان میں سے کسی توجیہ اور تاویل کو ان لوگوں نے قبول نہیں کیا، جماعت کے موقف کی کوئی تشریح ان کو مطمئن نہ کر سکی، اس مسئلہ میں ان حضرات کو اختلاف کرنے کا حق حاصل تھا، مگر اس اختلاف کو اس انداز میں پیش کیا گیا کہ جماعت نے اس مسئلہ میں "غلطی" نہیں کی بلکہ دین کے ستون کو گرا دیا ہے اور شریعت کو بے آبرو کر دیا ہے۔

اس نامنصفانہ اور جارحانہ تنقید کے بعد ہی جماعت اسلامی سے جناب کوثر نیازی کی علیحدگی کا سانحہ پیش آ گیا جس کا ان حضرات نے جس مسرت و شادمانی اور انشراحِ قلب کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے وہ جماعت سے ان کی دشمنی کا کھلا ہوا مظاہرہ ہے، دلوں میں اب تک جو چھپا ہوا تھا وہ باہر آ گیا ہے، حالانکہ جماعتوں میں لوگ داخل ہوتے اور نکلتے بھی رہتے ہیں، ارکان کو کچھ شکایتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں آپس کی گفتگوئیں، تنقیدیں، بدگمانیاں بھی افتراق کا سبب بن جاتی ہیں! اس اختلاف کی بھنک پا کر اگر سرگودھا، لائل پور اور تدبرِ قرآن کے ایوان واقع رحمٰن پورہ لاہور کی طنابیں کھینچ کر حرکت میں نہ آ جاتیں، تو مولانا کوثر نیازی خاموشی کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہو جاتے مگر خط و کتابت غالباً پریس میں نہ آتی، اس نوبت پر ہم اس سے زیادہ کچھ عرض کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

ہندوستان کے جرائد میں لکھنؤ کا "قومی آواز" ہو، دیوبند کا "میثاق" ہو یا لکھنؤ کا "الفرقان" ان سب نے اس سانحہ سے جماعت اسلامی کو مجروح و مطعون کرنے کا فائدہ اٹھایا ہے اور ماہنامہ "الفرقان" تو اس حد تک پہنچ گیا ہے :—

"...... مولانا مودودی اور اُن کی جماعت کے خلاف ہمارا جوش و خروش صرف اس لئے ہے کہ اس برصغیر میں ہم انہیں ادھر چند برس کی ان کی مسلسل روش کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک عظیم فتنہ سمجھتے ہیں"

(ماہ شوال ۸۴ھ)

یہ وہ حضرات ہیں جو "اکرامِ مسلم" کا دنیا کو درس دیتے رہتے ہیں اور خشیت و تقویٰ جن کے فکر و نظر کا موضوع ہے! مسلمانوں کی ایک جم

سلام کے لئے "فتنۂ عظیم" قرار دے دینا اس سے بڑی تحقیر مسلم اور دل آزاری اور کیا ہو سکتی ہے! ان کے قلم کی پہونچائی ہوئی ان
چوٹوں پر کچھ احتجاج آمیز خطوط ان کے پاس آجاتے ہیں اور جماعت سے متعلقہ اخبارات و رسائل مدافعت میں کچھ لکھتے ہیں، تو یہ حضرات مظلوم
رشور مچانے لگتے ہیں کہ جماعت والوں نے ہمیں نرغہ میں لے لیا ہے! ظلم کا یہ عجیب طریقہ ہے جان واحیان - اکرام مسلم "نے ایجاد کیا ہے
ی اس منطق کا کوئی جواب ہی نہیں کہ جماعت اسلامی سے جب تک کوئی وابستہ رہتا ہے اس کی دیانت، اخلاص، دردمندی غرض کوئی خوبی
ی نگاہ میں معتبر نہیں ہوتی وہ اس سے بدگمان ہی رہتے ہیں مگر جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو جانے کے بعد وہی شخص ان حضرات کو سراپا اخلاص
ستم صداقت نظر آتا ہے! اور اسے اس طرح سینہ سے لگاتے ہیں جیسے برسوں کا بچھڑا ہوا کوئی رفیق ان کو مل گیا۔

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

"الفرقان" میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر "فوازخول" کا سلسلہ بہت دنوں سے جاری ہے، یہ سلسلہ ٹوٹتا اور جڑتا رہتا ہے یعنی
کے بعد طلا " اور فترت کے بعد کرم فرمائیوں کی تمہید! اب کی بار مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے فارسی کی ایک مشہور مثل :-

اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند

پیدا کر دکھایا، اور جماعت اسلامی کے خلاف جو شدید عناد اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے اُسے ظاہر کر دیا!

جماعت اسلامی کا وجود اور مولانا مودودی کی ذات دین اور مسلمانوں کے لئے آخر کس بنا پر معمولی فتنہ نہیں "فتنۂ عظیم" ہے، کوئی دلیل؟
ں ثبوت؟ کیا جماعت اور مودودی صاحب کے بنیادی عقائد میں کوئی تبدیلی واقع ہو گئی ہے، توحید، رسالت، کتاب و سنت، انبیاء و ملائکہ
آخرت، تقدیر ---- وغیرہ دینی عقائد میں انہوں نے خواہ مخواستہ کتربیونت کر دی ہے، ارکان اسلام میں سے کسی رکن کا انہوں نے انکار
ہے، کسی منصوص شے کی حلت اور حرمت کو بدل دیا ہے، کوئی ایسا اجتہاد کیا ہے جس سے دین کی بنیاد مجروح ہو گئی ہے، یہ لوگ کسی فسق میں مبتلا
گئے ہیں، کسی حکومت کے ہاتھ بک گئے ہیں، مسلمانوں کے اموال کی امانت میں خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں، ان کی صحبت میں رہ کر لوگ دین سے
نفر ہو گئے ہیں، آخر وہ کون سا جرم عظیم ان سے سرزد ہوا ہے جس کی بنا پر ان پر دین کے لئے "فتنۂ عظیم" کی فرد جرم لگائی گئی ہے!

اسمبلیوں کے انتخابات کے لئے جدوجہد اور اُن کے لئے امیدواری کی درخواست، غلافِ کعبہ کی نمائش، عورت کی صدارت کا
مسئلہ، یا جماعت سے بعض ارکان کا اختلاف و علیحدگی سیاسی پارٹیوں سے اتحاد یہ مسائل اتنے شدید تو نہیں ہیں کہ ان کی بنا پر ایک دینی
اعت کو "فتنۂ عظیم" قرار دے دیا جائے، فرض کر لیجئے کہ ان تمام مسائل و معاملات میں جماعت کا موقف درست نہیں ہے، مگران فروعی
ئل کے سبب جماعت اسلامی پر "فتنۂ عظیم" کا حکم لگانا کیا قرین عدل و صواب ہے؟ اس انداز پر اگر احتساب کیا جائے تو مسلمانوں کا کوئی فقہی
ہب اور دینی مکتبہ فکر و ادارہ "فتنۂ عظیم" کی سزا سے نہیں بچ سکتا؛ دیوبند کی مثال سب کے سامنے ہے کہ آپس کے اختلافات کے سبب
ابھیں میں دوسرا دارالعلوم قائم کرنا پڑا، دیوبند کے بعض اکابر کے درمیان اُن دنوں کلام سلام تک موقوف ہو گیا تھا مگر کسی ناقد نے دارالعلوم
ندوۃ العلماء میں کسی گروہ کو مسلمانوں کے لئے فتنہ قرار نہیں دیا۔ جماعتوں میں ایسی صورتیں بھی پیش آتی رہتی ہیں کہ نزاع کا آغاز شخصی نکتہ چینی
سے ہوتا ہے، پھر کچھ انتظامی امور وجہ اختلاف بن جاتے ہیں اور معاملہ یہاں تک پہونچ جاتا ہے کہ اختلاف شخصی اور انتظامی نہیں ہے بلکہ "حق
و ناحق" کا اختلاف ہے، جو حضرات بھی جماعت سے علیحدہ ہوئے ہیں ان کو جماعت میں دینی کوتاہیاں نظر آئی ہیں، قرآن کے اس مثالیت اخذ
حاس و تجربہ کی ہم تردید نہیں کرتے کہ انہوں نے واقعی ایسا ہی محسوس کیا ہوگا، صحیح یہ ہے جتنے دن لوگ جماعت کی تنظیم سے وابستہ ہیں

اُن کی یہ وابستگی بھی تو آخر کوئی وزن رکھتی ہے، اُن کے بارے میں ہم یہ حسنِ ظن کیوں نہ رکھیں کہ جماعت میں دینی رنگ کا غلبہ دیکھ کر ہی یہ حضرات جماعت سے وابستہ ہیں !

اے مدعیانِ خشیت و تقویٰ، داعیانِ "تعلق باللہ" اور اے تجربہ کارانِ کشف و اشراق ! خدا کی قسم جماعتِ اسلامی کے درپے آزار بن کر تم کوئی نیک کام نہیں کر رہے ہو، اس "فتنہ عظیم" کو مٹا کر تم دین کی بہت بڑی قوت کو فنا کر دو گے، خدا کرے کہ تمہاری یہ تمنا کبھی پوری نہ ہو ! ہم گنہگاروں کا تو یہ مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ جماعت اسلامی ملت کے لئے "رحمت" ہے ! دنیا کے پردے پر تنہا یہی وہ جماعت ہے جو اللہ تعالیٰ کے پورے کے پورے دین کو برپا کرنے کا عزم لے کر اُٹھی ہے جس نے اس دور میں ہر نظام باطل کو چیلنج کیا ہے اور اسلامی حقیقتوں کو کسی معذرت کے بغیر فاتحانہ جرأت کے ساتھ پیش کیا ہے، فراست و عزیمت کا اس قدر خوشگوار اجتماع، کم ہی دیکھنے میں آیا ہے
اللہ تعالیٰ اس جماعت کو قائم و فعال رکھے اور ظلم کرنے والوں کے جور و ستم کے تحمل کی توفیق اور امتحان و آزمائش کی راہ میں استقامت کا حوصلہ عطا فرمائے۔ (آمین)

ماہر القادری

مولانا محمد تقی عثمانی
(مدرس دارالعلوم کراچی ۱۴)

تقلید کیا ہے؟

ہمارے لئے یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ جس چیز کو ہم آج "تقلید" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس کے لئے سب سے پہلے کس عالم نے "تقلید" کا لفظ استعمال کیا؟ لیکن اتنی بات ہم یقین کے ساتھ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس لفظ کی وجہ سے بعد میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں اگر اس کا علم پہلے سے ہو جاتا تو حضرات اس کا نام تقلید ہرگز نہ رکھتے۔

جن حضرات کو تقلید کے معاملہ میں نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ شبہات پیدا ہوئے ہیں، ہمارا خیال یہ ہے کہ ان کا اصل سبب "تقلید" کا لفظ ہے جس کے معنی کسی کی غلامی کا قلادہ پہن لینے کے ہیں۔ اگر صرف اس کے لغوی معنی پر نظر کی جائے تو بلاشبہ کسی مجتہد و فقیہ کی تقلید ایک غلط سا نقشہ پیش کرتی ہے۔

لیکن کسی معاملہ میں غور کرنے کے لئے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ بسا اوقات ایک لفظ کے لغوی اور عرفی معنی میں بڑا تفاوت ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ لغت میں جو معنی کسی لفظ کے لکھے ہوئے ہیں، عرف و اصطلاح میں بھی وہی مراد لئے جاتے ہوں۔ شاید یہی وہ نکتہ ہے جس کے پیش نظر نہ رہنے سے تقلید کے معاملہ میں غلط فہمیوں نے راہ پائی۔ بعض حضرات نے اسے شرک تک کی حدود میں داخل کر دیا، اور اس طرح رائی کا ایک پہاڑ بن کر کھڑا ہو گیا۔

محترم مدیر فاران کے ارشاد پر ہم یہ مضمون ان حضرات کی خدمت میں بصد خلوص پیش کر رہے ہیں جن کے ذہن میں تقلید کے مسئلے پر کچھ شبہات ہیں، جس سے مقصود تقلید کی حقیقت اور اس کی حدود کو واضح کرنا ہے۔

چونکہ اس مضمون سے ہمارا مقصد روایتی انداز کا بحث و مناظرہ یا نزاع و جدال ہرگز نہیں ہے اور ہم اس زمانے میں ان موضوعات پر نزاع و جدال کو دین کے بلند پایہ مقاصد کے لئے انتہائی مضر سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہماری عاجزانہ درخواست ہے کہ اسے پورے غور کے ساتھ مفاہمت کے ماحول میں ٹھنڈے دل سے پڑھا جائے۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، ہماری نظر میں تقلید کے بارے میں جو شبہات دلوں میں ابھرے ہیں وہ اس کی حقیقت پر پوری طرح غور نہ کرنے کا نتیجہ ہیں اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ پہلے تقلید کی حقیقت واضح کر دیں۔

اس بات سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا کہ دین کی اصل دعوت یہ ہے کہ صرف اللہ کی اطاعت کی جائے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی اس لئے واجب ہے کہ آپ نے اپنے قول و عمل سے احکام الٰہی کی ترجمانی فرمائی ہے کہ کون سی چیز حلال ہے کون سی حرام؟ کیا جائز ہے کیا ناجائز؟ ان تمام معاملات میں اطاعت خالصتاً اللہ اور رسول کی کرنی ہے اور جو شخص اللہ اور رسول کے بجائے کسی اور کی اطاعت کرنے کا قائل ہو، اور اس کو مستقل بالذات مطاع سمجھتا ہو وہ یقیناً دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن و سنت کے احکام کی اطاعت کرے۔

لیکن قرآن و سنت میں بعض احکام تو ایسے ہیں جنہیں ہر معمولی لکھا پڑھا آدمی سمجھ سکتا ہے، ان میں کوئی اجمال، ابہام یا تعارض نہیں، جو شخص

بھی انہیں دیکھے گا سمجھ لے گا، اور اسے کوئی الجھن پیش نہیں آئے گی، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد:

لا یغتب بعضکم بعضا — تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔

جو شخص بھی معمولی عربی جانتا ہے وہ اس ارشاد کے معنی سمجھ جائے گا اور چونکہ اس میں نہ کوئی ابہام ہے اور نہ کوئی دوسری شرعی دلیل اس سے ٹکراتی ہے۔ اس لئے اس میں کوئی الجھن باقی نہ رہے گی، یا مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:

لا فضل لعربی علی عجمی — کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں

یہ ارشاد بالکل واضح ہے، اس میں کوئی پیچیدگی اور اشتباہ نہیں، ہر عربی داں بلا تکلف اس کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔

اس کے برعکس قرآن و سنت میں بہت سے احکام وہ ہیں جن کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، بہت سے وہ ہیں جن میں کوئی ابہام یا اجمال ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو قرآن کی کسی دوسری آیت یا کسی دوسری حدیث سے متعارض ہیں ہر ایک کی مثال ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) قرآن کریم کا ارشاد:

والمطلقٰت یتربصن بانفسہن ثلٰثۃ قروء — اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو وہ تین "قروء" گذرنے تک انتظار کریں گی۔

اس میں مطلقہ عورت کی عدت بیان کی گئی ہے اور اس کے لئے "تین قروء" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ "قرء" کا لفظ عربی زبان میں "حیض" کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور "طہر" کے لئے بھی، اگر پہلے معنی لئے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مطلقہ کی عدت تین ایام ماہواری ہیں اور اگر دوسرے معنی لئے جائیں تو تین طہر عدت قرار پاتے ہیں اس موقعہ پر ہمارے لئے یہ الجھن پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم ان دو معنوں میں سے کس پر عمل کریں؟

(۲) ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من لم یترک المخابرۃ فلیؤذن بحرب من اللہ ورسولہ (ابوداؤد) — جو شخص بٹائی کا کاروبار نہ چھوڑے وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لے۔

اس میں بٹائی کی ممانعت کی گئی ہے۔ لیکن بٹائی کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں، حدیث اس باب میں خاموش ہے کہ یہاں بٹائی کی کون سی صورت مراد ہے؟ کیا بٹائی کی ہر صورت ناجائز ہوگی؟ یا بعض صورتیں جائز قرار پائیں گی اور بعض ناجائز؟ حدیث میں ایک قسم کا اجمال پایا جا رہا ہے جس کی وجہ سے ہمارے لئے پیچیدگی پیدا ہوتی ہے کہ بٹائی کو علی الاطلاق ناجائز کہہ دیں یا اس میں کوئی تقسیم ہے؟

(۳) ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ (ابن ماجہ) — جس کا کوئی امام ہو تو امام کی قرأت اس کے لئے بھی قرأت بن جائے گی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں جب امام قرأت کر رہا ہو تو مقتدی کو خاموش کھڑا رہنا چاہئے، دوسری طرف آپ ہی کا ارشاد ہے کہ:

لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب۔ (بخاری) — جس شخص نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی ہو اس کی نماز نہیں ہوگی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کے لئے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے، ان دونوں حدیثوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے الجھن یہ ہوتی ہے کہ آیا امام کے [illegible]

تو قرار دے کر یوں کہا جائے کہ دوسری حدیث میں صرف امام اور منفرد کو خطاب کیا گیا ہے اور مقتدی اس سے مستثنیٰ ہے۔ یا دوسری حدیث کو اصل قرار دے کر یوں کہا جائے کہ پہلی حدیث میں قرآت سے مراد فاتحہ کے سوا کوئی دوسری سورت ہے اور سورۂ فاتحہ اس سے مستثنیٰ ہے؟

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ قرآن و حدیث سے احکام کے مستنبط کرنے میں اس قسم کی بہت سی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اب ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم اپنی فہم و بصیرت پر اعتماد کرکے اس قسم کے معاملات میں خود کوئی فیصلہ کرلیں اور اس پر عمل کریں اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس قسم کے معاملات میں خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے ہم یہ دیکھیں کہ قرآن و سنت کے ان ارشادات سے ہمارے جلیل القدر اسلاف نے کیا سمجھا ہے؟ قرونِ اولیٰ کے جن بزرگ کو ہم علوم قرآن و سنّت کا زیادہ ماہر دیکھیں ان کی فہم و بصیرت پر اعتماد کریں اور انہوں نے جو کچھ سمجھا ہے اس کے مطابق عمل کریں۔

اگر انصاف اور حق پسندی سے کام لیا جائے تو ہمارے خیال میں اس بات میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت خاصی مخدوش ہے اور دوسری صورت بہت محتاط، یہ بات صرف تواضع اور کسرِ نفسی ہی نہیں، ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ علم و فہم، ذکاوت و حافظہ، دین و دیانت تقویٰ اور پرہیزگاری ہر اعتبار سے ہم اس قدر تہی دست ہیں کہ قرونِ اولیٰ کے علماء سے ہماری کوئی نسبت نہیں، پھر جس مبارک ماحول میں قرآن کریم نازل ہوا تھا، قرونِ اولیٰ کے علماء اس سے بھی قریب ہیں اور اس قرب کی بناء پر ان کے لئے قرآن و سنت کی مراد کو سمجھنا زیادہ آسان ہے اس کے برخلاف ہم عہدِ رسالت سے اتنی دور جا پڑے ہیں کہ ہمارے لئے اس زمانے کے طرزِ معاشرت اور طرزِ گفتگو کا ہو بہو اور بعینہٖ تصور بڑا مشکل ہے۔ حالانکہ کسی شخص کی بات کو صحیح سمجھنے کے لئے اس کے پورے پس منظر کا سامنا ہونا بے حد ضروری ہے۔

ان تمام باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اگر ہم اپنے فہم پر اعتماد کرنے کی بجائے مختلف التعبیر پیچیدہ معاملات میں اس مطلب کو درست قرار دیں جو ہمارے اسلاف میں سے کسی عالم نے سمجھا ہے تو کہا جائے گا کہ ہم نے فلاں عالم کی تقلید کی ہے۔

یہ ہے "تقلید" کی حقیقت! اگر میں اپنی بات کو صحیح سمجھا سکا ہوں تو یہ بات آپ پر واضح ہوگئی ہوگی کہ کسی امام یا مجتہد کی تقلید صرف اس موقعہ پر کی جاتی ہے جہاں قرآن و سنّت سے کسی حکم کے سمجھنے میں اجمال و ابہام یا تعارض کی وجہ سے کوئی الجھن یا دشواری ہو اور قرآن و سنت کے جن احکام میں کوئی اجمال و ابہام تعارض یا اسی قسم کی کوئی اور الجھن نہ ہو وہاں کسی امام و مجتہد کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں[؎]

پھر مذکورہ بالا گذارشات سے یہ بات بھی صاف ہوجاتی ہے کہ کسی امام و مجتہد کی تقلید کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس کے حکم کو شارع کی حیثیت سے مان لیا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اتباع تو قرآن و سنّت ہی کی مقصود ہے، صرف قرآن و سنت کی مراد سمجھنے کے لئے بحیثیت شارحِ قانون ان کی تشریح و تعبیر پر اعتماد کیا گیا ہے۔

اب آپ بنظرِ انصاف غور فرمائیے کہ اس عمل میں کون سی بات ایسی ہے جسے "گناہ" یا "شرک" کہا جاسکے؟ اگر کوئی شخص کسی امام کو شارع کا درجہ دے کر اسے واجب الاتباع قرار دیتا ہو تو بلاشبہ اسے شرک کہا جاسکتا ہے لیکن کسی کو شارحِ قانون قرار دے کر اپنے مقابلے میں اس کی فہم و بصیرت پر اعتماد کرنا تو انحطاطِ علم کے اس دور میں اس قدر ناگزیر ہے کہ اس سے کوئی مفر نہیں۔

تقلید کی دو صورتیں

پھر اس تقلید کی بھی دو صورتیں ہوجاتی ہیں، ایک تو یہ کہ تقلید کے لئے کسی خاص امام و مجتہد کو معین نہ کیا جائے، بلکہ اگر ایک مسئلے میں ایک عالم کا قول اختیار کیا گیا ہے تو دوسرے مسئلے میں کسی دوسرے عالم کی رائے قبول کرلی جائے، اسے "تقلید

مطلق" کہا جاتا ہے۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ تقلید کے لئے کسی ایک مجتہد عالم کو معین کر لیا جائے، اور ہر ایک مسئلے میں اسی کی رائے اختیار کی جائے، قرآن و سنت میں جہاں بھی مذکورہ الجھنوں میں سے کوئی الجھن پیش آئے وہاں اسی کی رائے کی طرف رجوع کیا جائے، اسے "تقلید شخصی" کہتے ہیں۔

تقلید کی ان دونوں قسموں کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک شخص براہ راست قرآن و سنت سے احکام مستنبط کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا تو وہ جسے قرآن و سنت کے علوم کا ماہر سمجھتا ہے اس کے فہم و بصیرت اور تقویٰ پر اعتماد اور اس کی تشریحات کے مطابق عمل کرتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کا جواز بلکہ وجوب قرآن و سنت کے بہت سے دلائل سے ثابت ہے ان میں سے چند ملاحظہ ہوں:

(۱) قرآن کریم کا ارشاد ہے:

ولو ردوه الی الرسول والی أولی الامر منهم لعلمه الذین یستنبطونه منهم

(اور اگر یہ لوگ اس امر کو رسول کے اور اولی الامر کے حوالہ کرتے تو جو لوگ استنباط کے اہل ہیں وہ اسے جانتے اور انہیں بتلا دیتے)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ خود استنباط کی اہلیت نہیں رکھتے انہیں چاہئے کہ وہ ان لوگوں کی تقلید کریں جو اجتہاد و استنباط کے اہل ہیں[1]

(۲) ایک اور جگہ ارشاد ہے:

فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون۔

(ان کے ہر فرقے میں سے ایک چھوٹی جماعت اس مقصد کے لئے کیوں نہ نکلے کہ وہ دین میں تفقہ حاصل کرے اور واپس آکر اپنی قوم کو بیدار کرے تاکہ وہ لوگ (اللہ کی نافرمانی سے) بچیں)

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ علم دین حاصل کرنے والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی قوم میں واپس پہونچ کر انہیں دین و شریعت کے احکام بتا[ئیں] اور ان کی قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان کے بتائے ہوئے مسائل پر اعتماد کرکے ان پر عمل کریں اسی کا نام تقلید ہے۔

(۳) ایک اور جگہ ارشاد ہے:

اتبع سبیل من اناب الیّ

(اس شخص کے راستے کی پیروی کرو جو میری طرف رجوع کئے ہوئے ہو)

اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ "میرے راستے کی پیروی کرو" کیونکہ اللہ کی اطاعت کے راستہ کو ٹھیک اسی طرح سمجھنا ——— جس طرح وہ راستہ واقع ہوا ہر شخص کے بس کا کام نہیں، اس لئے اس کا یہ طریقہ بتلا دیا گیا کہ جو شخص اللہ کی طرف بہ دل و جان راغب ہے، اور اللہ کی پسند و ناپسند کو سمجھنے کے لئے زندگی اس نے وقف کر رکھی ہے اس کی اتباع کرنے سے اللہ کی اطاعت ہو جائے گی

(۴) قرآن کریم کی طرح بہت سی احادیث سے بھی تقلید کا جواز ثابت ہوتا ہے، اختصار کے پیش نظر ہم صرف ایک حدیث پیش کرتے ہیں:

عن حذیفةؓ قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے

---

[1] تفصیل کے لئے امام رازیؒ کی تفسیر کبیر اور جصاص کی احکام القرآن ملاحظہ ہوں۔

انی لا ادری ما بقائی فیکم فاقتدوا باللذین من بعدی ابی بکرؓ و عمرؓ۔

(مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

معلوم نہیں میں کب تک تم لوگوں میں زندہ رہوں گا لہٰذا میرے بعد ان دو شخصوں کی اقتداء کرنا، ایک ابوبکرؓ، دوسرے عمر (رضی اللہ عنہما)

حدیث میں "اقتداء" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو انتظامی امور میں اطاعت کرنے کے معنی میں ہرگز استعمال نہیں ہوتا، اس کا مفہوم بعینہٖ وہ ہے جو ہم تقلید کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں۔

چنانچہ تقلید کی دو قسمیں (مطلق اور شخصی) ہم نے بیان کی ہیں، عہد رسالتؐ اور عہد صحابہؓ میں ان دونوں پر عمل ہوتا رہا ہے جس کی بہت سی نظیریں حدیث اور تاریخ کے ذخیروں میں ملتی ہیں۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

عہد صحابہؓ میں تقلید مطلق

عہد صحابہؓ میں تقلید مطلق کی مثالیں اس کثرت سے ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین میں سے جو حضرات فقیہ نہ تھے وہ فقہاء صحابہؓ سے پوچھ پوچھ کر عمل کیا کرتے تھے اور کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہ ہو جس میں انہوں نے مسئلہ کی دلیل پوچھی ہو، اسی کو تقلید مطلق کہتے ہیں، چونکہ کتب حدیث سے ذرا مناسبت رکھنے والا ہر شخص اس قسم کے واقعات سے واقف ہے اس لئے ہم یہاں نمونہ کے طور پر صرف ایک واقعہ نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں:-

عن عبید بن ابی صالح قال ابتعت برا من اهل دار نخلة الی اجل فاردت الخروج الی الکوفة فعرضوا علی ان اضع لهم وینقدونی فسألت زید بن ثابت فقال لا آمرک ان تفعله ولا ان تاکل هذا او توکله۔

(موطا امام مالکؒ)

عبید ابی صالح کہتے ہیں کہ میں نے دار نخلہ والوں کے ہاتھ کچھ گیہوں فروخت کئے اور قیمت کے لئے ایک میعاد دے دی، پھر میں نے کوفہ جانا چاہا تو ان لوگوں نے مجھ سے اس بات کی درخواست کی کہ میں ان کو کچھ دام چھوڑ دوں اور وہ لوگ مجھے نقد قیمت ادا کر دیں، میں نے حضرت زید بن ثابتؓ سے سوال کیا، انہوں نے فرمایا کہ نہ میں اس فعل کی تم کو اجازت دیتا ہوں نہ کھانے کی، نہ کھلانے کی۔

عہد صحابہؓ میں تقلید شخصی

تقلید مطلق کے ساتھ عہد صحابہؓ بلکہ عہد رسالت میں بھی تقلید شخصی کی مثالیں ملتی ہیں:-

(۱) صحیح بخاری میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

ان اهل المدینة سألوا ابن عباس عن امرأة طافت ثم حاضت قال لهم تنفر قالوا لا نأخذ بقولك وندع قول زیدؓ۔

(صحیح بخاری کتاب الحج باب اذا حاضت المرأة بعد ما افاضت)

اہل مدینہ نے حضرت ابن عباسؓ سے اس عورت کے بارے میں سوال کیا جو طواف فرض کے بعد حائضہ ہو گئی ہو (کہ وہ طواف وداع کے لئے پاک ہونے تک انتظار کرے یا اس سے طواف ساقط ہو جائے گا اور بغیر طواف کئے واپس جانا جائز ہو گا) ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ جا سکتی ہے! اہل مدینہ نے کہا کہ ہم آپ کے قول پر زید بن ثابتؓ کے قول کے خلاف عمل نہیں کریں گے۔

فتح الباری میں بحوالہ ثقفی اسی واقعہ میں اہل مدینہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں :-

افتنا اولم تفتنا زید بن ثابتؓ یقول لاتنفر	آپ فتویٰ دیں یا نہ دیں، حضرت زید بن ثابتؓ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ عورت (بغیر طواف) واپس نہیں جا سکتی ۔

فتح الباری ہی میں مسند ابوداؤد طیالسی کے حوالہ سے بروایت قتادہؒ اس واقعہ میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں :

فقالت الانصار لانتابعک یا ابن عباسؓ وانت تخالف زیداً؟ فقال سلوا صاحبتکم ام سلیم (فتح الباری ص ۴۶۳ ج ۳)	انصار نے کہا کہ ہم زید بن ثابتؓ کے خلاف قول میں آپ کی اتباع نہ کریں گے، ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آپ لوگ ام سلیم سے دریافت کریں کہ جو جواب میں نے دیا ہے وہ درست ہے

اس واقعہ میں اہل مدینہ اور حضرت ابن عباسؓ کی گفتگو سے دو چیزیں وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہیں، ایک تو یہ کہ اہل مدینہ حضرت زید بن ثابتؓ کی تقلید شخصی کیا کرتے تھے اور ان کے قول کے مخالف کسی قول پر عمل نہیں کرتے تھے، مذکورہ واقعہ میں ان حضرات نے حضرت ابن عباسؓ کے فتوے پر عمل نہ کرنے کی اس کے سوا کوئی وجہ بیان نہیں کی کہ وہ حضرت زیدؓ کے فتوے کے خلاف ہے ۔

دوسرے یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی ان حضرات پر یہ اعتراض نہیں فرمایا کہ تم تقلید کے لئے ایک شخص کو معیّن کرکے "گناہ" یا "شرک" کے مرتکب ہو رہے ہو، بلکہ انہیں حضرت ام سلیمؓ سے مسئلہ کی تحقیق کرکے حضرت زید بن ثابتؓ کی طرف دوبارہ مراجعت کرنے کی ہدایت فرمائی ۔

چنانچہ فتح الباری ہی میں ہے کہ یہ حضرات مدینہ طیبہ پہونچے تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ارشاد کے مطابق حضرت ام سلیمؓ سے واقعہ کی تحقیق کرکے دوبارہ حضرت زید بن ثابتؓ کی طرف مراجعت کی جس کے نتیجے میں حضرت زیدؓ نے مکرر حدیث کی تحقیق فرماکر اپنے سابقہ فتوے سے رجوع فرما لیا، (فتح الباری ص ۴۶۴ ج ۳)

(۲) صحیح بخاری، ابوداؤد اور ترمذی میں حضرت ھزیل بن شرجیل سے ایک طویل واقعہ مروی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰؓ سے کچھ لوگوں نے ایک مسئلہ پوچھا، پھر وہی مسئلہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا گیا اور ان سے اس مسئلہ میں حضرت ابوموسیٰؓ کی رائے بھی ذکر کردی گئی، حضرت عبداللہ نے جو فتویٰ دیا وہ فتویٰ حضرت ابوموسیٰؓ کے فتوے کے خلاف تھا، لوگوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے فتویٰ کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا :

لا تسألونی ما دام ھذا الحبر فیکم ۔ (تیسیر بحوالہ بخاری وغیرہ ص ۳۷۹)	جب تک یہ متبحر عالم (یعنی حضرت ابن مسعودؓ) تم میں موجود ہیں، تم مجھ سے مت پوچھا کرو ۔

حضرت ابوموسیٰؓ کے اس ارشاد سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ انہوں نے ہر مسئلے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا ہے، اور یہی تقلید شخصی ہے کہ ہر مسئلے میں کسی ایک ہی عالم سے رجوع کیا جائے ۔

(۳) جامع ترمذی اور سنن ابوداؤد میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے ایک روایت نقل کی ہے،

عن معاذ بن جبلؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما بعثہ الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لک قضاء قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجد	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبلؓ کو یمن کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا تو یہ پوچھا کہ اگر کوئی قضیہ پیش آجائے تو کس طرح فیصلہ کروگے ؟ عرض کیا کہ کتاب اللہ کے موافق

فی کتاب اللہ، قال فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم، قال فان لم تجد فی سنۃ رسول
اللہ قال أجتہد برأیی ولا آلو، قال فضرب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی صدرہ
وقال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما
یرضی بہ رسول اللہ ۔

فیصلہ کروں گا، فرمایا کہ اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ہو؟
تو عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے
فیصلہ کروں گا، آپ نے فرمایا اگر اس میں بھی نہ ملے؟ عرض
کیا کہ میں اس وقت اجتہاد و استنباط کرکے اپنی رائے
سے فیصلہ کروں گا اور تلاش حق میں کوئی کسر نہ چھوڑوں گا،
(معاذؓ فرماتے ہیں کہ) آپ نے اس پر فرط مسرت سے
اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا اور فرمایا کہ اللہ کا شکر
ہے کہ اس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق
دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔

یہ واقعہ تقلید و اجتہاد کے مسئلہ میں ایک ایسی صحیح ہدایت ہے کہ اس پر جتنا غور کیجئے اس مسئلے کی گتھیاں سلجھتی چلی جاتی ہیں، یہاں ہمیں اس واقعہ
کے ایک پہلو پر توجہ دلانا مقصود ہے اور وہ یہ کہ آپ نے اہل یمن کے لئے اپنے فقہاء صحابہؓ میں سے صرف ایک جلیل القدر صحابی کو بھیجا اور انہیں حاکم و
معلم اور مجتہد بنا کر اہل یمن پر لازم کر دیا کہ وہ ان کی اتباع کریں۔ انہیں صرف قرآن و سنت ہی نہیں، بلکہ قیاس و اجتہاد کے مطابق فتوے صادر
کرنے کی اجازت فرمائی، اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ نے اہل یمن کو ان کی تقلید شخصی کی اجازت دی، بلکہ اس کو ان کے ذمہ لازم فرما دیا۔

غرض مندرجہ بالا روایات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ تقلید مطلق اور تقلید شخصی دونوں قسموں پر صحابہ کرامؓ کے عہد مبارک
میں عمل ہوتا رہا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ جو شخص قرآن و سنت سے براہ راست احکام کو مستنبط کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ اصل کے اعتبار سے
اس کے لئے تقلید کی دونوں قسمیں جائز تھیں۔

لیکن خدا رحمتوں کا مینہ برسائے ہمارے بعد کے فقہاء مجتہدین پر جو اپنے زمانے کے نبض شناس تھے اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمانے کے بدلتے
ہوئے حالات پر نگاہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائی تھی، انہوں نے بعد میں ایک زبردست انتظامی مصلحت سے تقلید مطلق کا دروازہ بند کر دیا۔

وہ زبردست انتظامی مصلحت کیا تھی؟ اس سوال کے جواب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھئے کہ "خواہش پرستی" وہ زبردست گمراہی ہے جو بسا اوقات
انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم قدم قدم پر ہوشیار کرتا ہے کہ کہیں یہ روگ تم میں پیدا نہ ہو جائے آیات و احادیث کا ایک بہت
ذخیرہ ہے جو خواہش پرستی کو مذموم قرار دیتا ہے اور اس سے دامن بچانے کی جگہ جگہ تلقین کرتا ہے۔

پھر خواہش پرستی بھی ایک تو یہ ہے کہ انسان ایک برے کام کو برا اور گناہ کو گناہ سمجھتا ہے مگر اپنے نفس کی خواہشات کے آگے مجبور ہو کر اس میں مبتلا ہو جاتا
ہے، یہ صورت ایک بہت بڑا جرم ہونے کے باوجود اتنی سنگین نہیں ہے کہ اس کے برعکس خواہش پرستی کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات
کی پیروی کرتا ہوا اس حد تک پہنچ جائے کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر ڈالے اور دین و شریعت کو ایک کھلونا بنا دے ـــــ ظاہر ہے کہ خواہش
پرستی کی یہ دوسری صورت پہلے سے زیادہ سنگین، خطرناک اور تباہ کن ہے اور انسانوں کا جو عمل بھی اسے خواہش پرستی کی اس راہ پر ڈال سکتا ہو اس سے بچنا
ضروری ہے۔

فقہاء کرام نے محسوس فرمایا کہ دیانت کا معیار روز بروز گھٹ رہا ہے، احتیاط اور تقویٰ اٹھتے جا رہے ہیں ایسی صورت میں اگر تقلید مطلق کا دروازہ

اور فتح الباری میں بحوالہ ثقفی اسی واقعہ میں اہل مدینہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں :-

افتنا اولم تفتنا زید بن ثابتؓ یقول لا تنفر	آپ فتویٰ دیں یا نہ دیں، حضرت زید بن ثابتؓ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ عورت (بغیر طواف) واپس نہیں جاسکتی۔

نیز فتح الباری ہی میں مسند ابوداؤد طیالسی کے حوالہ سے بروایت قتادہؒ اس واقعہ میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں :

فقالت الانصار لا نتابعك یا ابن عباسؓ و انت تخالف زیدا؟ فقال سلوا صاحبتکم ام سلیم (فتح الباری ص ۴۶۳ ج ۳)	انصار نے کہا کہ ہم زید بن ثابتؓ کے خلاف قول میں آپ کی اتباع نہ کریں گے، ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آپ لوگ ام سلیم سے دریافت کریں کہ جو جواب میں نے دیا ہے وہ درست ہے۔

اس واقعہ میں اہل مدینہ اور حضرت ابن عباسؓ کی گفتگو سے دو چیزیں وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہیں، ایک تو یہ کہ اہل مدینہ حضرت زید بن ثابتؓ کی تقلید شخصی کیا کرتے تھے اور ان کے قول کے مخالف کسی قول پر عمل نہیں کرتے تھے، مذکورہ واقعہ میں ان حضرات نے حضرت ابن عباسؓ کے فتوے پر عمل نہ کرنے کی اس کے سوا کوئی وجہ بیان نہیں کی کہ وہ حضرت زیدؓ کے فتوے کے خلاف ہے۔

دوسرے یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی ان حضرات پر یہ اعتراض نہیں فرمایا کہ تم تقلید کے لئے ایک شخص کو معین کرکے "گناہ" یا "شرک" کے مرتکب ہو رہے ہو، بلکہ انہیں حضرت ام سلیمؓ سے مسئلہ کی تحقیق کرکے حضرت زید بن ثابتؓ کی طرف دوبارہ مراجعت کرنے کی ہدایت فرمائی۔

چنانچہ فتح الباری ہی میں ہے کہ یہ حضرات مدینہ طیبہ پہونچے تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ارشاد کے مطابق حضرت ام سلیمؓ سے واقعہ کی تحقیق کرکے دوبارہ حضرت زید بن ثابتؓ کی طرف مراجعت کی جس کے نتیجے میں حضرت زیدؓ نے مکرر حدیث کی تحقیق فرماکر اپنے سابقہ فتوے سے رجوع فرما لیا۔ (فتح الباری ص ۴۶۴ ج ۳)

(۲) صحیح بخاری، ابوداؤد اور ترمذی میں حضرت ھزیل بن شرحبیل سے ایک طویل واقعہ مروی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰؓ سے کچھ لوگو نے ایک مسئلہ پوچھا، پھر وہی مسئلہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا گیا اور ان سے اس مسئلہ میں حضرت ابوموسیٰؓ کی رائے بھی ذکر کردی گئی، حضرت عبداللہ نے جو فتویٰ دیا وہ فتویٰ حضرت ابوموسیٰؓ کے فتوے کے خلاف تھا، لوگوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے فتویٰ کا ذکر کیا تو انہ نے فرمایا :

لا تسألونی ما دام ھذا الحبر فیکم۔ (تیسیر بحوالہ بخاری وغیرہ ص ۳۷۹)	جب تک یہ متبحر عالم (یعنی حضرت ابن مسعودؓ) تم میں موجود ہیں، تم مجھ سے مت پوچھا کرو۔

حضرت ابوموسیٰؓ کے اس ارشاد سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ انہوں نے ہر مسئلے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا ہے، اور یہی تقلید شخصی ہے کہ ہر مسئلے میں کسی ایک ہی عالم سے رجوع کیا جائے۔

(۳) جامع ترمذی اور سنن ابوداؤد میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے ایک روایت نقل کی ہے :

عن معاذ بن جبلؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم لما بعثہ الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لك قضاء قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجد	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبلؓ کو یمن کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا تو یہ پوچھا کہ اگر کوئی قضیہ پیش آجائے تو کس طرح فیصلہ کروگے؟ عرض کیا کہ کتاب اللہ کے موافق

فی کتاب اللہ، قال فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قال فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ قال اجتھد برائی ولا آلو، قال فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی صدرہ وقال الحمد للہ وفق رسول رسول اللہ لما یرضیٰ بہ رسول اللہ ۔

فیصلہ کروں گا، فرمایا کہ اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ہو؟ تو عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے فیصلہ کروں گا، آپ نے فرمایا اگر اس میں بھی نہ ملے؟ عرض کیا کہ میں اس وقت اجتہاد واستنباط کرکے اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا اور تلاش حق میں کوئی کسر نہ چھوڑوں گا، (معاذؓ فرماتے ہیں کہ) آپ نے اس پر (فرط مسرت سے) اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے ۔

یہ واقعہ تقلید واجتہاد کے مسئلہ میں ایک ایسی صحیح ہدایت ہے کہ اس پر جتنا غور کیجئے اس مسئلے کی گتھیاں سلجھتی چلی جاتی ہیں، یہاں ہمیں اس واقعہ کے صرف ایک پہلو پر توجہ دلانا مقصود ہے اور وہ یہ کہ آپ نے اہل یمن کے لئے اپنے فقہاء صحابہؓ میں سے صرف ایک جلیل القدر صحابی کو بھیجا اور انہیں حاکم و قاضی، معلم اور مجتہد بنا کر اہل یمن پر لازم کردیا کہ وہ ان کی اتباع کریں۔ انہیں صرف قرآن وسنت ہی نہیں، بلکہ قیاس واجتہاد کے مطابق فتوے صادر کرنے کی اجازت فرمائی، اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ نے اہل یمن کو ان کی تقلید شخصی کی اجازت دی، بلکہ اس کو ان کے ذمہ لازم فرما دیا۔

غرض مندرجہ بالا روایات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ تقلید مطلق اور تقلید شخصی دونوں قسموں پر صحابہ کرامؓ کے عہد مبارک میں عمل ہوتا رہا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ جو شخص قرآن وسنت سے براہ راست احکام کو مستنبط کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ اصل کے اعتبار سے اس کے لئے تقلید کی دونوں قسمیں جائز تھیں ۔

لیکن خدا رحمتوں کا مینہ برسائے ہمارے بعد کے فقہاء ومجتہدین پر جو اپنے زمانے کے نبض شناس تھے اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات پر نگاہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائی تھی، انہوں نے بعد میں ایک زبردست انتظامی مصلحت سے تقلید مطلق کا دروازہ بند کردیا ۔

وہ زبردست انتظامی مصلحت کیا تھی؟ اس سوال کے جواب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھئے کہ "خواہش پرستی" وہ زبردست گمراہی ہے جو بسا اوقات انسان کو کفر تک پہونچا دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم قدم قدم پر ہوشیار کرتا ہے کہ کہیں یہ روگ تم میں پیدا نہ ہو جائے آیات واحادیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے جو خواہش پرستی کو ممنوع قرار دیتا ہے اور اس سے دامن بچانے کی جگہ جگہ تلقین کرتا ہے ۔

پھر خواہش پرستی بھی ایک تو یہ ہے کہ انسان ایک برے کام کو برا اور گناہ کو گناہ سمجھتا ہے مگر اپنے نفس کی خواہشات کے آگے مجبور ہو کر اس میں مبتلا ہو جاتا ہے، یہ صورت ایک بہت بڑا جرم ہونے کے باوجود اتنی سنگین نہیں ہے کہ اس کے برعکس خواہش پرستی کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتا ہوا اس حد تک پہونچ جائے کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر ڈالے اور دین وشریعت کو ایک کھلونا بنا دے ——— ظاہر ہے کہ خواہش پرستی کی یہ دوسری صورت پہلے سے زیادہ سنگین، خطرناک اور تباہ کن ہے اور انسانوں کا جو عمل بھی اسے خواہش پرستی کی اس راہ پر ڈال سکتا ہو اس سے بچنا فرض ہے۔

فقہاء کرام نے محسوس فرمایا کہ دیانت کا معیار روز بروز گھٹ رہا ہے، احتیاط اور تقویٰ اٹھتے جا رہے ہیں ایسی صورت میں اگر تقلید مطلق کا دروازہ

یں کھول دیا گیا تو بہت سے لوگ جان بوجھ کر اور بہت سے غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہو جائیں گے، مثلاً ایک شخص کے سردی کے موسم میں خون آیا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کا وضو ٹوٹ گیا اور امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں ٹوٹا، وہ اپنی تن آسانی کی وجہ سے اس وقت امام شافعیؒ کی تقلید کر کے نماز پڑھ لے گا، پھر اس کے تھوڑی دیر بعد اگر اس نے کسی عورت کو چھو لیا تو امام شافعیؒ کے نزدیک اس کا وضو جاتا رہا اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہے اس کی تن آسانی اس موقع پر اسے امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرنے کا سبق دے گی اور پھر وہ بلا وضو نماز کے لئے کھڑا ہو جائے گا ——— غرض اس طرح قول میں اسے فائدہ نظر آئے گا اسے اختیار کرے گا اور جس میں کوئی مضرت کا پہلو ہوگا اسے چھوڑ دے گا اور ایسا بھی ہوگا کہ اس کا نفس اسکو اسی قول کی کی دلیلیں سجھائے گا جو اس کے لئے زیادہ آسان ہے اور وہ بالکل غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہوگا، ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتوں کا حاصل یہ گا کہ احکام شرعیہ نفسانی خواہشات کا ایک کھلونا بن کر رہ جائیں گے اور یہ وہ چیز ہے جس کے حرام قطعی ہونے میں آج تک کسی مسلمان کا اختلاف نہیں ہوا، مہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اسی چیز کی شناعت کو واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

فی وقت یقلدون من یفسده و فی وقت یقلدون من یصححه ومثل هذا لا یجوز باتفاق الامة

یہ لوگ ایک وقت اس امام کی تقلید کرتے ہیں جو نکاح کو فاسد قرار دیتا ہے اور دوسرے وقت میں اس کی جو اسے درست قرار دیتا ہے اور اس طرح کا عمل باتفاق امت ناجائز ہے۔

پھر چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں :-

ونظیر هذا ان یعتقد الرجل ثبوت شفعة الجوار اذا کان طالبا لها وعدم ثبوتها اذا کان مشتریا، فان هذا لا یجوز بالاجماع وکذا من بنی صحة ولایة الفاسق فی حال نکاحه وبنی علی فساد ولایته حال طلاقه لم یجز ذلک باجماع المسلمین ولو قال المستفتی المعین انا لم اکن اعرف ذلک وانا الیوم التزم ذلک لم یکن من ذلک لان ذلک یفتح باب التلاعب بالدین ویفتح ذریعة الی ان یکون التحریم والتحلیل بحسب الاهواء۔

(فتاوی ابن تیمیہ ص ۲۴۰ و ۲۴۲ ج ۲)

اور اس کی نظیر یہ ہے کہ کوئی آدمی جس وقت کسی حق شفعہ کا خود طالب ہو تو (مذہب امام ابوحنیفہؒ کے مطابق) پڑوسی کے لئے حق شفعہ کا اعتقاد رکھے اور اگر خود مشتری ہو تو (امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق) اس کے ثابت نہ ہونے کا معتقد بن جائے، ایسے ہی وہ شخص جو بحالت قیام نکاح فاسق کی ولایت کے درست ہونے کا قائل اور اس کی بنا پر منافع نکاح سے فائدہ اٹھاتا ہے مگر جب طلاق ثلثہ دے دے تو حرمت مغلظہ سے بچنے کیلئے فاسق کی ولایت کو کالعدم اور اس کے ماتحت منعقد شدہ نکاح کو فاسد قرار دے کہ یہ باجماع مسلمین جائز نہیں ہے اور اگر کوئی مستفتی یہ کہے کہ پہلے مجھے اس مذہب کی خبر نہ تھی اور اب میں اس کا معتقد اور پابند ہوں تب بھی اس اس کا قول قابل تسلیم نہیں کیونکہ یہ دین کو ایک کھلونا بنانے کا دروازہ کھولنا ہے اور اس بات کا سبب بنتا ہے کہ حرام و حلال کا مدار محض خواہشات پر ہو کر رہ جائے۔

اس سلسلہ میں علماء امت کی تصریحات بے شمار ہیں ہم نے صرف حافظ ابن تیمیہؒ کے کلام کو نقل کرنے پر اس لئے اکتفا کیا کہ جو حضرات تقلید کے قائل

یں ہیں، ان کے نزدیک بھی ان کا علمی پایہ بلند مسلم ہے اور وہ بہت سے معاملات میں ان کی اتباع فرماتے ہیں۔

صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں دیانت عام تھی جس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے انکی نفسانیت اس مغلوب تھی کہ خصوصاً شریعت کے احکام میں انہیں اتباع ہویٰ کا خطرہ نہیں تھا اس لئے تقلید مطلق اور تقلید شخصی دونوں کا ان حضرات کے دور میں عمل ہوتا تھا دور میں جب یہ زبردست خطرہ سامنے آیا تو تقلید کو تقلید شخصی ہی میں محصور کر دیا گیا، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو احکام شریعت کے معاملے میں جو رالفری برپا ہوتی اس کا تصور اس وقت ہم مشکل ہی سے کر سکتے ہیں، چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:—

اعلم ان الناس کانوا فی المائۃ الاولیٰ والثانیہ غیر مجتمعین علی التقلید بمذھب معین وبعد المائتین ظھر فیھم التمذھب وقل من کان لا یعتمد علی مذھب مجتھد بعینہ وکان ھذا ھو الواجب فی ذلک الزمان۔

یاد رکھئے کہ پہلی اور دوسری صدی میں تقلید شخصی کا رواج نہ تھا پھر دوسری صدی کے بعد تقلید شخصی پر عمل شروع ہوا اور اس وقت بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو کسی معین مجتہد کے مذہب پر اعتماد نہ کرتے ہوں اور اس زمانے میں یہی چیز واجب تھی۔

اس پر بعض حضرات کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک چیز عہد صحابہؓ و تابعین میں تو ضروری نہ ہو پھر بعد میں اسے ضروری قرار دے دیا جائے؟ اس اعتراض کا تسلی بخش جواب دیتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ کتنی اچھی بات تحریر فرماتے ہیں:—

قلت الواجب الاصلی تقلید من لیعرف الاحکام الفرعیۃ عن ادلتھا التفصیلیۃ اجمع علی ذلک اھل الحق فاذا کان للواجب طرق متعدد دوجب تحصیل طریق من الطرق من غیر تعیین واذا کان طریق واحد تعین ذلک الطریق بخصوصہ کما کان السلف لایکتبون الحدیث ثم صار فی یومنا ھذا الکتابۃ الحدیث واجبۃ لان روایۃ الحدیث لا سبیل لھا الا معرفۃ ھذہ الکتاب وکان السلف لا یشتغلون بالنحو والصرف واللغۃ لان لسانھم کانت عربیۃ ثم صار فی یومنا ھذا معرفتھا واجبۃ، فاذا کان انسان جاھل فی بلاد الھند وما وراء النھر ولیس ھناک شافعی ولا مالکی ولا حنبلی ولا کتب ھذہ المذاھب وجب علیہ ان یقلد بمذھب ابی حنیفۃ ویحرم علیہ ان یخرج من مذھب

اس اعتراض کے جواب میں میری گذارش یہ ہے کہ اصل میں تو اس شخص کی تقلید کرنا ضروری ہے جو فرعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ جانتا ہو، اس بات پر تمام اہل حق کا اجماع ہے، پھر اگر واجب کو ادا کرنے کے کئی راستے ہوں، تب تو ان میں سے کوئی بھی اختیار کرلے واجب ادا ہو جائے گا، ان راستوں میں سے کسی ایک کو معین کرنا واجب ہوگا لیکن واجب ادا کرنے کا صرف ایک راستہ ہو تو وہی راستہ واجب ہو جائے گا، مثال کے طور پر ہمارے اسلاف حدیثوں کو لکھتے نہیں تھے، مگر ہمارے زمانے میں حدیث کا لکھنا واجب ہوگیا اس لئے کہ اب روایت حدیث کی اس کے سوا کوئی اور سبیل نہیں رہی کہ انہی کتابوں کی طرف مراجعت کی جائے، اسی طرح ہمارے اسلاف صرف، نحو اور لغت کے علوم حاصل کرنے میں مشغول نہیں ہوتے تھے، اس لئے کہ ان کی مادری زبان عربی تھی، لیکن ہمارے زمانے میں ان علوم کی تحصیل واجب ہوگئی ہے۔

بخلاف ما اذا کان فی الحرمین لانہ یتیسر ھناک معرفۃ جمیع المذاھب (الانصاف ص ۵۹)

لہٰذا اگر کوئی جاہل انسان ہندوستان یا ماوراء النہر کے کسی ایسے علاقے میں ہو جہاں نہ تو کوئی شافعی، مالکی، حنبلی عالم ہے اور نہ ان مذاہب کی کتابیں پائی جاتی ہیں، تو اس کے لئے امام ابوحنیفہؒ کی تقلید ہی واجب ہو جائے گی اور ان کے مذہب سے خروج اس کے لئے حرام ہوگا (کیونکہ دوسرے مذاہب کے احکام معلوم کرنے کی اس کے پاس کوئی شکل نہیں ہے) اس کے برخلاف اگر کوئی شخص حرمین میں ہو تو ان مذاہب میں سے کسی کی تقلید کر لینا کافی ہوگا۔ کیونکہ وہاں ہر مذہب کی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ ایک اور جگہ حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں:

وھذہ المذاھب الاربعۃ المدونۃ المحررۃ قد اجمعت الامۃ علی جواز تقلیدھا الی یومنا ھذا وفی ذلک من المصالح مالا یخفی لا سیما فی ھذہ الایام التی قصرت ہممہا واشربت النفوس الھوی واعجب کل ذی رای برایہ، وما ذھب ابن حزم من ان التقلید حرام غلط

یہ چار مذاہب جو مدوّن ہو کر تحریری شکل میں موجود ہیں۔ ان کی تقلید کے جائز ہونے پر تمام امت کا اجماع ہے اور اس میں جو مصلحتیں ہیں وہ پوشیدہ نہیں رہ سکتیں بالخصوص اس زمانے میں جب کہ ہمتیں پست ہو چکی ہیں۔ خواہش پرستی لوگوں کی گھٹی میں پڑ گئی ہے اور ہر ایک صاحب رائے کو اپنی رائے پر گھمنڈ ہونے لگا ہے اور ابن حزمؒ کی یہ بات غلط ہے کہ تقلید حرام ہے۔

تقلید پر کچھ شبہات اور انکے جواب

مندرجہ بالا بحث سے تقلید شخصی کی حقیقت، اس کے جواز اور ضرورت کے دلائل معلوم کرنے کے بعد ہم خیال ہے کہ ہر انصاف پسند ذہن سے غلط فہمیاں بڑی حد تک کم ہوئی ہوں گی۔ اب ہم چاہتے ہیں مختصراً ان شبہات کو زیر بحث لائیں جو عام طور سے تقلید پر وارد کئے جاتے ہیں:۔

(۱) کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم نے ان الفاظ میں تقلید کی مذمت کی ہے:

واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما وجدنا علیہ اباءنا اولو کان اباؤھم لا یعقلون شیئا ولا یھتدون۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں ان کی پیروی کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو ان باتوں کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) بھلا اگر ان کے باپ دادے عقل و ہدایت نہ رکھتے ہوں تب بھی؟

لیکن جو گذارشات ہم نے پچھلے صفحات میں پیش کی ہیں اگر ان کی روشنی میں بنظر انصاف غور کیا جائے تو یہ شبہ خود بخود دور ہو سکتا ہے، دیکھئے اللہ تعالیٰ۔

، واداؤں کی تقلید پر مذمت کے دو سبب بھی ساتھ بیان فرما دیئے ہیں، ایک یہ کہ وہ لوگ اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کو یہ کہ کر رد کر دیتے ہیں کہ ہم اس کے بجائے اپنے باپ دادوں کی بات مانیں گے۔ دوسرے یہ کہ ان کے بزرگ عقل و ہدایت سے کورے تھے۔

ہم جس تقلید سے گفتگو کر رہے ہیں اس میں یہ دونوں سبب مفقود ہیں کوئی تقلید کرنے والا خدا و رسول کے احکام کو رد کر کے کسی بزرگ کی بات نہیں بلکہ وہ اپنے بزرگ کو شارح قرآن و سنت سمجھتا ہے اور دوسرا سبب بھی ظاہر ہے کہ یہاں نہیں پایا جاتا، کیوں کہ اس سے کوئی اہل حق انکار نہیں کر سکتا۔ آئمہ مجتہدین کی تقلید کی جاتی ہے ان سے کتنا ہی اختلاف رائے کیوں نہ ہو، مگر ہر اعتبار سے ان کی جلالت قدر ہر ایک کو مسلم ہے اس لئے اس مذکور کا فروں کی تقلید پر منطبق کرنا بڑے ظلم کی بات ہے۔

(۳) بعض حضرات تقلید پر اس آیت کو چسپاں فرماتے ہیں:

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ۔ — انہوں نے اپنے علما اور تارک الدنیا زاہدوں کو اللہ کے بجائے اپنا پروردگار بنا رکھا ہے۔

لیکن ہم پیچھے عرض کر چکے ہیں کہ کسی مجتہد کی تقلید اسے شارع یا قانون ساز (LEGISLATURE) سمجھ کر نہیں کی جاتی بلکہ اسے شارح قانون قرار دے کر کی جاتی ہے، اسے اپنی ذات کے اعتبار سے واجب الاتباع قرار نہیں دیا جاتا، بلکہ ان کی بیان کردہ تشریحات پر اعتماد کیا جاتا ہے، اس لئے اس تقلید کو کافروں کی تقلید سے کوئی نسبت نہیں۔

(۳) بعض حضرات کے ذہن میں یہ خلش رہتی ہے کہ ائمہ مجتہدین نے خود فرمایا ہے کہ ہمارے قول پر اس وقت تک عمل نہ کرو جب تک کہ اس کی دلیل معلوم نہ ہو جائے۔

لیکن ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ مجتہدین کے اس ارشاد کے مخاطب وہ لوگ نہیں ہیں جو صلاحیت اجتہاد سے محروم ہیں، ورنہ ان کا یہ ارشاد خود ان کے دوسرے اقوال و افعال سے معارض ہوگا، اس لئے کہ ان کی سوانح حیات اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہیں کہ لوگ ان سے مسئلے پوچھتے تھے اور وہ بغیر دلیل بیان کئے جواب دیدیتے تھے، اگر یہ چیز ان کے نزدیک جائز نہ ہوتی تو وہ خود اس کا سبب کیوں بنتے؟ اور خود ان کے متعدد اقوال ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر مجتہد کے لئے تقلید ہی کو ضروری قرار دیتے ہیں مثلاً امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:-

علی العامی الاقتداء بالفقہاء لعدم الاھتداء فی حقہ الی معرفۃ الاحادیث۔ (ہدایہ ص ۲۰۶) — عام شخص پر واجب ہے کہ وہ فقہا کی اقتدا کریں، اس لئے کہ وہ خود احادیث کو سمجھنے میں ٹھوکریں کھا سکتے ہیں۔

(۴) بعض حضرات کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں تقلید کا رواج نہ تھا اس لئے تقلید بدعت ہے۔

لیکن ہم گذشتہ صفحات میں ثابت کر چکے ہیں کہ تقلید کی دونوں قسمیں عہد صحابہ میں پائی جاتی تھیں اور قرآن و حدیث دونوں سے اس کا جواز بلکہ وجوب معلوم ہوتا ہے۔ رہا یہ کہ تقلید شخصی ان زمانوں میں ضروری نہ تھی، اب کیسے ضروری ہو گئی؟ سو اس سوال کا جواب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے الفاظ میں بیان کیا جا چکا ہے۔

(۵) بعض حضرات تقلید کی ضرورت کا انکار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قرآن و حدیث بہت آسان ہیں اس لئے ان سے احکام سمجھنے میں کسی کے واسطہ کی ضرورت نہیں، قرآن کریم خود فرماتا ہے:-

ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر (قمر)

اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان بنایا ہے تو کیا کوئی نصیحت کرنے والا ہے؟

لیکن خود اس آیت کے الفاظ پر غور فرمایئے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کریم کی وہ آیات آسان ہیں جو وعظ و تذکیر اور نصیحت و عبرت کے مضامین پر مشتمل ہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "للذکر" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ یعنی قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کیا گیا ہے۔ رہیں وہ آیات جو احکام و حکم پر مشتمل ہیں، سو ان کا دقیق ہونا بالکل ظاہر ہے چنانچہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

انزل القران علی سبعۃ أحرف لکل آیۃ منها ظهر وبطن ولکل حد مطلع۔ (مشکوٰۃ بحوالہ شرح السنہ ص ۳۷)

قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا جن میں سے ہر آیت کے ایک ظاہری معنی ہیں اور ایک باطنی۔ اور ہر حد کے لئے اطلاع کا طریقہ جداگانہ ہے۔ (یعنی ظاہری کے لئے عربی زبان اور باطنی کے لئے قوت فہم)

تقلید میں جمود

لیکن جہاں تقلید کا انکار ہماری نظر میں درست نہیں وہاں تقلید کو حدِ اعتدال سے بڑھا دینا بھی غلط اور خطرناک ہے اگر تقلید کرتے ہوئے کوئی شخص اس حد تک پہونچ جائے کہ فقہاء مجتہدین کو خدا کی طرح واجب الاتباع سمجھنے لگے اور "مارا ابوحنیفہ باید، قول رسول کافی نیست" کا قائل ہو تو وہ بھی انتہائی قابل مذمت ہے اور خطرہ ہے کہ یہ چیز شرک سے نہ مل جائے۔

یا اگر کسی متبحر عالم کو جو قرآن و سنت پر گہری نظر رکھتا ہو اور اس سے متعلق تمام علوم کا ماہر ہو اپنے امام مجتہد کا قول واضح طور سے کسی صحیح حدیث کے خلاف نظر آئے وہ صحیح حدیث واضح بھی ہو اور اس کے معارض کوئی حدیث نہ ہو تو اسے چاہئے کہ امام مجتہد کا قول ترک کر کے حدیث صحیح پر عمل کرے لیکن مجتہد کی شان میں گستاخی نہ کرے بلکہ اسے یا تو یوں سمجھے کہ یہ حدیث انہیں پہونچی نہ ہوگی، یا اسے خطأ اجتہادی پر محمول کرے۔

اس کے بجائے اگر کوئی شخص قول مجتہد کو چھوڑنے پر راضی نہ ہو تو وہ تقلید کے معاملہ میں حد سے گذر رہا ہے اس کا یہ عمل ہر لحاظ سے غلط ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی میں کئی مسائل ایسے ہیں جن پر متبحر علماء نے حدیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے فتویٰ نہیں دیا، مثلاً بٹائی کے بارے میں امام ابو حنیفہ فرماتے تھے کہ اس کی ہر صورت ناجائز ہے۔ مگر چونکہ یہ بات صحیح احادیث کے خلاف تھی اس لئے تمام علماء حنفیہ نے بالاتفاق اس کے بجائے صاحبین کا قول اختیار کیا جو احادیث کے مطابق تھا۔

خود ائمہ مجتہدین کا ارشاد ہے کہ اگر ہمارا کوئی قول حدیث کے خلاف نظر آئے تو اسے دیوار پر دے مارو اور حدیث پر عمل کرو۔

تقلید کے بارے میں "حق" درحقیقت ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے کہ نہ اسے شرک، گناہ اور بے کار چیز سمجھا جائے اور نہ اس حد تک غلو اور جمود اختیار کیا جائے کہ وہ واقعی شرک کی سرحدوں کو چھونے لگے۔

ؔ لیکن حدیث کے مخالف ہونے کا فیصلہ کرنے کے لئے چار باتوں کا پایا جانا ضروری ہے ایک تو یہ کہ فیصلہ کرنے والا متبحر عالم ہو اور قرآن و سنت کے علوم سے پوری واقفیت ہو، دوسرے یہ کہ جو حدیث اس کے مخالف پڑ رہی ہے وہ واضح الدلالہ ہو۔ چوتھے یہ کہ اس حدیث کے معارض کوئی مقبول حدیث نہ ہو۔ اگر ان میں سے ایک شرط بھی مفقود ہوگی تو نہ حدیث کی مخالفت کا فیصلہ درست ہوگا اور نہ اس کی بنا پر امام کے قول کو چھوڑنا (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد از مولانا تھانویؒ ص ۴۳ مطبوعہ کراچی)

کیا فقہ خودساختہ قانون ہے ؟

تقلید واجتہاد کی بحث میں ایک انتہائی تکلیف دہ مرحلہ یہ ہے کہ بعض حضرات تقلید کی مخالفت میں ان پاک نفس فقہاء کو برا بھلا کہنے سے بھی نہیں چوکتے جن کی زندگی کا ہر سانس خدمت دین کے لئے وقف تھا۔ ان حضرات نے فقہ اسلامی کا جو بیش بہا ذخیرہ ہمارے لئے چھوڑا ہے بجائے اس کے کہ اس پر ان کے ممنون ہوں وہ اس ذخیرے کو "خودساختہ" اور "گھڑا ہوا" جیسے مذموم ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

جب بات اس حد تک پہونچ جائے تو اس کا کوئی علمی جواب دل پر پتھر رکھ کر ہی دیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ اس مضمون سے ہمارا مقصد نزاع وجدال نہیں افہام وتفہیم ہے۔ اس لئے ہم چند ان مسائل کی دلیلیں ذیل میں ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جن پر "خودساختہ" ہونے کا الزام عام طور سے لگایا جاتا ہے۔

(۱) کہا جاتا ہے کہ فقہ حنفی میں مردوں کو بحالت نماز ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی تائید کسی روایت سے نہیں ہوتی — سنن ابوداؤد میں حضرت علیؓ کا ارشاد منقول ہے :

ان من[1] السنۃ وضع الیمین علی الشمال تحت السرۃ۔	یہ بات سنت ہے کہ (نماز میں) داہنا ہاتھ ناف کے نیچے بائیں ہاتھ پر رکھا جائے۔

(باب وضع الیمنیٰ علی الیسریٰ ص ۱۱۰)

اگرچہ اس روایت کو ضعیف قرار دیا گیا ہے لیکن جس روایت سے ہاتھوں کو سینے پر باندھنا معلوم ہوتا ہے وہ بھی ضعیف ہے۔ ایسی صورت میں امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ نے حضرت علیؓ کے مذکورہ بالا ارشاد پر عمل کرنا اس لئے مناسب سمجھا ہے کہ وہ قرین قیاس بھی ہے اس لئے کہ اس میں ادب وتعظیم کا زیادہ پہلو ہے۔

پھر اسی پر بہت سے صحابۂ کرامؓ مثلاً حضرت ابوہریرہؓ، حضرت انسؓ اور کبار تابعین مثلاً حضرت ابراہیم نخعیؒ، حضرت ابومجلزؒ وغیرہ کے فتاویٰ ہیں — (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الجوہر النقی لابن الترکمانیؒ ص ۱۲۶ ج ۱) اعلاء السنن ج ۲ ص ۱۴۹) اس کے علاوہ بھی بعض مرفوع احادیث ایسی ہیں جو ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو مسنون قرار دیتی ہیں، بلکہ علامہ ابن قیمؒ نے تو سینے پر ہاتھ باندھنے کو مکروہ قرار دیا ہے — بدائع الفوائد ص ۹۱ ج ۳)

ان آثار کے ہوتے ہوئے اس مسئلہ پر "خودساختہ" ہونے کا الزام سراسر زیادتی نہیں تو اور کیا ہے ؟

(۲) کہا جاتا ہے کہ احناف جو نماز میں رکوع میں جاتے اور اس سے اٹھنے کے وقت ہاتھ نہیں اٹھاتے اس کا روایات سے ثبوت نہیں ہے، حالانکہ اس مسئلے کی دلیل میں ایک دو نہیں، سات آٹھ روایتیں موجود ہیں ان میں سے دو ملاحظہ فرمائیے :

(الف) عن جابر بن سمرۃؓ قال خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال مالی اراکم رافعی ایدیکم	حضرت جابر بن سمرۃؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ یہ کیا بات ہے کہ میں تمہیں اس طرح

---

[1] اگرچہ یہ حضرت علیؓ کا قول ہے، لیکن حافظ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی صحابی سنت کا لفظ استعمال کریں تو اس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہوتی ہے اور ایسی حدیث مرفوع کے حکم میں قرار دی جائے گی (دیکھئے نصب الرایہ ص ۱۴۱ ج ۱ اول)۔

کانھا أذناب خیل شمس، اسکنوا فی الصلٰوۃ

(صحیح مسلم ص ۱۸۱)

اس طرح ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھتا ہوں؟ گویا کہ وہ شریر گھوڑوں کی دُمیں ہیں، نماز میں سکون اختیار کیا کرو۔

(ب) عن علقمۃ قال قال ابن مسعودؓ الا اصلی بکم صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصلی فلم یرفع یدیہ الا فی اول مرۃ، رواہ ابوداؤد والنسائی واحمد والترمذی وقال حدیث حسن۔

(جامع ترمذی ص ۳۵ ج ۱)

علقمہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کیا میں تمہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز نہ پڑھاؤں، چنانچہ آپ نے نماز پڑھائی اور پہلی مرتبہ کے سوا پھر اپنے ہاتھ نہیں اٹھائے، اس حدیث کو ابوداؤدؒ، نسائیؒ، احمدؒ اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور ترمذیؒ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

(۳) حنفیہ پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ پہلی اور تیسری رکعت میں سجدہ سے اٹھ کر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جلسۂ استراحت نہیں کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ سیدھا کھڑا ہو جانا کسی حدیث سے ثابت نہیں۔

حالانکہ صحیح بخاریؒ اور جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان ینھض فی الصلوٰۃ علی صدور قدمیہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ (بخاری ص ۱۱۴ و ترمذی ص ۱۲۹)

اس سے اکثر علماء نے یہی سمجھا ہے کہ جلسۂ استراحت کے بغیر کھڑے ہونا بہتر ہے اور بے شمار صحابہؓ مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن زبیرؓ، حضرت عمرؓ، ابوسعید خدریؓ، حضرت ابن عباسؓ کا یہی معمول تھا (دیکھئے نصب الرایہ ص ۳۸۹ ج اول)

(۴) حنفیہ کی نماز کے "فاسد" ہونے کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ آخری قعدہ میں بھی بائیں پاؤں پر اسی طرح بیٹھتے ہیں جس طرح قعدہ میں، حالانکہ انہیں آخری قعدہ میں عورت کی طرح تورک کرکے بیٹھنا چاہیے۔

لیکن حنفیہ کے اس عمل کی دلیل میں مندرجۂ ذیل روایت موجود ہے:

عن عائشۃؓ فی حدیث طویل کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی کل رکعتین التحیۃ وکان یفترش رجلہ الیسریٰ وینصب رجلہ الیمنیٰ۔

(صحیح مسلم ص ۱۹۴ ج ۱)

ایک لمبی حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں رکعتوں میں التحیات پڑھتے تھے اور اپنا بایاں پاؤں بچھاتے تھے اور داہنا کھڑا کرتے تھے۔

(۵) حنفیہ پر غیظ و غضب کا اظہار اس وجہ سے بھی کیا جاتا ہے کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتے، حالانکہ ان کا یہ عمل بہت سی آیات

۱؎ اس سے مراد سلام پھیرتے وقت ہاتھ کا اٹھانا اس لئے نہیں ہو سکتا کہ آنحضرتؐ کا ارشاد "اسکنوا فی الصلوٰۃ" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ رفع یدین کے بارے میں ہے جو نماز کے اندر تھا اور ظاہر ہے کہ سلام کی حالت کو نماز کی حالت نہیں کہا جا سکتا ـــ تفصیل کے لئے ملاحظہ نصب الرایہ ص ۳۹۳ ج اول حاشیہ۔

، ثابت ہے ، ان میں سے ایک ملاحظہ ہو :

عن ابی نعیم وھب بن کیسان انہ سمع جابر بن عبد اللہ یقول من صلی رکعۃ لم یقرأ فیھا بام القرآن فلم یصل الا وراء الامام	ابو نعیم وہب بن کیسان کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر بن عبد اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے کوئی رکعت اس طرح ادا کی کہ اس میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی تو اس کی نماز نہیں ہوئی ، لیکن امام کے پیچھے ، یہ حدیث حسن وصحیح ہے ۔

ھذا حدیث حسن صحیح (ترمذی ص ۴۱ ج ۱)

(۶) حنفیہ کی نماز پر چھٹا اعتراض یہ ہے کہ وہ فرضوں کی تیسری اور چوتھی رکعت میں صرف خاموش کھڑا رہنا کافی سمجھتے ہیں ، ان میں قرأت کو ض قرار نہیں دیتے ، ان کے اس عمل کی کوئی اصل نہیں ہے ۔

اس کے جواب میں ہماری گذارش یہ ہے کہ بلاشبہ ایسی کوئی صریح روایت موجود نہیں ہے جو قرأت کو صرف دو رکعتوں کے ساتھ مخصوص کرتی ہو م ابو حنیفہ نے یہ حکم فاقرء وا ما تیسر من القرآن کی دلالت اور قیاس سے نکالا ہے ، لیکن جس طرح اس بات پر کوئی صریح روایت نہیں ہے اس سے ہر رکعت میں قرأت کی فرضیت ثابت ہوتی ہو ، امام شافعیؒ نے بھی یہ حکم قیاس ہی سے مستنبط فرمایا ہے ، اب یہ عجیب معاملہ ہے کہ ایک قیاس جائز بلکہ واجب قرار دیا جائے اور دوسرے کو شرک وکفر ، تلک اذا قسمۃ ضیزیٰ ۔

(۷) کہا جاتا ہے کہ حنفیہ نے نماز کی نیت زبان سے کرنے کی اجازت دی ہے ۔ اور یہ بدعت ہے ۔

یہاں بھی ہماری گذارش یہ ہے کہ زبان سے نیت کرنا کسی صریح حدیث سے ثابت نہیں ہے ، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اسے مسنون یا واجب سمجھ کر کرے تو اس کا یہ فعل بدعات میں شمار ہوگا ، ——— لیکن حنفیہ نے اسے مسنون یا واجب کب کہا ہے ؟ ان کے کہنے کا مقصد تو صرف اتنا ہے اس زمانے میں جبکہ انسان کا ذہن ہزار طرح کے دھندوں میں الجھا رہتا ہے ، اگر وہ زبان سے نیت کرکے استحضار پیدا کرلیں تو جائز یا زیادہ سے زیادہ بہتر ہے اور اگر کسی شخص کو اس کے بغیر استحضار حاصل ہو جاتا ہے تو اسے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے ، (ملاحظہ ہو مراقی الفلاح) ——— اور ظاہر ہے کہ نیت میں استحضار پیدا کرنا وہ چیز ہے جس کی احادیث میں ترغیب دی گئی ہے ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

حافظوا علی نیاتکم فی الصلوٰۃ	نماز میں اپنی نیتوں کی حفاظت کرو ۔

(مجمع الزوائد ص ۱۸۱ ج ۲)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید کسی زمانے میں زبان سے نیت کرنے کو مسنون یا ضروری سمجھا جانے لگا ہوگا ، جس کی وجہ سے علامہ ابن قیمؒ نے اسے بدعت قرار دیا ہے ۔

(۸) شہریوں کے لئے نماز عید سے پہلے قربانی کرنا از روئے حدیث جائز نہیں ہے ، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک گاؤں والے اس سے مستثنیٰ ہیں ، وہ طلوع فجر کے متصل بعد بھی قربانی کرسکتے ہیں ، کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا یہ استثناء "خود ساختہ" ہے اور اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے ۔

اس کے جواب میں ہماری گذارش یہ ہے کہ جس حدیث میں نماز سے پہلے قربانی کرنے کو جائز قرار نہیں دیا گیا ، وہ صحیح مسلمؒ کی مندرجہ ذیل حدیث ہے

من ضحی قبل الصلوٰۃ فانما ذبح لنفسہ ومن ذبح بعد الصلوٰۃ فقد تم نسکہ ۔	جس شخص نے نماز سے پہلے قربانی کی تو اس نے خود اپنے لئے ذبح کیا ، اور جس نے نماز کے بعد قربانی کی تو اسکی قربانی پوری ہو گئی ۔

روایت کے الفاظ پڑھ کر ہر معمولی سوجھ بوجھ کا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ حکم لوگوں کو دیا جا رہا ہے جن کو نماز عید پڑھنی ہے ـــــ
سکے برخلاف گاؤں والے لوگوں پر نماز عید ہے ہی نہیں تو ان کے لئے "نماز سے پہلے" اور نماز کے بعد کی تفصیل کیسے صحیح ہو سکتی ہے ؟ ان
ق میں تو حکم اپنی اصل پر ہی باقی رہے گا کہ اگر وہ طلوع فجر کے فوراً بعد قربانی کر لیں تو ان کی قربانی درست ہو جائے گی۔

(۹) کہا جاتا ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر مفقود ہو جائے تو اس کے بارے میں حنفیہ نے بہت سخت حکم لگا دیا ہے کہ وہ موت کی خبر آنے تک انتظار کرے
پھر جب شوہر کی عمر ستر سال کی ہو جائے تب وہ دوسرا نکاح کر سکے گی۔[1]

اس کے جواب میں عرض ہے کہ یہ دونوں باتیں خود حدیث سے ثابت ہیں ـ سنن دارقطنی کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مفقود
بیوی کے بارے میں ارشاد فرمایا :-

هی امرأته حتی یاتیها البیان — وہ اسی کی بیوی ہے یہاں تک کہ کوئی خبر آ جائے۔

(درایہ علی الہدایہ ص ۲۲۲)

حضرت علیؓ سے اس کی تشریح مصنف عبدالرزاقؒ میں بالفاظ ذیل منقول ہے :-

هی امرأة ابتلیت فلتصبر حتی یستبین موت أو طلاق (ایضاً) — یہ عورت آزمائش میں پڑ گئی ہے اس لئے اسے چاہیئے کہ اس وقت تک صبر کرے جب تک کہ شوہر کی موت یا طلاق کی خبر نہ آئے

رہا یہ کہ ستر سال کی عمر ہو جانے پر کس دلیل سے موت کا حکم لگایا گیا ہے ؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

اعمار امتی ما بین الستین الی السبعین۔ (فتح القدیر) — میری امت کی عمریں (اوسطاً) ساٹھ اور ستر کے درمیان رہیں گی۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ عورت کو ستر سال انتظار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حالانکہ مقصد یہ ہے کہ شوہر کی عمر
کے ستر سال ہونے کا انتظار کیا جائے، خواہ یہ اس کے گم ہونے کے ایک ہی سال بعد ہو جائے۔

بہرکیف! یہ چند نمونے تھے ان مسائل کے جن پر خود ساختہ ہونے کا الزام عائد کیا جاتا ہے ان سے آپ پر یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ ہر فقہی حکم کی
بنیاد کوئی آیت قرآنی، کوئی حدیث، کوئی اثر ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات خاص اس جزئیہ کا ذکر قرآن و سنت میں نہ ہو لیکن ظاہر
ہے کہ قرآن و سنت نے تو ہمیں اصول عطا فرمائے ہیں ان اصول کی روشنی میں فقہاء و مجتہدین نے اپنی اپنی فہم و بصیرت کے مطابق جزئیات مستنبط فرمائے
ہیں، کسی شخص کو ان جزئیات سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کے بارے میں یہ کہنا کہ انہیں اپنی طرف سے گھڑ لیا گیا ہے ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہنے لگے
کہ بلنڈی، وہسکی، بیئر، تجارتی سود، سینما بینی، فوٹوگرافی کی حرمت کا حکم تم نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے، قرآن و سنت میں ان میں سے کسی کے حرام ہونے
کا ذکر نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص یہ بات کہنے لگے تو اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ قرآن و سنت نے عام اور اصولی احکام دئے ہیں ان کے ضمن میں یہ سب چیزیں

---

[1] یہاں یہ واضح رہے کہ احناف کے علماء متاخرین نے ہمارے زمانے میں حضرت عمرؓ کے ایک فیصلے کی بنیاد پر چار سال انتظار کرنے کے بعد دوسری شادی کرنے کی اجازت پر فتویٰ دیا ہے جس کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیے الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ از مولانا تھانویؒ ــ ایک ایک مسئلے کی دلیل معلوم کرنا ہو تو مصنف ابن ابی شیبہ، الجوہر النقی، نصب الرایہ، فتح القدیر، اور اعلاء السنن کا مطالعہ فرمایا جائے ۱۲ تقی

خود بخود آجاتی ہیں اس لئے ان کی حرمت کو قرآن و سنت ہی سے ثابت کیا جائے گا۔

ہماری گذارش یہ ہے کہ بعینہٖ یہ بات فقہاء کرام کے اجتہادات کے بارے میں کیوں نہیں کی جاتی؟ انہوں نے بھی قرآن و سنت کے عام اور اصولی احکام کو پیش نظر رکھ کر فقہی مسائل مرتب کئے ہیں اور پوری احتیاط، تدین و تقویٰ کے ساتھ کئے ہیں پھر ان کے مرتب کردہ فقہ کو "خودساختہ" کہنے والوں کو سوچنا چاہئے کہ وہ کتنے بڑے ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ہم آخر میں ایک بار پھر اپنی اس بات کو دہراتے ہیں کہ حاشا وکلا! اس مضمون سے ہمارا مقصود بحث برائے بحث، مناظرہ و جدال ہرگز نہیں ہے۔ اگر نادانستہ طور پر کوئی لفظ ہمارے قلم سے ایسا نکل گیا ہو جس سے کسی صاحب کے دل کو ٹھیس لگتی ہے تو ہم اس کی پورے خلوص کے ساتھ معافی چاہتے ہیں ان صفحات کو تحریر کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ آپس کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے امکانات پیدا ہوں، اس دور میں جب کہ اسلام اور مسلمانوں پر ہر طرف سے فتنوں کی یورش اور مصائب کی یلغار ہے، ہمارے لئے اس سے زیادہ تباہ کن چیز کوئی نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ان فروعی مسائل پر دست گریباں ہوں اور ذرا ذرا سی باتوں پر ایک دوسرے کو کافر و مشرک قرار دیں، تاریخ کے صفحات پر بکھری ہوئی بے شمار داستانیں ہمیں یہ سبق دینے کے لئے کافی ہیں کہ ہماری شوکت وعظمت کے پرچم کسی دشمن نے سرنگوں نہیں کئے ہم نے خود آپس کی خانہ جنگیوں کے ذریعہ انہیں ایک ایک کرکے زیر کیا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی مسلمانوں میں فروعی مسائل پر معرکے گرم ہوئے ہیں، ہمیشہ ان سے اسلام کے دشمنوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔

کاش کہ دردمندی و دلسوزی سے نکلے ہوئے یہ چند کلمات کسی حساس اور دھڑکتے ہوئے دل کو متاثر کرسکیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

فاران:۔ ماہ جون ۱۹۶۴ء کے "فاران" میں "تلاش حق" نام کی ایک کتاب پر تبصرہ کیا گیا تھا ہم نے اس میں لکھا تھا۔

"یہ ایک تحریری مناظرہ ہے ـــــ سید مسعود احمد صاحب اور نواب محی الدین صاحب کے درمیان تقلید شخصی اور دوسرے اختلافی مسائل پر خط و کتابت ہوتی ہے یہاں تک کہ نواب صاحب موصوف، سید مسعود صاحب کے دلائل سے متاثر اور مطمئن ہو کر، حنفی مذہب چھوڑ کر اپنے اہل حدیث ہونے کا اعلان کردیتے ہیں"

"بعض متشدد احناف اس خبر کو سن کر چیں بہ جبیں بلکہ برہم ہوں گے مگر ہمارے نزدیک نواب محی الدین صاحب حنفی تھے تو بھی وہ مسلمان تھے اصحاب اہل حدیث مسلک اختیار کرنے کے بعد بھی اسی طرح مسلمان ہیں ان کے ایمان و اسلام کو نہ تو حنفیت نے کوئی نقصان پہونچایا ہے اور نہ مسلک اہل حدیث نے!ـــ مگر اس کتاب میں بعض باتیں بہت زیادہ قابل اعتراض اس قسم کی باتوں سے حق پسند جماعتوں کے درمیان منافرت پیدا ہوتی ہے اور ایک مستقل نزاع اور کشمکش برپا ہو جاتی ہے نواب محی الدین لکھتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے محترم مسعود صاحب کے ذریعہ کس طرح مجھ پر حق واضح فرمایا اور مجھے صراط مستقیم دکھائی ـــــ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر بھولے ہوئے کو سیدھی راہ دکھلا دیں"

"صراط مستقیم تو دراصل اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا دین (اسلام) ہے۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، فقہی مذاہب اور مسلک اہل حدیث اسی صراط مستقیم (دین حق) کے درمیان کی منزلیں اور کاروان سرائے ہیں یا زیادہ سے زیادہ یوں کہ لیجئے کہ پگ ڈنڈیاں ہیں جو اسی صراط مستقیم سے نکلی ہیں اور پھر اسی میں مل گئی ہیں ان میں سے کوئی مسلک راہ ضلالت نہیں ہے نواب محی الدین کو اپنے اس خیال وعقیدہ کی تصحیح کرلینی چاہئے انہیں یوں کہنا اور سمجھنا چاہئے کہ وہ حنفی مسلک کو ترک کرکے اس مسلک (اہل حدیث) کی جانب آئے ہیں جو حنفی مذہب کے مقابلے میں ان کی تحقیق کی حد تک اقرب الی الصواب ہے"

اس تبصرے میں ہم نے غربائے اہل حدیث کے امام مولانا عبدالستار دہلوی کے اس فتوے پر بھی گرفت کی تھی، جس میں انہوں نے حنفی مذہب کو نیچریت زنایت اور چکڑالویت کی طرح مذہب باطل ٹھیرایا تھا۔

ہمارے اس تبصرے پر غربائے اہل حدیث کے آرگن "صحیفہ اہل حدیث" میں شدید اعتساب کیا گیا اور اس کے بعد مولوی عبدالسلام خاں صاحب بریلوی ناظم نشر و اشاعت جماعت اہل حدیث کراچی نے ایک طویل خط ارسال فرمایا اس خط کو ہم نے مولانا محمد تقی صاحب استاذ دارالعلوم کراچی کی خدمت میں بھیج دیا، مولانا موصوف نے ہماری درخواست پر علمی اور تدریسی مصروفیات کے باوجود ایک مفصل مقالہ تحریر فرما دیا اس مقالہ میں خط مذکور کے اہم سوالات کے جوابات آگئے ہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے ہر بات کا جواب دلائل سے دیا ہے، کتاب و سنت اور آثار صحابہ کے حوالوں کے ساتھ! منقولات کیساتھ عقلی دلائل بھی دل نشین ہیں اور ذہن و فکر کو مطمئن کرنے والے! "تقلید" اور خاص طور سے حنفی فقہ کے مسائل کے بارے میں بعض ذہنوں میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اُن کو اس مضمون میں رفع کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

جتنے فقہی مذاہب اور مسلک اہل حدیث ہے اُن کے فقہی اختلافات اصل میں نہیں فروع میں ہیں اور معاملہ حق و باطل کا نہیں راجح و مرجوح کا ہے جو کوئی فقہ حنفی کو "گمراہی کا مذہب" یا "خود ساختہ مسلک" سمجھتا ہے اُسے اپنے تشدد اور عصبیت کی اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دہی کرنی ہوگی، اور کیا عجب ہے کہ اس "تہمت تراشی" کی سزا بھی بھگتنی پڑے! فقہ حنفی کی اساس کتاب و سنت اور آثار صحابہ پر ہے! حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے ائمہ احناف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع اور فرماں بردار تھے (خاک بدہن گستاخ معاندانہ اور مخالف نہ تھے (اس تصور سے کہ دربار اللہ تعالیٰ کی پناہ) جو متشدد اہل حدیث چھوٹتے ہی احناف کو جہنم کی وعید سناتے اور ان کے دوزخی ہونے کا فتویٰ صادر کرتے ہیں وہ یا تو پاگل ہیں یا پھر پہلے درجہ کے جاہل اور سفیہ ہیں۔

احناف کو قادیانیوں کا مماثل ٹھیرانا ــــ یہ وہ "کفر" ہے جو خود کہنے والے پر پلٹ کر آتا ہے جو کوئی احناف اور قادیانیوں کو ایک ہی جیسا سمجھتا ہے وہ خود فساد عقیدہ میں مبتلا ہے اور اس کی یہ بات سو فیصدی غلط بلکہ ضلالت آمیز ہے اگر وہ اپنے اس گمراہ عقیدہ سے توبہ نہ کرے گا تو مرتے وقت سوء ایمان کا خطرہ ہے۔

فقہ کے فروعی مسائل کی نزاع اور معرکہ آرائی اس زمانے میں جب کہ لوگ ایمان و یقین اور ارکان دین ہی سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں کوئی نیکی کی بات نہیں ہے، ضرورت اس کی ہے کہ کفر و بے دینی، تہذیب و مغرب زدگی کے خلاف مسلمانوں کے تمام فرقے متحد ہو جائیں اور بنیان مرصوص بن جائیں نماز میں جو کوئی رفع یدین کرتا ہے اور جو نہیں کرتا، خدا کی قسم نماز دونوں کی ہو جاتی ہے، یہی نوعیت دوسرے فروعی مسائل و اجتہادات کی ہے! فقہی مسائل میں اختلافات کی حدود ہیں، ان حدود کا احترام کرنا چاہئے! اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو آپس میں متحد، متفق اور یک دل و یک جان ہونے کی توفیق عطا فرمائے!

(آمین)

اس سلسلہ میں صفحہ (۴۲) پر علامہ نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم و مغفور کا مسلک کیا ہے اسے اس مضمون کے ساتھ ہی ضرور پڑھ لینا چاہئے۔
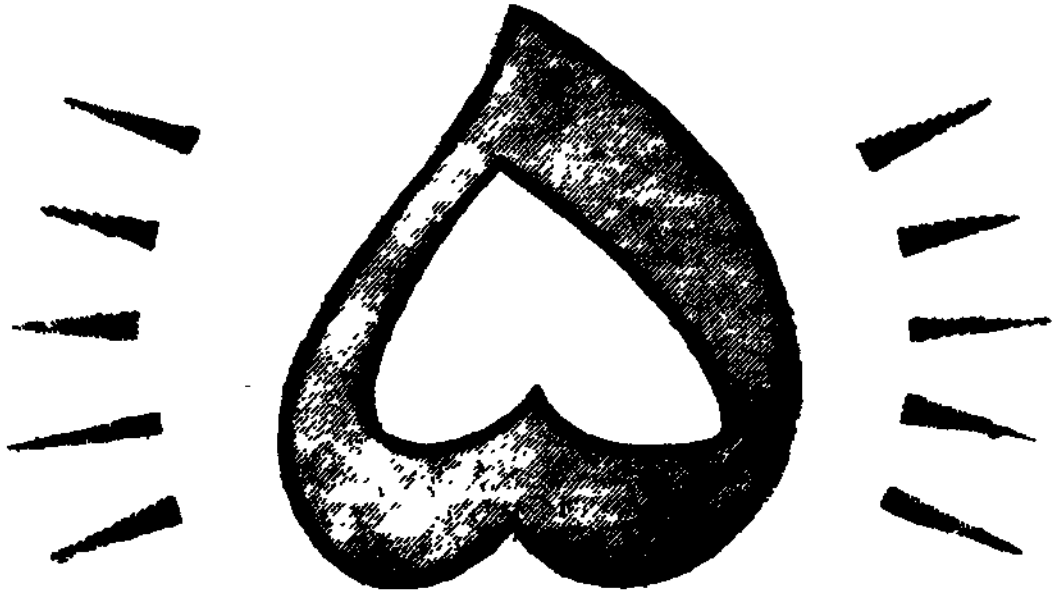
۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد۔ کمر کا درد۔ دانت کا درد
ایام۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
Spotlit
01/63

مُلّا واحدی

کل کیا ہوگا!

ہر شخص کو کل کی فکر ہے۔ غریب سے لے کر امیر تک اور بادشاہ سے لے کر فقیر تک، سب اس تشویش میں مبتلا ہیں کہ کل کیا ہوگا۔ کل نہ سہی، بعد کی کل سہی اور بعد کی کل سہی۔ کل کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے اور بالآخر ایک ایسی "کل" آتی ہے کہ پھر فکر کرنے والے کے واسطے "کل" ہوتی۔ اس آخری "کل" کی بہت کم لوگوں کو فکر ہے اور جنہیں فکر ہے وہ بھی اُس کی فکر سے اتنے سراسیمہ نہیں ہیں جتنے دنیاوی کل سے ہیں۔ یعلمون ظاہرا من الحیوٰۃ الدنیا ج وھم عن الاخرۃ ھم غفلون۔ وہ دنیا کی زندگی کے ظاہر (مقاصد) کو تو سمجھتے ہیں، اور وہ (نادان) آخرت (مبادا کر) سے غافل ہیں (بھولے ہوتے ہیں کہ ایک دن مرنا ہے اور اللہ کے دربار میں جانا ہے) (مفہوم سورہ ۳۰ - آیت ۷)

یہاں جو دنیاوی کل کی فکر نہیں کرتے، انہیں بھی غافل ہی کہنا چاہئے۔ غفلت کا پردہ اُن کی عقل پر بھی پڑا رہتا ہے۔ ایسے لوگ تک جنہ کے اوپر کامل بھروسہ اور توکل ہے، کل کا انتظام اور کل کی تدبیر ضرور کرتے ہیں۔ ہمارے ہادیؐ کا ارشاد ہے کہ اونٹ کو کھلا نہ چھوڑو، درخت سے باندھ دو اور درخت سے باندھ کر امید رکھو کہ اللہ تعالیٰ اُسے رسّی تڑا کر بھاگنے نہ دے گا۔ دولت و اقتدار کے نشے میں دین سے غافل ہو جانا اور جہالت میں "دنیاوی کل" سے غافل ہو جانا، دونوں برابر ہیں اور دونوں بُرے ہیں، البتہ کل کا انتظام اور کل کی تدبیر کر دینے کے بعد پریشان رہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے صحیح انتظام کیا ہے اور صحیح تدبیر کی ہے تو اللہ سے اچھی امید رکھنی چاہئے اور دماغ کو خراب نہیں کرنا چاہئے۔ جناب حیرت شملوی کا شعر ہے ؎

آج اس سوچ میں بیٹھا ہوں کہ کل کیا ہوگا
اس سے بڑھ کر بھی کسی سر میں خلل کیا ہوگا

لیکن جس کل کی طرف میں توجہ دلانی چاہتا ہوں، اُس کی سوچ میں بیٹھنا خللِ دماغ نہیں ہے بلکہ صحتِ دماغ ہے۔ میں اور آپ اس سوچ میں بیٹھیں تو یہ اللہ کا بڑا فضل ہوگا اس سوچ سے دنیا اور عقبیٰ دونوں جگہوں کی کل کے درست ہو جانے کا امکان ہے۔ اسلئے ظاہر ہے کہ دنیا کی کل کا تو ہم کچھ نہ خیال کر لیتے ہیں، مگر عقبیٰ کی کل کے لئے ہم نے کیا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

أحسب الناس أن يتركوا أن يقولوا آمنا وهم لا يفتنون ० ولقد فتنا الذين من قبلهم فليعلمن الله الذين صدقوا وليعلمن الكذبين۔ کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ (صرف) اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے۔ (عذاب الٰہی سے) چھوٹ جائیں گے (اور دارین حاصل کر لیں گے) اور زبان سے ایمان کا اقرار کر کے (اُن کے ایمان کی پختگی اور خامی) کا امتحان نہیں لیا جائے گا۔ (ایمان لفظی کافی نہیں ہے) ان سے پہلے (اگلی امتوں میں) جو (ایمان دار گزر چکے) ہیں، ہم نے اُن (کے ایمان) کو (بھی) آزما لیا تھا۔ پس اللہ (موجود

رح سے آزمائے گا،) جن لوگوں نے (ایمان کا دعویٰ کرنے میں) صداقت سے کام لیا ہے اُنہیں بھی معلوم کرے گا، اور جنہوں نے جھوٹ
ہیں بھی معلوم کرے گا۔ (مفہوم سورہ ۲۹ - آیات ۲ و ۳)

سورہ ۴۵، آیت ۲۱ میں ارشاد ہے :- ام حسب الذین اجترحوا السیأت ان نجعلھم کالذین امنوا وعملوا الصلحٰت
یا ھم و مماتہم ط سآء ما یحکمون ۔ جنہوں نے برائیاں کمائی ہیں کیا اُن کا گمان ہے کہ ہم انہیں اُن کے برابر ہو کر دیں گے جو ا یمان لے آئے ہیں اور بھلے عمل کرتے ہیں اور سب کا جینا اور مرنا ایک سا ہوگا۔ (اُن کے گمان غلط ہیں اور) اُن کے دعوے جھوٹے ہیں۔ (مفہوم)
ـ مثقال ذرۃ خیرا یرہ ۝ و من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ ۝ جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہے (قیامت کے دن) وہ اسے دیکھ لے گا
. ذرہ بھر بدی کی ہے وہ اُسے دیکھ لے گا۔ (مفہوم سورہ ۹۹ - آیات ۷ و ۸)

سورہ ۲ - آیت ۲۱۴ میں ارشاد ہے :- ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم ط مستھم
ء والضرآء و زلزلوا حتی یقول الرسول والذین امنوا معہ متیٰ نصر اللہ ط الا ان نصر اللہ قریب ۔ کیا تم نے خیال کر
رکھا ہے) جنت میں داخل کر دیے جاؤ گے، حالانکہ تم پر اُن لوگوں جیسے مصائب نہیں بیتے جو تم سے قبل ہو گئے ہیں (اور جنہوں نے انقلاب آفرینی کی
کی تھیں) انہیں ایسی ایسی سختیوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ جھڑ جھڑا اٹھے تھے، حتیٰ کہ (اس وقت کے) رسول اور رسول کے ساتھی
اے بشریت، ہمت شکن مرحلوں سے گھبرا کر) کہنے لگے تھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی (پھر ہم نے جواب دیا تا کہ) اللہ کی مدد قریب ہے ۔
ن مراحل سے گزرنا ہوگا جن سے گزشتہ لوگ گزرے تھے، ہمارا تجویز کردہ معاشرہ قائم کرنے ۔۔۔ سو اب برداشت کر کے ہی تم ہماری مدد
اور جنت کے مستحق بن سکتے ہو۔) (مفہوم)

سورہ ۳ - آیت ۱۴۲ میں ارشاد ہے :- ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یعلم اللہ الذین جھدوا منکم ویعلم
ین ۔ کیا تم نے خیال کر رکھا ہے کہ جنت میں (بغیر آزمائش) کے داخل ہو جاؤ گے۔ ابھی اللہ نے کہاں جانچا ہے کہ تم میں (خالص اللہ کے واسطے) لڑنے
کون ہیں، نیز (اللہ کو) ابھی یہ دیکھنا ہے کہ لڑائی میں ثابت قدم کون کون رہتے ہیں۔ (مفہوم)

سورہ ۹ - آیت ۱۶ میں ارشاد ہے :- ام حسبتم ان تترکوا ولما یعلم اللہ الذین جھدوا منکم ولم یتخذوا من دون
اللہ ولا رسولہ ولا المؤمنین ولیجۃ ط واللہ خبیر بما تعملون ۔ کیا تم نے خیال کر رکھا ہے کہ (یونہی) چھوٹ جاؤ گے، حالانکہ
اللہ نے یہ بھی نہیں جانچا کہ تم میں سے کس کس نے (للّٰہیت سے) جہاد کیا ہے اور اللہ اور اللہ کے رسولؐ اور مسلمانوں کے سوا کسی (غیر) کو اپنا
دوست نہ بنایا۔ اللہ کو خبر ہے جو تم کر رہے ہو۔ (ایمان لانے اور اللہ کا بندہ بن جانے کے دعوے آسان ہیں۔ امتحان کی کسوٹی پر کسا جانا مشکل ہے ۔
ایمان کی سب سے بڑی کسوٹی ہے اور جہاد میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ صدق و اخلاص سے کیا ہے یا نمود کی غرض سے۔) (مفہوم)

خیر اللہ کے واسطے جان دینا اور اللہ کے دین اور اللہ کے تجویز کردہ معاشرے کی خاطر اپنے آپ کو قربان کرنا تو اونچی بات ہے آج تو یہ دیکھنا ہے
دین کی سربلندی کے واسطے کون کون اپنی زندگی کو اتنا سنوارتا ہے کہ غیر مسلم کہیں کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں۔ مسلمان ایک دوسرے کی دل آزاری
، مسلمان ایک دوسرے کو نہیں لوٹتے۔ مسلمان اچھی چیزوں میں بُری چیزیں نہیں ملاتے۔ مسلمان چور بازاری سے دور رہتے ہیں، مسلمان رشوت
، مسلمان رشوت نہیں دیتے، اور رشوت نہ دے کر اپنے کاموں کا بگڑ جانا گوارا کر لیتے ہیں۔ مسلمان دوسرے مسلمانوں کے فائدے پر اپنے فائدے
رکھتے ہیں۔ مسلمان قناعت اور استغنا کے بادشاہ ہیں۔ مسلمان فقر و خاک نشینی کی عظمت سے واقف ہیں ۔

آیئے، آیئے، میں بھی سوچوں اور آپ بھی سوچئے کہ کل عقبیٰ میں میرے ساتھ اور آپ کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ کیا میں نے اور آپ نے اپنا کردار سچے مسلمانوں کا سا پیش کیا ہے کیا میں اور آپ مندرجہ بالا آیات کی کسوٹی پہ ایک بٹا سو بھی پورے اترتے ہیں۔

سوچنے سے تو میرا جی ڈرتا ہے۔ کردار کچھ نہیں۔ فقط اللہ کی رحمت کا آسرا ہے۔ بس قرآن قرآن کی یہ آیت ڈھارس بندھا رہی ہے —
ورحمتی وسعت کل شئی۔ یہ میری رحمت نے جملہ اشیا کو گھیر رکھا ہے۔ میری رحمت جملہ اشیا سے بڑی ہے۔ میری رحمت سے باہر نکلی ہوئی کوئی شئے نہیں ہے (مفہوم سورہ ۷، آیت ۱۵۶)

اور دلی کے ایک اُمّی شاعر، مرزا مخمور کا یہ شعر بار بار زبان دوہرا رہی ہے ؎

میں سر جھکا کے سوئے جہنم چلا ہی تھا
کچھ رحم آگیا مرے پروردگار کو

الٰہی! یہی کیفیت مرتے دم باقی رکھیو۔ اتنی کیفیت بھی غنیمت ہے۔ اتنی کیفیت کا مل جانا بھی تیرا کرم ہے۔ اتنی کیفیت جوانوں کو مل جائے تو ان کا کردار بن سکتا ہے، ہم بوڑھے تو اس شعر کے مصداق ہیں ؎

اے حسن توبہ آں زماں کردی
کہ ترا طاقت گناہ نماند

(صفحہ ۲۸ کا بقیہ)

فقہی مذاہب اور . . . . . . !

علامہ نواب صدیق حسن خاں صاحب قنوجی ثم بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ جو مشاہیر علماء اہل حدیث میں شمار کئے جاتے ہیں، اُن کی کتاب — ابقاء المنن بالقاء المحن — کا اقتباس ہندہ روزہ ترجمان دہلی (یکم اگست ۱۹۶۴ء) سے یہاں نقل کیا جاتا ہے

"ایک منت خدا کی مجھ پر یہ ہے کہ میں فقط جماعت اہل سنت کو فرقہ ناجیہ جانتا ہوں۔ حنفی ہوں یا شافعی یا مالکی یا حنبلی ظاہری یا اہل حدیث یا اہل سلوک اور کسی کے حق میں ان میں سے گمان بد نہیں رکھتا۔ اگرچہ مجھ کو یہ بات معلوم ہے کہ ہر گروہ کے اندر ان میں سے مسائل خلاف دلائل بھی ہیں اور بعض موافق نصوص، بعض مبادی ان کے صحیح اور بعض ضعیف یا مردود ہیں۔ اس لئے کہ حکم اکثر کو ہے نہ اقل مسائل کو۔ ائمہ سلف سے جو عمل بعض احادیث میں متروک ہو گیا ہے اس کے بیس عذر ہیں جو کتاب "جلب المنفعت" میں لکھے گئے ہیں، ائمہ سلف پر طعن مخالفت سنت کی کرنا انصاف کا خون بہانا ہے۔ ہاں جو مقلدان کے بعد وضوح دلیل کتاب و سنت کے تقلید رائے بحت پر جامد ہیں ان کو خاطی سمجھتا ہوں! لیکن گمراہ بحت نہیں جانتا، نہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتا ہوں نہ معاذ اللہ ان کو کافر کہوں۔

مسائل عبادات و معاملات میں اختلاف اہل علم کا منجر بکفر نہیں ہوتا ہے۔ غایت مانی الباب یہ ہے کہ خطا فی الاجتہاد یا خطا فی الفہم ہے جس کو علماء راسخین پہچانتے ہیں۔ جن کا کام نفی تحریف غالین و انتحال مبطلین و تاویل جاہلین ہے۔ اللہ سے امید ہے کہ اگر قائل اس خطا کا اپنے دین میں مخلص غیر متعصب تھا اور کسی وجہ تری سے شبہ میں گرفتار ہو گیا ہے تو وہ خطا اس کی معاف ہو جاوے اور اگر جو اس کا اس خطا پر عمداً براہ عناد و شقاق خدا و رسول کے ہے تو محل نہایت اندیشہ کا ہے لیکن کسی مسلمان راجح و خائف کی نسبت اتنی بدگمانی کرنا کچھ ضرور نہیں ہے۔ نحن نحکم بالظواہر واللہ اعلم بالسرائر۔"

کاش! جماعت غرباء اہل حدیث کے امام اور اُن کے ماننے والوں کو اس اقتباس کو پڑھ کر فقہی مذاہب کے بارے میں اپنے غلط

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

زائرِ حرم حضرت حمید صدیقی مرحوم

اب سے تیس سال پہلے جناب حمید صدیقی لکھنوی کا نعتیہ کلام رسالوں اور اخباروں میں میری نگاہ سے گزرتا رہا، یہ اُس زمانہ کی بات ہے جب حیدرآباد دکن میں مقیم تھا۔ پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ لکھنؤ کے مدحِ صحابہ کے مشاعرے میں مجھے بلایا گیا، کان پور میں بھی انہیں دنوں ایک ہو رہا تھا، دونوں مشاعروں میں چند دنوں کا فصل تھا، ایک چھوڑ دو دو مشاعروں کی دعوت، میں دکن سے چل کر سیدھا لکھنؤ پہونچا صحابہ کے مشاعرے میں حمید صدیقی کو دُور سے دیکھا، بات چیت کیا علیک سلیک تک نہیں ہوئی، ایک صاحب نے اشارے سے بتایا کہ یہ زائرِ حرم صدیقی ہیں، مگر اُن کی طبیعت ناساز ہے اور گلا بیٹھا ہوا ہے، مشاعرے میں کچھ سنائیں گے نہیں! یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے، جو تھائی صدی ختم ہونے میں بارہ سے زیادہ ایک برس رہ گیا ہے۔

اب پانچ سال قبل کراچی میں حضرت جگر مراد آبادی مرحوم کی یاد میں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا اُس میں حمید صدیقی مرحوم کو بھی بلایا گیا ہے پہلی بار معانقہ ہی میں یہ محسوس ہوا کہ ہم دونوں روحانی طور پر ایک دوسرے کے نہ جانے کب سے دوست ہیں! فرمانے لگے ریڈیو پر ۔ کی نعتیں سنتا رہتا ہوں، اور . . . " پھر کراچی کی شعر و ادب کی متعدد نشستوں میں اُن سے ملاقاتیں رہیں، اُن کا کلام سُنا، اُن کے ساتھ چائے پی، کھانا کھایا، یہاں تک کہ ہوائی جہاز میں کراچی سے ڈھاکہ تک کا سفر کیا۔ وہاں بھی مشاعرہ تھا ایک ہی بنگلہ میں کئی دن تک ساتھ ٹھیرنا ہوا

تعلقِ خاطر کا کرشمہ اور دونوں کے ربط و اتحاد کا فیض تھا کہ انتقال سے چند ماہ پہلے حمید صدیقی نے اپنی دو نعتیہ نظمیں خاص طور سے فاران میں چھپنے کے لئے ایک صاحب کی معرفت روانہ فرمائیں! براہِ راست کلام بھیجنے اور خط لکھنے میں شاید وہ کسی خاص سبب مانع تھے! پچھلے ہندوستان کے ایک اخبار میں چند سطروں کی خبر پڑھی کہ زائرِ حرم حمید صدیقی اللہ کو پیارے ہو گئے، اس کے بعد کئی خط بھی مجھے ملے، جن سے سانحہ کی تصدیق بھی ہو گئی! کاش! یہ اطلاع غلط اور یہ خبر غیر مصدق ثابت ہوتی! مگر اللہ تعالیٰ کا کارخانہ ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کا پابند تھوڑی ہے! جس جاندار اور ذی حیات کیلئے جو گھڑی مقدر ہو چکی ہے وہ پھر ٹل نہیں سکتی!

حمید صدیقی کے نعتیہ کلام میں جو تنوع، تازگی، شادابی اور عقیدت و محبت پائی جاتی ہے بس وہ اُنہی کا حصہ ہے۔ مدینہ منورہ کے گلی کوچوں، بازاروں اور حرمِ نبوی کے دروازوں، ستونوں اور دوسرے متبرک آثار و مقامات کو اُنہوں نے جس شاعرانہ زبان میں منظوم کیا ہے، اس سے اُن کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے، پڑھنے کا انداز بھی بڑا ہی دلکش تھا! صورت، شکل اور وضع قطع خالص مشرقی اسلامی! صوم و صلوٰۃ کے اس درجہ پابند کہ اشراق و تہجد اور تسبیح و ذکر معمولات میں داخل تھے، مدینہ اور مدینہ والے کے فدائی، عاشق، متوالے اور مدح خواں! یہ بیسوں حج کئے اور روضۂ نبوی کی زیارت سے مشرف ہوئے، ہر حاضری اور زیارت کے بعد شوق دوچند ہو جاتا، دل کی لگی اور بھڑک جاتی!

(باقی ص ۵۱ پر)

گذر جائے اُسے زندگی کے بہتر لمحات میں شمار کرنا چاہیئے !

۱۹۵۴ء کا ذکر ہے، فروری کی ایک چمکیلی اور خوش گوار دوپہر کو میں لاہور اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۲ پر دہلی کی طرف سے آنے والی کلکتہ میل کا انتظار کر رہا تھا۔ اس گاڑی میں دارالعروبہ کے نگران الاستاذ مسعود الندوی جالندھر سے لاہور آ رہے تھے۔ یہاں انہیں شام کو ہوڑہ ایکسپریس میں سوار ہو کر صوبہ بہار کی طرف جانا تھا۔ "مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر آپ مجھے اسٹیشن پر آ کر ملیں" انہوں نے مجھے اپنے عربی خط میں اس پروگرام کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا اس سے متصل ہی خط کا وہ آخری جملہ تھا جس نے گذشتہ کئی روز سے میرے دل و دماغ میں ایک کھلبلی مچا رکھی تھی : " لما اسنا نست فیکم من امارات النبوغ والکمال" (کیونکہ مجھے آپ کے اندر ہونہاری اور ہنرمندی کی علامات دکھائی دی ہیں) --- ہونہاری اور ہنرمندی کی علامات ! اس جملے کے ٹھیک ٹھیک مفہوم کا تصور کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی خاطر میں نے گذشتہ دنوں میں خدا جانے کتنی بار اس خط کو شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا تھا اور وہ اس وقت بھی میری جیب میں تھا۔ اس دن گاڑی کچھ لیٹ تھی۔ انتظار و اضطراب کے ان لمحوں کو بہلانے کے لئے میں نے ایک مرتبہ پھر جیب سے وہ خط نکالا اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔

استاذ مسعود الندوی معتمد دارالعروبہ کا خط، ایک اجنبی طالب علم کے نام اور وہ بھی ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ! ---- یہ کوئی اتنی آسانی کے ساتھ دستیاب ہونے والی چیز نہیں تھی۔ اس کی خاطر مجھے کتنی محنت اور جانکاہی کرنی پڑی تھی، اس کا اندازہ کچھ آگے چل کر ہوگا۔

استاذ مسعود کے ساتھ میرے تعارف کی ابتدا ان کے ایک "مقدمے" سے ہوئی تھی جو سات آٹھ صفحوں پر پھیلا ہوا یہ مقدمہ انہوں نے ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے ایک سلسلہ " قصص النبیین للاطفال" کی تیسری یا چوتھی کتاب کے شروع میں، عربی زبان میں لکھا تھا۔ یہ سلسلہ میں نے ---- "ترجمان القرآن" کی سفارش پر لکھنؤ سے منگوایا تھا۔ صاف اور جلی قلم سے لکھی اور لیتھو پر چھپی ہوئی یہ کتابیں فی الواقع عربی زبان کے " اطفال" کے لئے جن میں اس وقت میں بھی شامل تھا، تحفے کی چیز تھیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ان کتابوں میں بیک وقت عربی زبان و ادب اور دینی روایات کی تعلیم دینے کا ایک نرالا اور خوش گوار تجربہ کیا تھا۔ میں پہلے پہل تو ان کتابوں پر ٹوٹ کر گرا، لیکن پھر دن اور ہفتے اور مہینے گذر گئے اور میں اس سلسلہ کی اصل کتابوں کو پڑھنے کی بجائے، استاذ مسعود کے عربی مقدمے میں گم ہو کر رہ گیا۔ مجھے عربی شروع کئے ہوئے ان دنوں تین یا چار ماہ ہوئے ہوں گے اور اس وقت تک میں نے اس زبان کی کچھ ابتدائی درسی کتابیں پڑھی تھیں یا پھر علی گڑھ کی یونیورسٹی لائبریری میں جا کر ایک عربی رسالے "العرب" کی ورق گردانی کیا کرتا تھا جو اس وقت کی ہندوستانی حکومت خلیج فارس کے عربوں کے ساتھ میل جول بڑھانے کے لئے دہلی سے نکالا کرتی تھی۔ رسالہ کے مضامین ذرا پوری طرح نہیں پڑھے جاتے تھے۔ لیکن اس میں دی ہوئی مختصر خبروں کا مطلب نکالنے میں بے اندازہ خوشی ہوتی تھی ---- انہی دنوں جب استاذ مسعود کا یہ عربی مقدمہ پڑھنے میں آیا تو یکایک محسوس ہوا کہ اب تک عربی زبان میں جو پڑھا وہ سب نقل اور دھوکا تھا اور عربوں کے انداز میں لکھی ہوئی اصل اور بلیغ عربی زبان کا نمونہ اگر کوئی ہو سکتا تھا تو وہ یہی تھا جو اب پڑھنے کو ملا تھا۔ مقدمے کی عبارت پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی تھی، لیکن لکھنے والے نے اس کی زبان میں کچھ ایسا رس گھول دیا تھا کہ بار بار پڑھنے کے بعد بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی تھی اور پڑھتے پڑھتے یہ مقدمہ مجھے تقریباً حفظ ہو گیا تھا۔

" قصص النبیین" کے رسائل کے ساتھ کتب فروش نے جن دوسری مطبوعات کے اشتہار بھجوائے تھے ان میں ایک عربی ماہنامہ " الضیاء" بھی تھا، جو استاذ مسعود الندوی کی ادارت میں ندوہ سے کچھ سال کے لئے نکلا اور پھر بند ہو گیا تھا۔ اس رسالے کے کچھ پرانے پرچے فروخت کیلئے موجود تھے۔ استاذ کی عربی تحریر کا جادو اب مجھ پر چل چکا تھا۔ اس لئے میں نے " الضیاء" کے وہ پرچے منگوانے میں ذرا سا وقت بھی ضائع نہ کیا اور اس کے

سال کے باقی حصے میں (یہ اپریل۔مئی ۴۶ء کی بات ہے) مجھے یاد نہیں کہ میں نے "الضیاء" کے علاوہ کسی دوسری کتاب یا رسالے کو اس قدر سنجیدگی اور انہماک سے پڑھا ہو۔

استاذ مسعود الندوی کی شخصیت رفتہ رفتہ میرے تصور میں ابھرنے لگی تھی ان کی ایک تصویر وہ تھی جو "الضیاء" کے صفحات پر ان کے مقالات میں، ان کے افتتاحیوں میں، ان کے تبصروں میں اور خاص کر اس رسالہ کے آخری شمارے کے افتتاحی نوٹ میں سامنے آئی تھی۔ اس میں وہ مجھے ایک ایسے شخص کے روپ میں نظر آتے تھے جس نے عربی زبان اپنا رکھی تھی، جس کے منہ میں عرب کے اصل باشندوں کی زبان تھی، جس کے سینے میں اسلام کا درد، اور دین و وطن کی خاطر قربانیاں جھیلنے والوں کے لئے ایک پرجوش عقیدت تھی۔ شام کے امیر شکیب ارسلان اور مصر کے سید رشید رضا اس کے ہیرو تھے عربی زبان سے والہانہ محبت اور اس کے فروغ کی آرزو سے اس کا سینہ معمور تھا —— اور ایک دوسری تصویر اردو لٹریچر اور اخبارات ورسائل کے واسطہ سے نمایاں ہونے لگی تھی، جس میں وہ ایک معتبر عالم، ایک روشن دماغ رکن مجلس، ایک دردمند اور صلح جو انسان اور ایک ہر دلعزیز شخص کی صورت میں سامنے آتے تھے۔ ان کی تحریروں کی طرح ان کی شخصیت کے ساتھ بھی میری گرویدگی اب اتنی بڑھ چکی تھی کہ اُن سے قریب ہونے اور کسی نہ طرح اُن کے نوٹس میں آنے کی خواہش ان دنوں میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ اُن سے ملاقات اور بالشافہ گفتگو کرنے میں میرا فطری شرمیلا پن اور کوتاہ لسانی مانع تھی۔ کہاں "الضیاء" کا مدیر شہیر اور کہاں ایک —— اور کم حوصلہ نوجوان جسے صحیح اردو میں بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد مجھے ان حالات میں اس سے بہتر اور کوئی صورت نظر نہ آئی کہ میں کسی بھی بہانے اپنی امکانی کوشش کے ساتھ ایک خط عربی زبان میں ایسا لکھوں کہ وہ مجھے آسانی کے ساتھ نظر انداز نہ کرسکیں —————— خزاں کا موسم تھا، بہاول پور کے نواح میں ایک تنہا مکان کے اندر عربی کی گنی چنی کتابوں اور "الضیاء" کے کچھ پرچوں کے درمیان بیٹھ کر میں نے ایک ہفتہ یا شاید اس سے بھی زیادہ دن دو صفحوں کا ایک عربی خط لکھنے میں صرف کئے۔ خط کا مضمون اور مدعا میرا تھا، لیکن الفاظ اور ترکیبیں اور جملوں کی ساخت امیر شکیب ارسلان کی تھی یا محب الدین الخطیب کی، یا مسعود عالم کی۔ اس کے بعد بھی کچھ عرصہ یہ خط میرے پاس رہا اور میں برابر اس کی نوک پلک درست کرتا رہا آخر جب میں ریلوے ورکشاپ میں ٹریننگ لینے کی غرض سے مقیم ہوا تو یہاں پہونچتے ہی وہ خط دارالعروبہ جالندھر کے پتہ پر بھجوا دیا —————— ایک صاحب نے جو اُن دنوں کچھ عرصہ استاذ مسعود کے قریب رہے، مجھے بتایا تھا کہ جب تمہارا خط انہیں ملا ہے تو وہ پڑھ کر بے قرار سے ہو گئے۔ بار بار اس خط کو دیکھتے تھے اور حیرانی کا اظہار کرتے تھے —— میرے اس خط کے جواب میں انہوں نے اپنے قلم سے وہ عربی خط مجھے لکھا تھا جس کا اوپر ذکر ہوا، اور جو اس وقت لاہور اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر کی ایک بنچ پر بیٹھا میں ایک بار پھر پڑھ رہا تھا!

اُس دن کلکتہ میل سے استاذ مسعود کسی وجہ سے نہ آسکے۔ گاڑی جب پلیٹ فارم پر آکے رکی تو میں نے دھڑکتے ہوئے دل اور متلاشی نگاہوں سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھ ڈالا، لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آئے، ان کے غائبانہ تعارف سے میں نے ان کی جو صورت اپنے تصور میں بنائی ہوئی تھی اس صورت کا کوئی آدمی بھی اس گاڑی سے نمودار نہ ہوا اور میں اس یقین کے ساتھ واپس آگیا کہ انہوں نے اپنا پروگرام بدل لیا ہے۔

اس کے بعد کچھ مہینے یوں ہی گذر گئے!

بہار اب ختم ہو چکی تھی اور موسم گرما کا زمانہ تھا۔ نہر لوئر باری دوآب کے کنارے آباد ایک چھوٹی سی بستی میں سالانہ کانفرنس کے موقع پر دور دراز سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ شامیانے تنے تھے، فضا میں لاؤڈ اسپیکر کی آواز گونج رہی تھی اور ایک غیر معمولی چہل پہل کے درمیان لوگ ایک دوسرے سے ملنے جلنے میں مصروف تھے، اس بھیڑ میں میں بھی کسی جگہ پھر رہا تھا کہ میرے بڑے بھائی مجھے تلاش کرتے کرتے آنکلے، اور کہا "چلو مولانا مسعود عالم صاحب

"مجھے ؟" میں نے کچھ حیرانی اور کچھ گھبراہٹ میں پوچھا "میرے متعلق انہیں کس نے بتایا ہے ؟"
ماپٹنہ میں انہوں نے اُس عربی خط کا ذکر کیا تھا تو میں نے بتا دیا تھا کہ اس کا لکھنے والا کون ہے، اب تمہارے یہاں آنے کا انہیں پتہ چلا ہے، تو وہ
یہیں پوچھ رہے ہیں" میرے بھائی اب مجھے ساتھ لئے اُن کی طرف جا رہے تھے۔
بارکوں کی شکل میں بنے ہوئے پختہ کمروں کی ایک لائن کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے ہم ایک کمرے کے سامنے پہونچے تو اندر سے ایک اُونچی آواز
پُہ "آپ نے تو ہمیں کب کا گرویدہ بنا رکھا ہے" کمرے میں داخل ہو کر میں جھجک کے مارے جوتیوں کے پاس بیٹھنے لگا تو وہی آواز پھر آئی "نہیں نہیں
جاتیے یہاں، تشریف !"

میں نے خوف اور مرعوبیت کے باوجود ایک نظر بھر کر استاذ مسعود کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک بڑی میز کے آگے دری کے فرش پر بیٹھے تھے۔ سفید کھدر کا
پاجامہ پہن رکھا تھا، کھلتا ہوا گندمی رنگ، کترواں مونچھیں اور ندرے لمبی کالی اور گھنی ڈاڑھی، دبیز شیشوں والی عینک کے پیچھے ان کی
ہیروں کی طرح چمکتی تھیں، زبان لکنت کی وجہ سے بعض اوقات اتنی تیز چلتی تھی کہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ان کی اس سرگرم اور پُرجوش خوش
میرے دل میں ان کا خوف اور دبدبہ بہت کچھ کم ہو گیا تھا وہ مجھے ایک استاد اور بزرگ کی بجائے ایک بڑے بھائی لگ رہے تھے اور میں نے قدرے
ساتھ ان کے ساتھ گفتگو شروع کر دی تھی۔

"آپ تو ماشاءاللہ نوجوان ہیں، میرا خیال تھا آپ کچھ عمر میں زیادہ ہوں گے" میں نے کچھ بے تکلف ہوتے ہوئے کہا "نوجوان ؟ آ.... آ.... آ"
ایک قہقہہ لگایا "نوجوان تو نہیں، البتہ جوان اگر آپ کہنا چاہیں تو کہہ لیجئے" استاذ نے پہلی ہی صحبت میں اپنی نکتہ سنجی کا ایک عمدہ نمونہ دکھایا
وہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک صاحب (مولانا عبدالغفار حسن) سے مخاطب ہوئے "تو یہ ہیں جناب وہ عربی کا معجزہ جن کا میں نے آپ
یا تھا۔ ان کا خط جب آیا تو میں پڑھ کر حیران ہوا۔ نہایت سلیس اور سہل ممتنع کا نمونہ! نیچے دیکھا تو نام کے ساتھ لکھا تھا: بی ایس سی
میں نے کہا نہیں صاحب، یہ کسی بی ایس سی کے بس کی بات نہیں ہے۔ صاحب زادے نے لاہور میں یونیورسٹی کے کسی پروفیسر سے خط لکھوا
ہے..... لیکن وہ پروفیسر بھی کون ہو سکتا ہے ؟..."
یہ پہلی ملاقات زیادہ لمبی نہ رہی۔ دوپہر کے کھانے کا اعلان ہوا تو سب کو منتشر ہونا پڑا۔ لیکن اس کے بعد اس کانفرنس کے موقعہ پر استاذ مسعود
فہ اطمینان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ایک ملاقات میں ان کے پاس صرف ایک یا دو افراد موجود تھے۔ مصر کے ہفتہ وار ادبی مجلّہ "الرسالۃ"
مارے ان کے پاس رکھے تھے۔ موقع غنیمت جان کر انہوں نے ان میں سے ایک پرچہ اٹھایا اور پہلے صفحہ پر کھول کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا
نظر ڈال لیجئے اور مجھے پڑھ کر سنا دیجئے" بالکل غیر متوقع طور پر میرا امتحان لیا جانے لگا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے میرے جسم پر کپکپی سی طاری
ب میں نے ایک نظر اس صفحہ کے پہلے کالم پر ڈال لی تو کچھ ہمت بندھی اور میں نے قدرے بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔ ابھی تین چار
ابھول گا کہ انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا "بس بس بس" میرا عربی لغت اور قواعد کا علم ان کے نزدیک قابل اطمینان تھا۔ اسی موقع پر
چھوٹا سا مضمون بھی عربی میں لکھنے کی فرمائش کی۔ لیکن یہ ایک کڑی آزمائش تھی، جس میں میری اصل قابلیت کھل جانے کا قوی امکان تھا
ن اور تنہائی کے ماحول میں ہفتہ عشرہ کی محنت سے لکھی ہوئی تحریر اور کہاں اس شور و شغب میں ایک مضمون لکھنے کی بے ڈھب سی کوشش!
ش کو ٹالنے میں ہی خیریت سمجھی۔ استاذ نے ایک دو بار پوچھا بھی تو کہہ دیا "وقت اور سکون ہی نہیں مل رہا کہ کچھ بیٹھ کر لکھوں"۔ اور اس
صورت بھی نہیں تھا۔

یہ ابتدا تھی اُس سات سالہ عہد کی جس میں میرا ربط استاذ مسعود کے ساتھ برابر قائم رہا اور جس میں اس پہلی ملاقات سے لے کر مارچ ۱۹۵۴ء میں ان کی وفات تک ذرّہ بھر کہیں ڈھیل نہ آئی۔ میں اپنے روزگار کے سلسلے میں استاذ سے ہمیشہ دُور رہنے پر مجبور تھا لیکن انہوں نے اپنی باقاعدہ اور منضبط خط وکتابت کی بدولت اس فاصلے کو باہمی ربط اور تعلق پر کبھی اثر انداز نہ ہونے دیا۔ متنبّی کے الفاظ میں وہ اس سمندر کی مانند تھے جو قریب والوں کے لئے موتی نکال کے پھینکتا ہے اور دور والوں کو رحمت کے بادل بھجواتا ہے:

كَالبَحرِ يَقذِفُ لِلقَرِيبِ جَوَاهِراً جُوداً وَيَبعَثُ لِلبَعِيدِ سَحَائِبَا

یہ خط وکتابت ابتداء میں کچھ عرصہ میری تربیت کا واحد ذریعہ تھی۔ میں عربی زبان میں استاذ کو خط نہیں لکھتا تھا، بلکہ خطوط کی شکل میں مضمون نگاری کرتا تھا۔ وہ ان کی اصلاح کر کے مجھے واپس بھجوا دیتے اور میرے ہر خط کے ساتھ اپنے زیرِ تربیت رفیق محمد عاصم الحداد سے بھی ایک خط عربی میں لکھوا کر بھیجتے۔ اس طرح ہم دونوں کی مشق ہوتی رہتی اور ایک خفیف اور دبا ہوا جذبۂ مسابقت (جسے ہم نے کبھی ظاہر نہ ہونے دیا تھا) ہمیں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے پر آمادہ کرتا رہتا۔ لیکن یہ سلسلہ چار یا پانچ خطوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک تو عربی انشاء ترقی کر گئی تھی، دوسرے انہی دنوں تقسیم کا وہ ہنگامہ پیش آ گیا جس کے سبب آبادیوں کو اِدھر سے اُدھر ہونا پڑا۔ میں ان دنوں لاہور کے ایک کارخانے میں ملازم تھا۔ کچھ دن کی رخصت لے کر بہاولپور گیا تو گاڑیوں کی قلت اور مسافروں کے آئے دن قتل وغارت کے واقعات کی وجہ سے ایک طویل عرصہ تک واپس نہ آ سکا۔ ملازمت جاتی رہی۔ جب اس طوفان کے تھمنے پر ستمبر یا اکتوبر میں لاہور آیا تو استاذ بھی فسادات کے اس ہفت خواں سے گذر کر یہاں پہنچ چکے تھے اور اسلامیہ پارک (اس زمانہ میں سنتی پارک) میں اپنے رفیقوں کے ساتھ ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ ان کا سارا کتب خانہ جس میں عربی کی بعض قیمتی اور نایاب کتابیں تھیں جالندھر میں رہ گیا تھا۔ میں نے جب انہیں جا کر ان کی عاریتاً دی ہوئی عربی رسالہ "الفتح" کی دو جلدیں واپس کیں تو مارے خوشی کے ان کے منہ سے بے ساختہ "جزاک اللہ" نکلا۔ کہنے لگے "اب اس تنگدستی میں ان دو جلدوں کی بھی بڑی قیمت ہے اگر مجھے ان حالات کا علم ہوتا تو جالندھر میں آپ کو اور بھی بہت سی کتابیں دے دیتا، وہ محفوظ تو ہو جاتیں"۔ ان دنوں وہ فسادات پر مضامین کا ایک سلسلہ عربی میں لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن کافی عرصہ لکھنا پڑھنا موقوف رہنے کی وجہ سے طبیعت میں انشراح نہیں ہوتا تھا۔ کہتے تھے "یوں لگتا ہے جیسے میں اپنا ذخیرۂ الفاظ بھی اپنی کتابوں کے ساتھ جالندھر میں چھوڑ آیا ہوں۔ فسادات کی ہولناکیوں پر لکھنا چاہتا ہوں لیکن سوائے فظائع اور شنائع کے اور کوئی لفظ ہی ذہن میں نہیں آتا۔ فظائع اور شنائع یہی دو لفظ ہیں جو یاد رہ گئے ہیں۔ اب ان دو لفظوں کے ساتھ میں کہاں تک اتنے بڑے مضمون میں کام چلا سکوں گا"۔

لاہور سے راولپنڈی اور راولپنڈی سے بلادِ عرب کا سفر، واپسی پر حیدرآباد، حیدرآباد سے گوجرانوالہ اور پھر واپس راولپنڈی! استاذ پاکستان میں آ کر بہت سی جگہوں کو اپنی صحت کے لئے آزما کر دیکھ چکے تھے۔ لیکن راولپنڈی کے سوا انہیں کوئی جگہ راس نہ آئی۔ انہیں ایسی آب وہوا کی تلاش جو مرطوب بھی نہ ہو اور جو گرد وغبار سے بھی خالی ہو۔ رطوبت اور گرد وغبار دونوں چیزیں ان کے دمہ کے عارضہ کے لئے سخت مضر تھیں۔ یہ عارضہ ان زندگی بھر کا عارضہ (LIFE-TIME DISEASE) تھا۔ دمہ کا دورہ ان پر بعض اوقات اس شدت کے ساتھ پڑتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شاید ان کی زندگی کا آخری دورہ ہو۔ ایسا ہی ایک دورہ میں نے پہلی دفعہ اپنے قیام جالندھر کے موقع پر دیکھا تھا۔ استاذ مسہری لگا کر سوئے ہوئے تھے۔ تنفس کی تکلیف سے ان کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور سانس کی سیٹی دور تک سنائی دیتی تھی۔ ان کے قریب رہنے والوں کے لئے یہ ایک معمول کی چیز لیکن میرے اوسان خطا تھے اور سوچتا تھا کہ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو میری یہ آمد کتنی نحس ثابت ہوگی اور پھر اس کام کا کیا بنے گا جو انہوں نے قابلیت کے ساتھ سنبھالا تھا ـــــ لیکن دوسرے دن وہ یوں اٹھ کے بیٹھے تھے جیسے رات کو وہ ساری تکلیف ان پر نہیں کسی اور پر گذری تھی!

ایک تندرست آدمی ایک پُرسکون نیند کے بعد اُٹھ بیٹھتا ہے اور جب میں واپس جانے لگا تو مجھے رخصت کرتے وقت ان کے چہرے پر ایک صحت مند انسان کی سی بشاشت تھی۔ انہوں نے اپنی اس تباہ کن بیماری کو زندگی کی ایک تلخ حقیقت (A HARD FACT OF LIFE) سمجھ کر اس سے نباہ کئے جانے کا عزم کیا تھا۔ وہ اپنی بیماری کے اتار چڑھاؤ کی کیفیات ضرور بیان کرتے تھے اور دعاؤں کے لئے بھی عموماً تقاضا کرتے رہتے تھے لیکن ان کی زبان سے اس مرض کا شکوہ میں نے کبھی نہیں سنا تھا اور نہ اس کی وجہ سے انہیں کبھی دل گرفتہ اور مایوس پایا تھا۔ ان کی زندگی ایک ایسے بحری سفر کے مانند تھی جس میں وقتاً فوقتاً طوفانوں کا اٹھنا ایک متوقع بات ہوتی ہے۔ اور ان طوفانوں سے گذرنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں ہوتی کہ ان کا پامردی سے مقابلہ کیا جائے۔ اس میں کیا شک ہے کہ اپنے اس مرض کی طوفان خیزیوں کا انہوں نے جس پامردی سے مقابلہ کیا وہ صرف اُن کے جیسی قوت ارادی رکھنے والا شخص ہی کر سکتا تھا۔

استاذ کے پاکستان میں آنے کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ پھر سے چل پڑا تھا۔ لیکن اب وہ میرے خطوں پر اصلاح نہیں دیتے تھے۔ بلکہ مجھے ادب اور نحو و بلاغت کے مطالعہ کے بارے میں مشورے دیتے، اچھی اچھی کتابوں اور مصنفوں کے نام بتاتے، اور عرب ممالک سے مفید عربی رسالے منگوا کر میری مدد کرتے۔ استاذ مسعود الندوی یوں تو مجموعہ الصفات انسان تھے۔ لیکن میرے ذہن پر ان کی شخصیت کے جس پہلو کا نقش سب سے گہرا مرتسم ہوا ان کے مربی اور معلم ہونے کا تھا۔ مجھے ان کے پاس دار العروبہ میں تین یا چار مرتبہ کچھ روز کے لئے رہنے کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ ان کے یہاں کا ماحول ایک تربیت گاہ کا ماحول تھا جس میں وقت، ایک آزاد اور محدود چیز نہیں بلکہ ایک ناپی اور تولی جانے والی چیز تھی جس میں رہنے والے ایک فوجی کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ صبح کی نماز، مطالعہ قرآن و حدیث، ناشتہ، تعلیم و تصنیف کا کام، دوپہر کا کھانا، سہ پہر کی چائے، شام کی ہوا خوری، اور مغرب اور عشاء کے درمیان تلامذہ کے کام کی اصلاح و تصحیح ——— ان سب کا معمول کے مطابق اوقات مقرر تھے اور بغیر کسی دباؤ اور گھٹن کے احساس کے انسان ہر کام اپنے وقت پر کرتا چلا جاتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دار العروبہ میں مستقل رہنے والے لوگ اس پابند اور منظم زندگی کو کیا محسوس کرتے ہوں گے لیکن میرے لئے چونکہ ایک آزاد اور بے راہ رو زندگی سے نکل کر نظم و ضبط کی زندگی میں آنے کا چند روزہ تجربہ ہوتا تھا اس لئے بہت خوش گوار محسوس ہوتا تھا۔ مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت شاگردوں کے کام کا جائزہ لینے کے لئے مقرر تھا اور میرے کام کی اصلاح بھی استاذ اکثر اسی وقت کیا کرتے تھے۔ اس نشست کا عام نقشہ کچھ اس طرح ہوتا کہ استاذ اپنے نرم اور گدے دار بستر میں دُبکے بیٹھے ہیں۔ سامنے ایک بڑی تپائی رکھی ہے اور اس پر ایک ٹیبل لیمپ روشن ہے۔ میں ان کے بائیں جانب کرسی پر بیٹھا ہوں اور دائیں جانب محمد عاصم الحداد عربی لغت کی کتابوں (القاموس المحیط، مختار الصحاح، المصباح المنیر، اساس البلاغۃ وغیرہم) کا انبار لگائے بیٹھے ہیں۔ اصل متن استاذ کے ہاتھ میں ہے اور عربی ترجمہ میرے ہاتھ میں۔ میں عربی عبارت پڑھتا جاتا ہوں اور وہ اردو اصل سے اس کا موازنہ کرتے اور جگہ جگہ اصلاح دیتے جاتے ہیں۔ جہاں عبارت میں کوئی ایسا لفظ یا ترکیب نظر آئی جس کے بارے میں انہیں خود بھی شک ہوا تو انہوں نے عاصم صاحب کو اشارہ کیا اور وہ لغت کی ورق گردانی کرنے لگے۔ جب تک اس لفظ کی پوری طرح تحقیق نہ ہو گئی استاذ نے آگے ایک قدم نہ بڑھنے دیا۔ چلتے چلتے کبھی کبھار ایک آدھ جملہ عبارت میں ایسا بھی آ جاتا جس میں ظاہراً کوئی لفظ غلط یا ناموزوں نہ ہوتا۔ استاذ اس کی درستی بھی نہ کراتے لیکن آگے بھی نہ بڑھنے دیتے۔ بلکہ مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کرکے آنکھیں نیم وا کرکے منہ میں کچھ گنگنانے لگتے۔ میں یا عاصم کچھ بولنا چاہتے تو وہ ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کو کہتے۔ کچھ دیر گنگنانے کے بعد خاموشی کے ساتھ میرے ہاتھ سے قلم اور مسودہ لے لیتے، جملے میں ایک لفظ ادھر بڑھا دیتے، ایک آدھ گھٹا دیتے، ایک دو مرتبہ اوقاف بدل کرتے اور عبارت کو ایک آدھ بار پڑھ کر مسرت آمیز اطمینان کے ساتھ میری طرف بڑھا دیتے اور کہتے "یمشی" یعنی اب عبارت رواں ہو گئی ہے۔ ایسے مقامات کے متعلق

ہوں نے مجھے بتایا تھا کہ "بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک فقرے میں بظاہر کوئی خامی نہیں ہوتی ہے الفاظ بھی صحیح ہوتے ہیں، مطلب کی ادائیگی بھی ہو ہی جاتی ہے لیکن فقرے کا دروبست ٹھیک نہیں ہوتا۔ عبارت اکھڑی اکھڑی سی لگتی ہے۔ ایسے مقامات کی اصلاح صرف کچھ لفظوں کو آگے پیچھے کرنے گھٹانے بڑھانے سے ہو جاتی ہے، لیکن اس کے لئے ایک ہنر چاہئے!

شاگردوں کی تربیت کے بارے میں مختلف اساتذہ کے مختلف طریقے دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک شاگرد اور نوآموز کے کسی کام کی تعریف نہ کی جائے، بلکہ ہمیشہ اسے ایک سخت اور کڑی تنقید کا نشانہ بنایا جائے۔ تاکہ وہ برابر خوب سے خوب تر کی کوشش میں لگا رہے اور یہ زعم کبھی اس کے دل میں پیدا نہ ہو کہ وہ کمال کے کسی مرتبے کو پہونچ گیا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نوآموز کے اچھے کام کی دل کھول کر تعریف کی جائے۔ یہاں تک کہ اس تعریف میں اگر کچھ مبالغہ بھی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ تاکہ اس کا حوصلہ بلند ہو اور علم و فن کی اونچی اڑانوں پر پرواز کرنے کی سکت اس کے بازوؤں میں پیدا ہو۔ ان دونوں طریقوں کے اپنے اپنے فوائد بھی ہیں اور نقصان بھی۔ استاذ مسعود کا طریقۂ تربیت اسی دوسری قسم کا تھا۔ وہ اپنے تلامذہ کے اچھے کاموں کی تعریف کرتے تھے اور مبالغہ کی حد تک کرتے تھے۔ لیکن اُن کی اس پہلی تعریف سے خود پسندی کا جو نشہ کچھ دیر کے لئے ناپختہ ذہنوں پر چڑھ جاتا تھا وہ اسے اتارنے کا فن بھی جانتے تھے، وہ یوں کہ بعد میں جب اسی کام کے تفصیلی جائزہ اور اصلاح و تہذیب کا موقع آتا تو پھر اس میں کبھی مسامحت نہ برتتے بلکہ اس کا کھرا کھوٹا الگ الگ کر کے رکھ دیتے ——— اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ کس طرح پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے میرے منہ پر مجھے "عربی کا معجزہ" اور میری تحریر کو "سہل ممتنع" اور خدا جانے کیا کیا قرار دیا تھا۔ ان کی اس تحسین کا فائدہ بھی یقیناً ہوا، لیکن مجھے یہ اعتراف بھی کر لینا چاہئے کہ ان کی اس پرجوش تعریف سے میرے دل میں اپنے متعلق بہت کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ اور کچھ عرصہ تک میری "انا" بغیر کسی وجہ کے پھولی رہی۔ پھر جب دوسری مرتبہ میں اُن سے ملنے کے لئے جالندھر گیا تو اپنے ساتھ عربی میں ایک چھوٹا سا مضمون بھی لکھ کر ساتھ لیتا گیا، جو کچھ طبعزاد تھا اور کچھ ترجمہ۔ استاذ کو جب یہ مضمون پڑھ کر سنایا تو توقع کے بالکل برعکس ان کا ردعمل بالکل سرد اور روکھا تھا۔ مضمون کی تصحیح تو انہوں نے کر دی تھی، لیکن ان کی خاموشی بہت گہری اور پُراسرار تھی۔ صاف صرف ایک چیز مجھے بار بار کہتے رہے کہ "آپ کی نحو بہت کمزور ہے، اچھا ہو کہ آپ اس مرحلہ پر نحو کی کوئی کتاب پڑھ ڈالیں" ان کی اس صاف گوئی نے سارا نشہ اتار دیا اور میں اپنی خیالی اڑانوں سے اتر کر حقائق کی دنیا میں واپس آ گیا۔

تعریف و تحسین کی یہ عادت ان کی آخر تک باقی رہی۔ ایک دفعہ مصر کے ہفتہ وار ادبی رسالے "الرسالۃ" میں پاکستان پر ایک مضمون شائع ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر بہت کوفت ہوئی کہ مضمون نگار نے لفظ "پاکستان" کو عربی میں کہیں "الباکستان" لکھا تھا اور کہیں "باکستان"۔ ایک ہی مضمون میں اس تلون کے معنی یہ تھے کہ انہوں نے یہ تحقیق کرنا ضروری ہی نہیں سمجھا تھا کہ قواعد کی رو سے کون سی صورت صحیح ہو سکتی ہے۔ اس پر میں نے "الرسالۃ" کو ایک مفصل خط شائع کرنے کے لئے بھیجا اور اس میں قواعد کا حوالہ دیتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ عربی میں "باکستان" بغیر "ال" کے لکھنا ہی صحیح ہے اور اسی کا التزام ہونا چاہئے۔ استاذ مسعود نے جب "الرسالۃ" میں میرا یہ خط دیکھا تو بے حد خوش ہوئے اور اسی دن اپنے قلم سے تعریف لکھ کر بھیجی: "بما اذكرك بمزيد من الاعجاب والتقدير ان كلماتكم هذه في الرسالة قد استبشرت بها كثيرا وزوقت من دونه مثل تلك المقالات — ان جديرة في كتابتها — نفعا كثيرا وفائدة جزيلة لكم ولنا ان شاء الله، مسعود"۔ ان کی اس داد کو پڑھ کر میں نے اپنے اندر جو سرور (EXALTATION) اور جو کیف و وجد محسوس کیا اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود اس تجربہ سے کبھی گذرے ہوں!

اس مدح و تحسین کا نقطۂ عروج ان کی وہ داد تھی جو انہوں نے جیل سے واپس آ کر الجزائر کے ہفت روزہ "البصائر" میں میرا ایک طویل مضمون پڑھنے کے بعد دی تھی۔ یہ مضمون میں نے ان کی عدم موجودگی میں رسالہ کے ایڈیٹر اور عربی زبان کے بہت بڑے ادیب و خطیب علامہ

محمد البشیر الابراہیمی کے ایک مضمون کے جواب میں، کچھ غلط فہمیوں کے ازالہ کی خاطر، لکھا تھا جو "البصائر" کے چار شماروں میں آیا تھا۔ جب استاذ نے یہ مضمون پڑھا تو ایک خط کے آخر میں اپنے قلم سے یہ سطریں لکھ کے بھیجیں:

"البصائر میں پورا مضمون نظر سے گذرا۔ جی چاہا کہ آپ کو ایک سطر میں جلد لکھ کر بھیج دوں:

(۲) یا لیتنی لو تیسّرت لی کتابۃ بضعۃ اسطر مثل ھذہ، پھر مرض کا ضعف غالب آگیا۔

انشاءاللہ بہاولپور قاسم باغ ہی میں آپ سے ملوں گا، کب؟ جب قوت آجائے اور طبیب اجازت دے، پروگرام ستمبر سے طے ہے"

اس تکملے میں ان کا عربی جملہ پڑھ کر ایک دفعہ تو میرا سر گھوم گیا۔ شاگردوں کو اس طرح بھی کبھی داد دی جاتی ہے، میں نے سوچا، وہ آخر انسان ہی فرشتے تو نہیں ہیں۔ ادھر شیطان نے دبے پاؤں دل میں آکر وسوسہ ڈالنا شروع کیا کہ بیٹا! کس مقام کو پہونچ گئے ہو جبھی انہوں نے یہ بات لکھی ہے ورنہ کیوں لکھتے!

اس واقعہ کے آٹھ نو سال بعد، جب کہ استاذ ہم سے جدا ہو کر دوسری دنیا میں پہونچ چکے تھے۔ ایک دن "مکاتیب مہدی" پڑھ رہا تھا کہ ایک جگہ بالکل یہی جملہ اردو میں علامہ شبلی کے قلم سے مہدی افادی کے بارے میں دیکھنے میں آیا۔ مجھے یہ دیکھتے ہی یقین ہوا کہ استاذ مسعود کو جس طرح بعض دوسری چیزیں علامہ شبلی سے ماثوراً پہونچی تھیں، تعریف کا یہ انداز بھی شبلی ہی سے ان کو، بواسطہ سید سلیمان ندوی، ماثوراً پہونچا تھا، جسے انہوں نے برقرار اور زندہ رکھا۔ ایک بار مجھے خط میں لکھا:

(۱) میں انتہائی پسندیدگی اور خوشی کے ساتھ اس بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ الرسالۃ میں آپ کا یہ خط پڑھ کر میں بہت ہی مسرور ہوا۔ مجھے امید ہے کہ اس طرح کے مضامین سے — اگر آپ انہیں لکھتے رہے۔ آپ کو بھی، اور ہمیں بھی، انشاءاللہ بہت فائدہ پہنچے گا، مسعود۔

(۲) کاش میں بھی ایسی چند سطریں لکھ سکتا۔

مجھے افسوس ہے کہ استاذ مسعود کے طریق تربیت کی وضاحت کرتے ہوئے میری اپنی ذات کی بھی بالواسطہ کافی نمائش ہو گئی ہے جو بالکل مقصود نہیں تھی، ورنہ ان دنوں میں اپنی عربی دانی کے متعلق برا یا بھلا، کسی قسم کا احساس اپنے اندر پاتا ہوں۔ وہ جوش اور ولولے ختم ہو گئے۔ اب تو ایک عرصہ سے عربی میں کتابوں اور رسالوں کا پڑھنا بھی موقوف ہے اور یہ زبان کسی وقت یوں لگتی ہے جیسے اس سے کبھی شناسائی نہیں تھی ——————

کہنا صرف یہ مقصود تھا کہ استاذ مسعود الندوی کا یہ طریق ترتیب اور یہ انداز مدح و ستائش اگرچہ خطرات اور مضرتوں سے خالی نہیں تھا، تاہم اس کی تاثیر بھی جادو کی سی تھی۔ استاذ کی شاباش سے ایک برقی رو ہمارے اندر دوڑ جاتی اور ہمیں اپنے اندر کچھ مافوق البشری قوتوں کا احساس ہونے لگتا تھا۔ یہ ان کے اسی اسلوب تربیت کا اثر تھا کہ ان کے بعد جب ان کے شاگردوں کو نیا وہ اہم اور بوجھل ذمہ داریوں کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو کبھی ہیٹا اور کمتر محسوس نہ کیا اور جو مہم بھی سامنے آئی اسے پوری آمادگی اور اعتماد کے ساتھ سر کیا۔

استاذ کی یہ تعریف اور مدح سرائی کسی ایک شخص یا چند اشخاص تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ اپنی تعریف یوں لٹاتے تھے جس طرح ایک سخی اپنی دولت لٹاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی طبیعت میں ایک سچا انکسار اور ایک بے ریا قسم کی کسر نفسی تھی وہ اپنی تحریروں کے آخر میں ہمیشہ "عاجز" لکھا کرتے تھے اور اس لفظ کے پیچھے اتنا خلوص، اتنی دیانت ہوتی تھی کہ اس میں کبھی تصنّع کی بو نہیں آتی تھی اس کے مقابلہ میں ہم نے کتنے ہی فاضلوں نے دیکھا کہ اپنی طرف سے بہت کچھ کسر نفسی اور تواضع کا اظہار کرنا چاہتے ہیں لیکن بناوٹ کا چہرہ ان کے پر تکلف الفاظ کے پیچھے سے صاف جھانکتا ہوا دکھائی پڑتا ہے استاذ اپنے تئیں واقعی کمتر اور فرد سمجھتے تھے اور علم کے کسی شعبہ میں بھی انہیں اپنے منتہی اور کامل ہونے کا احساس نہیں تھا۔ ان کی عربی انشاء پردازی کا خود اہل عرب نے لوہا مانا تھا لیکن اپنے اس خاص ہنر میں بھی وہ اپنے احباب اور ہمچشموں کی تنقید کو بڑی وقعت دیتے تھے۔ ان کی وفات سے تھوڑا ہی پہلے جب ان

، عربی کتاب " لمحات اجمالية على تاريخ الدعوة الاسلامية ... " شائع ہوئی تو بہاولپور میں ان کے قریبی دوست اور ہم مکتب مولانا محمد ناظم ندوی نے اس کی ایک دو عبارتوں کے بارے میں سرسری طور پر یہ رائے دی کہ یہ قدیم اور فصیح استعمال کے مطابق نہیں ہیں، میں نے اس کا تذکرہ ایک خط میں استاذ مسعود سے کر دیا۔ جواب میں انہوں نے لکھا :

" لمحات اجمالية کی جس عبارت کو آپ نے نقل کیا ہے، اس کا حوالہ دیں تاکہ میں دیکھ سکوں۔ مولانا ناظم صاحب کی عربیت اچھی ہے، اور میری کمزوری ساری دنیا بھی جانتی ہے، اور میں بھی اور ہم دونوں کے تمام احباب! اور بھی جہاں انہیں خامیاں محسوس ہوں، ان سے پوچھ کر صفحہ اور سطر کے حوالہ سے مطلع کریں۔ دوسرے ایڈیشن میں اصلاح ہو جائے گی "

یہ خط ناظم صاحب کے نام نہیں، میرے نام تھا اور استاذ کی دیانت، سچائی اور خلوص نے اس میں کوئی عار نہ سمجھا تھا کہ وہ اپنے ایک شاگرد کے سامنے ایک دوسرے شخص کی برتری اور کمتری کا یوں کھلے دل سے اعتراف کر لیں۔

استاذ مسعود کی یاد آج گیارہ سال گذرنے پر بھی اسی طرح دل کو گرما رہی ہے اور ان کا تصور کرنے پر یوں لگتا ہے جیسے وہ ابھی ہمارے درمیان سے اٹھ کر گئے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدرت نے ان کو ایک ایسا دل عطا کیا تھا جس میں حرارت تھی، سوز تھا، ہمدردی تھی، محبت اور انسیت تھی۔ وہ اپنے قریب آنے والوں کے لئے صرف ایک استاذ اور معلم ہی نہ ہوتے تھے بلکہ ایک شفیق بزرگ، بڑے بھائی اور غمخوار رہتے ——— وہ اپنے زیر تربیت نوجوانوں کے ذاتی اور خانگی معاملات کا بھی اتنا ہی خیال رکھا کرتے تھے جتنا ان کی علمی اور تعلیمی ضروریات کا۔ ایک دفعہ ابتدائی زمانے میں میں ان کے یہاں کچھ دن کے لئے ٹھہرا ہوا تھا تو ایک روز میرے سامنے اپنے رفیق محمد عاصم کے کسی خانگی معاملے کا ذکر اتنی سرگرمی اور سنجیدگی کے ساتھ کرتے رہے جیسے یہ دار العروبہ کے تمام مسائل میں سے کوئی مسئلہ تھا۔ اپنے قریب رہنے والی " انسانیت " کے ساتھ یہ ہمدردی، یہ حرارت آمیز تعلق اور ان کے حالات میں یہ دلچسپی اور فکرمندی ——— یہی ان کی شخصیت کی مقناطیسیت کا راز تھا اور یہ وہ خصوصیت تھی جس کی دوسرے لوگوں میں ایک واضح کمی دکھائی دیتی تھی۔ وہ اگرچہ عام قیادت کے کسی منصب پر فائز نہیں تھے، لیکن جہاں بھی جاتے اپنے گرد شائقین علم و ادب کا ایک مجمع اکٹھا کر لیتے۔ ان کی مجلس میں ایک خاص بات یہ نظر آتی تھی کہ اس میں گفتگو زیادہ تر علم و ادب کے موضوعات پر ہوتی تھی۔ دوسروں پر ٹھٹھا یا مذاق نہیں ہوتا تھا، دوسروں کی عیب جوئی اور نکتہ چینی نہیں کی جاتی تھی ——— دوسرے لفظوں میں اس میں ہلکی باتیں بالکل نہیں ہوتی تھیں۔

میں جب ان کے ساتھ اپنے تعلق کی کیفیت کا تصور کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے ان کی ساری شفقت، سارا مہر و کرم صرف میرے ہی لئے تھا۔ میں جب دار العروبہ کچھ دن ٹھہرنے کے لئے جاتا، اور پہلے دن سامان وغیرہ رکھ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو وہ بڑے انہماک سے میرے ذاتی حالات سنتے رہتے اور جب باتوں کی یہ پہلی نشست ختم ہوتی تو کہتے : اب میں ذرا فلاں کام کرتا ہوں آپ میری الماری کھول کر میری کتابوں کا جائزہ لیجئے۔ ایک دفعہ میں حالات کا رخ ٹھیک نہ دیکھتے ہوئے انہوں نے مجھے باہر سے خاص طور پر بلوایا اور اپنے مسودات اور خطوط کا ایک چھوٹا سا بکس میرے حوالے کیا۔ " میری زندگی کا سرمایہ ہے " وہ مجھے اپنی یہ امانت سپرد کرتے ہوئے کہہ رہے تھے " اس میں میرے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین اور کتابوں کے مسودے ہیں ذاتی خطوط ہیں، ڈائریاں ہیں، یہ لے جائیے اور اس میں سے جو آپ کا جی چاہے پڑھتے رہئے، بس اتنا خیال رکھیئے کہ اس میں سے کوئی چیز ضائع نہ ہو ——— ان کا یہ بکس ایک عجائب خانہ تھا جس میں علاوہ دوسری بہت سی چیزوں کے امیر شکیب ارسلان، علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، مولانا مولانا عبد الماجد دریا بادی جیسے مشاہیر کے خطوط محفوظ تھے میں جب بھی یہ بکس کھول کر اس عجائب خانے کی سیر کے لئے بیٹھتا تو وقت کا احساس جاتا

اور گھنٹوں اس شغل میں گذر جاتے۔ یہ کیفیت ڈیڑھ سال یا اس سے بھی زیادہ مدت میری تحویل میں رہا۔ اور اس کے مشوروں سے جتنا میں نے فائدہ اٹھایا اتنا کسی اور شخص نے کاہے کو اٹھایا ہوگا!

ہمارے بڑوں میں کچھ لوگ ایسے ملیں گے کہ ان کی صحبت میں اگر آپ کو بیٹھنے کا اتفاق ہو تو آپ کو یوں محسوس ہوگا۔ جیسے ان کی عقل اپنی پوری ٹھنڈک اور بے حسی کے ساتھ آپ کی عقل سے مخاطب ہے اور ان کے اور آپ کے درمیان غیریت کی ایک غیر مرئی دیوار حائل ہے جس کے سبب سے ان کی آواز ایک فاصلے سے سنائی دیتی ہے، جیسے وہ ایک فرد کے ساتھ باتیں نہ کر رہے ہوں بلکہ اسٹیج سے بول رہے ہوں۔ استاذ مسعود کی صحبت میں بیٹھنے سے یوں لگتا تھا جیسے ان کا دل آپ کے دل سے مخاطب ہے، جیسے وہ اور آپ ایک ہی سطح اور مرتبہ کے انسان ہیں۔ جیسے آپ کی خوشی اور آپ کا غم ان کا غم ہے ـــــ ایسے ہی انسانیت بھرے لوگوں کے دم سے، اگر دیکھا جائے تو اس دنیا میں یہ سارا حسن، گرمی اور تازگی ہوتی ہے اور یہ زندگی رہنے کے قابل لگتی ہے اور جب ایسے لوگ اس دنیا کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں تو ان کی یاد کی دھنک ایک لمبے عرصے تک دلوں میں رواں رہتی ہے۔

استاذ مسعود الندوی کی موت یوں تو کسی وقت بھی ہوئی ایک عظیم سانحہ ہی سمجھی جاتی، لیکن وہ حالات جو ان کے بعد کے سالوں میں پیش آئے اور جن کا تسلسل ابھی تک ٹوٹا نہیں ہے ان کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ سن ۵۴ء میں اُن کا منظر (scene) سے یوں اچانک ہٹ جانا ایک بہت ہی بڑے خسارے اور نقصان کی بات تھی۔ ہم یہ کہنے کی پوزیشن میں تو نہیں ہیں کہ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو کیا ہوتا، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہ اگر آج موجود ہوتے تو جن کی تنظیم کا کچھ اور ہی نقشہ ہوتا۔

انگریزی میں مشہور ادیب آر۔ ایل۔ اسٹیونسن کا ایک بہت عمدہ خاکہ ایڈمنڈ گوس نے لکھا تھا، اس کے آغاز میں وہ کہتا ہے:

'AND NOW PEN IN HAND I PAUSE TO THINK HOW I CAN RENDER IN WORDS A FAINT IMPRESSION OF THE MOST INSPIRITING THE MOST FASCINATING HUMAN BEING THAT I HAVE KNOWN' (1)

اسی طرح کی بات اب میں اپنے اس مضمون کا اختتام کرتے ہوئے، منہ میں قلم دبائے سوچ رہا ہوں کہ الاستاذ مسعود الندوی کی ذات کے متعلق میں کتنا کچھ لکھنا چاہتا تھا اور کتنا تھوڑا لکھ پایا ہوں اور کیا میں اس شخص کے بارے میں اپنے تاثرات کا دسواں حصہ بھی بیان کر سکا ہوں، جس نے اپنے علم، اپنے تجربے، اپنی محنت اور خیر اندیشی میں سے اتنا کچھ میرے دامن میں ڈال دیا تھا؟!

---

(۱) اور اب قلم ہاتھ میں لئے میں سوچ رہا ہوں کہ میں کس طرح اُس شخص کا ایک کمزور سا مرقع اپنے الفاظ میں کھینچ سکتا ہوں، جس کی شخصیت میرے لئے سب سے زیادہ روح پرور اور سحر انگیز تھی!

—— محمد نواز (ایم-اے)

اقامتِ دین کا تصور

جماعت اسلامی جس مقصد کو لے کر اٹھی ہے اسے اس نے اپنے "دستور" میں جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ یہ ہیں:

"جماعت اسلامی پاکستان کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جدوجہد کا مقصود عملاً اقامتِ دین (حکومتِ الٰہیہ یا اسلامی نظامِ زندگی کا قیام) حقیقتہً رضائے الٰہی اور فلاحِ آخروی کا حصول ہوگا" دفعہ ۴

یہ نصب العین اول روز سے لے کر آج تک اس کی ساری کوششوں کا محور ہے، اس کے علاوہ کوئی نصب العین نہ پہلے کبھی تھا نہ اب ہے اور نہ ان شاء اللہ آئندہ کبھی ہوگا۔ جماعت اسلامی نے اس بات کا بار بار اعلان کیا ہے کہ:

"ہم اپنے خالق، مالک، اس کے فرشتوں، اس کی پوری کائنات، اور ساری نوعِ بشری کو گواہ بنا کر کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے قیام کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ ہمارا پروردگار ہم سے راضی ہو اور قیامت کے روز جب ہم اس کی بارگاہ میں پیش کئے جائیں تو وہ مالکُ الملک اور مالکِ یوم الدین ہمیں اپنا اطاعت گزار سمجھ کر ہم سے انتہائی نرمی اور شفقت کا برتاؤ کرے۔ یہ ہماری دعوت بھی ہے —— اور ہماری آرزو بھی، ہم اسی ایک مقصد کے حصول کے لئے جمع ہوئے ہیں اور اسی کے لئے اپنی بساط کے مطابق جدوجہد کر رہے ہیں، ہمیں اس امر کا بھی پوری طرح اعتراف ہے کہ یہ عظیم اور بلند مقصد جس قسم کے اخلاص، جس نوعیت کے ایثار اور جس طرح کی مضبوط سیرت اور کردار کا متقاضی ہے، ہم اس کے تقاضوں کو کسی اعتبار سے بھی پورا نہیں کرتے ہماری ہمتیں پست، ہمارے ارادے متزلزل، ہمارے ایمان ناقص ہیں، ہمیں یہ سب کچھ تسلیم ہے، لیکن اپنی ان سب کوتاہیوں کے اعتراف اور ان پر اظہارِ ندامت کے باوجود یہ بات کسی جذبۂ فخر سے نہیں بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر کہتے ہیں کہ ہم رب العالمین کے دین کو اس دنیا میں غالب کرنے کا عزمِ صمیم رکھتے ہیں" (ترجمان القرآن ستمبر ۶۴ء)

جماعت نے اپنے نصب العین کی وضاحت جدوجہد کے ہر مرحلے میں کی ہے، لیکن اس کے باوجود اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کا یہ نصب العین دین کی ایک غلط تعبیر ہے، اس سے دین کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا ہے کہا جاتا ہے کہ:

"دین کی یہ تصویر اپنی جامعیت کے باوجود اس کی حقیقی تصویر نہیں، دین کی اس تصویر میں ایک زمینی نتیجہ کا پانا دین کا مقصدِ اصلی قرار پاتا ہے، جب کہ شخصی ذمہ داری کی حیثیت سے ایک ذاتی نتیجہ کو پانا دین کا اصل مقصود ہے" (تعبیر کی غلطی ص ۲۷۷)

یہ بات جماعت سے تعلق رفاقت منقطع کرنے والے وہ قابلِ احترام بندگانِ دین فرما رہے ہیں جو اس نصب العین کو اپنی زندگی کا مشن بنانے کا خدا اور خلق کے سامنے حلفاً اقرار کر چکے ہیں، ایک دفعہ نہیں بلکہ بار بار، خلوت ہی میں نہیں بلکہ جلوت میں سینکڑوں ہزاروں بندگانِ خدا سے صرف

تقریروں ہی میں نہیں بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے بھی یہ اعلان کیا ہے کہ :

"ہماری تمنا اور کوشش یہ ہے کہ اس ملک کی زندگی کے ہر گوشہ پر اللہ کا رنگ چڑھ جائے، کوئی کونا اور کوئی گوشہ بھی صبغۃ اللہ سے محروم نہ رہے، جب تک ایک نقطہ کے برابر بھی کسی گوشہ میں ایسی جگہ باقی رہے گی، جس پر اسلام کا چھاپہ نہ ہوگا، اس وقت تک ہم سمجھیں گے کہ ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا اور ہم برابر اپنی کوشش جاری رکھیں گے تا آنکہ اللہ تعالیٰ ہماری زندگی کے ہر گوشہ پر اپنے دین کو قائم فرما دے"

(مولانا امین احسن اصلاحی ۔ ترجمان القرآن)

آج جماعت کے نصب العین پر جو اعتراضات کئے جا رہے ہیں، اسی قسم کے اعتراضات ایک عرصہ پہلے بھی کئے گئے تھے، اسی وقت خود انہوں نے اعتراضات کے جوابات دئے تھے، مثلاً ایک موقع پر مولانا امین احسن اصلاحی نے فرمایا تھا :-

"حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا ہے کہ ہم ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی حکومت کی طرح حکومت قائم کر دیں نہ ہم دونوں کو اس بات کی طاقت حاصل ہے نہ خدا نے اس کی تکلیف دی ہے، البتہ یہ مطالبہ ہم سے کیا گیا ہے کہ ہم اقامت دین کے جہد کریں اور اس جدوجہد میں اپنا تمام سرمایۂ زندگی لگا دیں۔ جان بھی اور مال بھی اور اپنی تمام مرغوبات اور محبوبات بھی اور دین سے مراد دین میں سے کوئی جز مراد نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، بلکہ دین بحیثیت مجموعی مراد ہے اس کے کلیات بھی اور جزئیات بھی، عقائد بھی اور اعمال بھی، یہ جدوجہد پورے عشق اور پورے جوش کے ساتھ مطلوب ہے اور اللہ کے نزدیک یہی چیز ہمارے ایمان اور نفاق کی کسوٹی ہے، کوئی سینہ جو ولولہ سے خالی ہو، ایمان کا مسکن نہیں بن سکتا اور کوئی دل جو اس درد سے نا آشنا ہو خدا کا گھر نہیں ہو سکتا، کتنی ہی تسبیحیں گردانی جائیں یا وظیفے پڑھے جائیں اور کتنی ہی عمریں لگائی جائیں اس عشق کے بدل نہیں ہو سکتے، ساری دینداری کی روح یہی ہے اور خدا کے ہاں ہمارے دلوں کے اندر سب سے پہلے یہی چیز ڈھونڈی جائے گی اور یہ بھی ایک ضروری شرط ہے کہ یہ جدوجہد جماعتی شکل میں ہو انفرادی شکل میں نہ ہو، ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ پہلے اپنے اندر اس کی گرمی پیدا کرے اور پھر یہ کوشش کرے کہ اس آگ سے سارے دل بھڑک اٹھیں، یہ سوال بحث سے خارج ہے کہ جدوجہد کس نتیجہ تک منتہی ہوگی، ہو سکتا ہے کہ ہم آروں سے چیر ڈالے جائیں، گلیوں میں گھسیٹے جائیں، انگاروں پر لٹائے جائیں، ہمارے جسم چیل اور کوے نوچیں اور ان ساری باتوں کے بعد بھی ہمیں یہ سعادت حاصل نہ ہو سکے کہ ہم موجودہ نظام باطل کو ایک نظام حق سے بدل دیں، نہ تو یہ ناکامی ناکامی ہے اور نہ اس کا اندیشہ۔ بلکہ اس کا یقین بھی ہم کو اس مطالبہ سے سبکدوش کر سکتا ہے جو خدا نے اقامت دین کے لئے ہم سے کیا وہ تو ایک قطعی اور اٹل فرض ہے جو ہر قیمت پر ہر حال میں ہمیں ادا کرنا ہے۔ اگر ہندوستان کی تمام خانقاہیں بھی آپ کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کریں کہ فلاں فلاں اوراد اس ذمہ داری سے سبکدوش کر سکتے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ شیطان کا دھوکا ہے، جب تک آپ کی گردنیں پر ہیں اور اللہ کے دین کی عمارت کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہے اور خدا کی زمین کا ایک ٹکڑا بھی غیر اللہ کی اطاعت کے نیچے دبا ہوا ہے اس وقت تک آپ کے لئے چین کی نیند حرام ہے"　　(روداد حصہ سوم ص ۱۲۲)

اس نصب العین کے حصول کی جدوجہد کو جن لوگوں نے "زمینی نتیجہ" حاصل کرنے کی جدوجہد قرار دیا تھا انہیں مولانا اصلاحی نے جن الفاظ میں جواب دیا تھا وہ یہ ہیں :-

"بعض لوگ طنز سے کہتے ہیں کہ ہماری جدوجہد حکومت کے لئے ہے اور خدا کی رضا کی طلب، جو خلاصہ دین ہے، ہمارے سامنے نہیں ہے یہ خیال بالکل غلط ہے، ہماری ساری جدوجہد اللہ کے دین کے قیام اور ایک صالح اور خدائی نظام کی اقامت کے لئے ہے اور یہ جدوجہد کرنا

، ہے، جس پر ہمیں خرمانے کی فرصت ہو اور ہم جب کبھی حکومت الٰہیہ کا نام لیتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہی نظام ہوتا ہے اور میں نہیں سمجھتا
ں کے مطلوب اور محبوب ہونے میں کس پہلو سے بحث کی جا سکتی ہے اور آخر یہ خدا کی رضا طلبی سے الگ چیز کیوں ہے؟ خدا کی رضا اس سے بڑھ کر
بات میں ہو سکتی ہے کہ اس کی زمین پر اس کے احکام چلیں اور ان لوگوں سے بڑھ کر رضائے الٰہی کا طالب کون ہو سکتا ہے جو اس بات کے لئے سر دھڑ
بازی لگائیں کہ خواہ کچھ ہو کیوں نہ ہو خدا کی زمین پر غیر اللہ کے اقتدار کا کوئی معبد نہ رہنے دیں گے، اگر یہ جدوجہد دنیا داری ہے تو کیا دینداری
ہے کہ راتوں کو جاگ کر اللہ ھُو کی ضربیں لگائی جائیں اور دن میں خدا کی زمین پر شیطان کا تخت بچھانے کی کوشش کی جائے"

(روداد حصہ سوم ص ۱۲۳)

اس اعلان اور اظہار کے باوجود یہ بات کہیں اشاروں اور کنایوں کے رنگ میں، کہیں سرگوشیوں کے انداز میں اور کہیں کھل کر برملا کہی جا رہی
ہ کہ اقامت دین کے اس تصور کا کتاب و سنت میں کہیں ذکر نہیں، جماعت کے لٹریچر میں اس کی ایک ایسی تعبیر کی گئی ہے، جس سے پورے دین کا حلیہ
بگڑ گیا ہے، ان حضرات کے نزدیک اقامت دین کا حقیقی مفہوم دین پر "قائم رہنا" ہے نہ کہ اسے "قائم کرنے" کی عملی جد و جہد کرنا، دین کو قائم
نے کی دعوت دینا ایک تکلیف مالا یطاق ہے۔ اس پر اصرار کرنا، اس کے لئے عملی اقدام کی دعوت دینا، دین کی ایک ایسی تعبیر ہے، جسے یہ حضرات نہ قر
رآن و سنت میں پا سکے ہیں اور نہ ہی سلف صالحین کے عمل میں۔

قطع نظر اس بات کے کہ دین پر "قائم رہنے" کے مفہوم میں اشارۃً، اقتضاءً یا دلالۃً دین کو قائم کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے یا نہیں
نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام، اور سلف صالحین کے طرز عمل سے اقامت دین کے مفہوم پر کیا روشنی پڑتی ہے؟ آپ اس پہلو پر غور کریں کہ آخر دین
پر قائم رہنے" کے مفہوم پر اصرار یا اس کے "قائم کرنے" کے مفہوم کی نفی کرنے کا حقیقی مطلب کیا ہے؟ اقامت دین کی اصطلاح کے ان دونوں ترجموں میں
وہ کیا معنوی فرق ہے جس کے واضح نہ ہونے کی وجہ سے، ان حضرات کے نزدیک، سارے دین کی تعبیر ہی غلط ہو گئی ہے؟

"دین پر قائم رہنے" کے جس نظریہ کی تبلیغ کی جا رہی ہے اس سے پہلی بات جو واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دین کے حق میں حالات خواہ کتنے
ہی ناسازگار کیوں نہ ہوں امت مسلمہ خواہ طاغوت کے پنجہ میں ہو یا بدعات کے بھنور میں، ایک فرد کی صرف اتنی ذمہ داری ہے کہ دین کے جس حصہ پہ
وہ بہ آسانی عمل کر سکتا ہے، اسی پر عمل کرتا چلا جائے، دین کے جو حصے ماحول کے آہنی شکنجہ سے بچ گئے ہیں، بس انہی پر قناعت کر لی جائے لیکن دین
کے جن اجزاء پر عمل کرنا دشوار تر بنا دیا گیا ہے اور جن پر عمل کرنے کے لئے ماحول کا جس طرح مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس کے لئے ہم مکلف نہیں۔ حالات
کے بدلنے کے لئے عملی جد و جہد ایک ضمنی اور اضافی تقاضا ہے، اس میں الجھنے سے خدا کے ساتھ تعلق مضبوط کرنے والے اہم تقاضوں کو پورا
نہیں کیا جا سکتا، اس لئے ان حضرات کا خیال ہے کہ دین کا اصل تقاضا صرف یہ ہے کہ انسان اپنا تعلق اپنے رب کے ساتھ مضبوط کرنے کے لئے "اصل
دین" ــــــ یعنی ایمانیات اور فرائض عبادت پر مضبوطی سے عمل پیرا ہو، رہے دین کے باقی اجزاء تو یہ اصل دین نہیں بلکہ فروعات ہیں، ان
فروعات پر عمل کرنے اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے منظم اجتماعی جد و جہد کرنا ایک ضمنی اور رضاکارانہ کام ہے اگر اس کی طرف توجہ کی گئی تو دین
کی "اصل" نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گی۔

اس کے برعکس دین کے "قائم کرنے" کے مفہوم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر دین مغلوب ہو چکا ہو، ملت کا شیرازہ بھی منتشر ہو چکا ہو اور
امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کا اجتماعی نظام بھی موجود نہ ہو، تو ایسے حالات میں ہر فرد ملت کا فرض ہے کہ دین کو غالب کرنے
امت کے شیرازہ کو دین ہی کی بنیاد پر منظم کرنے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک اجتماعی

ادارے کے قیام کی جدوجہد میں مصروف ہو جائے۔ اس جدوجہد میں اپنا سب کچھ لگا دے اگر اس فریضہ کی ادائیگی سے غفلت برتے گا اور احول سے جیسا کچھ بھی وہ ہے مصالحت کر کے مطمئن زندگی بسر کریگا ــــ نہ اس کی نماز نتیجہ خیز ثابت ہوگی اور نہ اوراد اور وظائف اس کے کسی کام آسکیں گے۔

دین پر "قائم رہنے" کے اس تصور سے دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ اس سے خود دین ہی کا دائرہ سکڑ کر اور سمٹ کر انسان کی انفرادی زندگی کے ایک مخصوص گوشے میں محدود ہو جاتا ہے، وہی کچھ اہم اور اہم تر ہے جو ایک فرد کی زندگی کے انفرادی پہلو سے تعلق رکھتا ہے اور یہی دین کی اصل ہے ــــ رہے زندگی کے اجتماعی پہلو، تو ان کا تعلق دین کے ساتھ بنیادی نہیں بلکہ ضمنی ہے یعنی انفرادی زندگی میں چند فرائض کی کماحقہٗ پابندی کر لیجئے کچھ نوافل اور اوراد کی مقدار میں اضافہ کر لیجئے، اپنے اٹھنے بیٹھنے، چال ڈھال اور لباس وغیرہ میں ایک مخصوص رنگ پیدا کر لیجئے، دین کا بنیادی اور اصلی تقاضا بھی پورا ہو جائے گا اور اللہ میاں بھی راضی ہو جائیں گے۔ لیکن اگر زندگی کے اجتماعی معاملات میں دین کو جاری اور نافذ کرنے کی کوشش کو زائد سمجھ کر سرانجام دیا گیا تو اس سے ایک "زمینی نتیجہ" تو ممکن ہے حاصل ہو جائے مگر اس سے خدا کی رضا حاصل نہیں ہوگی کیونکہ دین "قائم کرنے" کی نئی تعبیر نے سرے سے اس مقصد ہی کو گم کر دیا ہے۔

لیکن دین کو "قائم کرنے" کے تصور میں یہ بات شامل ہے کہ خدا کی رضا حاصل کرنے کا واحد راستہ ہی یہ ہے کہ خدا کے دین کو غالب کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کوشش میں اپنے تن، من اور دھن کی ساری متاع لٹا دی جائے، خواہ کوئی "زمینی نتیجہ" حاصل ہو یا نہ ہو لیکن خدا کی رضا کے حصول کی یہی اور بس یہی راہ ہے اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ نہیں۔ خود نماز، روزہ اور چند فرائض کی مقبولیت کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ دین کو زندگی کے معاملات پر حکمران بنانے کی جدوجہد میں حصہ لیا جائے جو دل خدا کے دین کو مغلوب دیکھ کر اس کے غلبہ کیلئے تڑپنا نہیں جانتا وہ ایمانی غیرت سے خالی ہے۔ خدا کی حدود کو پامال ہوتا دیکھ کر جس پیشانی پر شکن نہیں پڑتی تو اس کے سجدے اور ریاضت و عبادت بے روح ہیں۔

دین پر "قائم رہنے" کے اس نرالے تصور سے تیسری بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ باطل نظام کے زیر سایہ ایک پُرامن، دیانتدار، متدین اور تقویٰ اور خشیت کی علمبردار رعایا بن کر زندگی بسر کرنے سے "اصل دین" کو ہرگز کہیں خراش بھی محسوس نہیں ہوتی، خدا اور بندے کا تعلق مضبوط ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر دین کے "قائم کرنے" کی جدوجہد کو دین کا اہم تقاضا قرار دیا جائے تو پوری زندگی نظام باطل کے خلاف ایک بغاوت کا اعلان بن کر رہ جاتی ہے۔

دین پر "قائم رہنے" کی اس راہبانہ تعبیر سے جو تیسری بات جو عیاں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ماننے کے ساتھ ہی اہل دین کا کشمکش حیات کے ہر میدان سے پسپائی اختیار کر لینا اور پھر ہر پسپائی پر قناعت کر لینا اور مزید پسپائی کیلئے اپنے آپ کو پہلے ہی سے تیار رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ قوتِ مدافعت سرد پڑ جاتی ہے، آگے بڑھنے اور نئے نئے میدان مسخر کرنے کی صلاحیتیں مردہ ہو جاتی ہیں، وقت کا اقتدار اگر ان کی معاشرت بگاڑنے کے لئے عائلی قانون نافذ کرے تو وہ اسے گوارا کر لیتے ہیں، اس قانون کو بدلنے کی کوشش کرنا، اس کے خلاف اشتہار اور پوسٹر شائع کرنا، جلسوں اور جلوسوں کا اہتمام کرنا، یہ ساری کی ساری سرگرمیاں تکلیف مالایطاق کی تعریف میں آتی ہیں ان پر اصرار کرنا دین کی ایک غلط تعبیر ہوگی۔

لیکن "دین کو قائم کرنے" کی جب بھی کوشش کی جائے گی۔ اس وقت دین ایک تحریک کی شکل اختیار کرے گا۔ اس کے اندر پھیلاؤ بھی ہوگا اور قوتِ توسیع بھی، اس کے اندر دفاع کی طاقت بھی ہوگی اور اقدام کا حوصلہ بھی اس تحریک کا ہر کارکن اپنی اور اپنے ماحول کی ایک ایک برائی سے برسرپیکار ہوگا۔ گھروں، کوچہ اور بازار میں، عدالتوں اور ایوانوں میں، زندگی کے ہر مقام پر خیر و شر کی ایک کشمکش برپا ہو جائے گی۔ گویا انفرادی اور اجتماعی زندگی کا پورا میدان ایک میدان جنگ بن جائے گا، جس میں حق اور باطل، معروف اور منکر اور سنت اور بدعت باہم نبرد آزما ہوں گی۔ نیکی اور بدی کی اس کشمکش کے برپا ہو جانے کے بعد کوئی فرد ملت بھی خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتا۔ ہر شخص کو اپنی استطاعت کے مطابق، اس کشمکش میں بہر حال حصہ ادا کرنا

ایچ
رد اگر کوئی شخص اس کشمکش میں حصہ نہیں لینا یا نہیں لینا چاہتا تو وہ یہ بات اپنے ذہن میں نا رکھے کہ آخرت — میں دین کی کوئی دوسری "اصل"
فائدہ نہ پہونچا سکے گی۔

"دین پر قائم رہنے" کی اس خانقاہی تعبیر کے مان لینے کے بعد آپ اپنے آپ کو اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت اور تجدید و احیائے دین سے
ہوا محسوس کریں گے۔ آپ حضرت حسینؓ کے اقدام کی وجہ نہ سمجھ سکیں گے، آپ کے لئے حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی نا قابل فہم ہو کر رہ جائے گی۔
یہؒ کی زیر زمین تحریک انقلاب قیادت آپ کے ذہنی سانچے میں جگہ نہ پا سکے گی، حضرت ابراہیم بن میمون کی شہادت کے راز کو پانا آپ کے لئے مشکل ہو
۔ امام ابن تیمیہؒ، محمد بن عبدالوہابؒ اور سید احمد بریلویؒ جیسے مصلحین اور مجددین امت کے سارے کارنامے معترض کرو جائیں گے۔

لیکن اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ "دین کو قائم کرنا" بھی فرض ہے اور امت مسلمہ کے سارے رہنماؤں نے اسے ایک اہم فرض ہی سمجھا ہے، بزرگان دین میں سے
نے اپنے اپنے حالات کے مطابق اس فرض کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے تو آپ کو یہ محسوس کرکے اطمینان ہوگا کہ جس راہ پر آپ
ہم ہیں یہ وہی راہ ہے جس پر اللہ کے برگزیدہ انبیاء چلتے رہے ہیں یہ وہی راہ ہے جو ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لئے متعین فرمائی
ی راہ پر صحابہ کرام کے مقدس نقوش پا کی زیارت ہوتی ہے، اسی پر امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام شافعی، امام ابن تیمیہ، مجدد الف
ہ شاہ ولی اللہ اور دوسرے بے شمار جلیل القدر بزرگان دین چلتے رہے ہیں، اسی راہ میں کہیں "حرا" ہے تو کہیں "شعب ابی طالب" اور "غار ثور"
مات و آثار بھی ہیں، اگر کہیں "بدر و حنین" ہیں تو کہیں "حدیبیہ" اور "فتح مکہ" کی منزلیں بھی آجاتی ہیں، اسی راہ پر چلتے ہوئے اگر کہیں حسینؓ نظر
ی تمان کے خون سے "کربلاؤں" کے کئی میدان بھی رنگین دکھائی دیتے ہیں۔ یہ راہ اقامت دین ہی کی راہ ہے اور یہ ساری منزلیں اقامت دین
منزلیں ہیں، ان منزلوں پر حق پرستوں کے کئی قافلے گذر رہے ہیں اور نجانے کتنے اور گذریں گے۔

اقامت دین کے اس تصور کو قبول کر لینے کے بعد ایمان و یقین کی ایک حقیقی حلاوت محسوس ہوتی ہے، اس سے توحید اور آخرت کے اسرار سے پردہ
ٹھ جاتا ہے، اس سے رسالت کی حقیقی عظمت کا شعور ابھرتا ہے اور اقامت دین کے اسی تصور سے "توکل" اور "تقدیر" کے معنی سمجھ میں آتے ہیں اور اسی سے
مان" کے مقامات کا صحیح و واقعی ادراک نصیب ہوتا ہے۔

ہمارے یہ بزرگان دین جب اقامت دین کے اس نصب العین پر حملہ کرتے ہیں تو ان کا پہلا حملہ خود تصور دین پر ہوتا ہے، ان کے نزدیک دین صرف
یات اور فرائض عبادات ہی کا مجموعہ ہے، سورۃ شوریٰ کی جس آیت میں خدا کے جن جلیل القدر انبیاء علیہ السلام کو "اقیموا الدین" کا جو حکم دیا گیا ہے۔
حکم سے بھی یہ حضرات شریعت کے تفصیلی احکام کو خارج تسلیم کرتے ہیں، اس لئے دین کے بنیادی عقائد اور فرائض کے ماسوا جو کچھ بھی ہے، اس کی اقا
کلیف سے وہ امت اور افراد امت کو بری قرار دیتے ہیں۔

یہ حضرات اس پہلو پر غور کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کہ قرآن میں اہل کتاب کو توریت، انجیل اور قرآن کی اقامت کا جو حکم دیا گیا ہے تو کیا
ہے بھی دین کے صرف بنیادی عقائد اور فرائض پر "قائم رہنے" کا مفہوم ہی مراد ہے؟ جیسا کہ فرمایا گیا۔

قل یا اھل الکتاب لستم علیٰ شیء حتیٰ تقیموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیکم من ربکم ط (المائدہ رکوع ۱۰)

کہہ دے! اے اہل کتاب تم کسی راہ پر نہیں جب تک کہ نہ قائم کرو توریت اور انجیل کو اور جو تم پر اترا تمہارے رب کی طرف سے۔

(ترجمہ از مولانا شبیر احمد عثمانیؒ)

اس آیت کی مفصل تشریح کیلئے ملاحظہ ہو ۱۔ ترجمان القرآن جنوری ۶۵ء ۔ ۲۔ زندگی ماہ شعبان ۸۴ھ

اس کے علاوہ اقامت دین کے مقصد پر اعتراض کرنے والے ان قابل احترام بزرگوں نے اقامت دین کی اصطلاح کے اس ترجمہ کو بھی ہدف بنایا بنایا ہے، جو جماعت کے رہنما علماء نے کیا ہے۔ اُن کے نزدیک اس کا ترجمہ "دین قائم کرو" نہیں بلکہ "دین پر قائم رہو" ہے۔ حالانکہ دین پر قائم رہنے کا ترجمہ اردو کے کسی بھی قابل ذکر مفسر نے نہیں کیا۔ مثلاً اسی آیت پر غور فرمائیں جو اوپر درج ہے، اس میں توریت، انجیل اور قرآن کی اقامت کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر، شیخ الہند اور شاہ رفیع الدین رحمہما اللہ نے "قائم کرو" کیا ہے، اس کے علاوہ بعض مترجمین نے اقامت کا ترجمہ "قائم رکھنا" بھی کیا ہے۔ مگر کسی بھی بزرگ نے "قائم رہنے" کا ترجمہ اختیار نہیں کیا۔

اگر اقامت دین کا مفہوم "دین پر قائم رہنا" تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے کچھ زیادہ معنوی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ خود ان کے اسی ترجمہ کے مفہوم میں "دین کو قائم کرنے" کا مفہوم شامل ہے کیونکہ جس طرح "دین پر قائم رہے" اور اسے "قائم رکھے" بغیر دین "قائم کرنا" ایک فعل عبث ہے، بالکل اسی طرح "دین قائم کرنے" کے ارادے اور نیت کے بغیر دین پر "قائم رہنے" کا دعویٰ کرنا فریب نفس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

جماعت اسلامی نے اپنے لٹریچر میں اپنے نصب العین کے لئے صرف اقامت دین ہی کی اصطلاح استعمال نہیں کی بلکہ اس کے مترادف کئی اور اصطلاحیں بھی استعمال کی ہیں مثلاً ان میں سے ایک اصطلاح "شہادت حق" ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:۔

وکذٰلک جعلناکم امۃً وّسطاً لتکونوا شہداءَ	اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں
علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیداً (بقرۃ ۱۷)	پر اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا۔
یا ایہا الذین اٰمنوا کونوا قوامین للّٰہ شہداءَ	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا کی خاطر اٹھنے والے اور
بالقسط (المائدہ ۔ ۶)	ٹھیک ٹھیک راستی کی گواہی دینے والے ہو۔

ان دونوں آیات میں جس "شہادت" کا ذکر ہے وہ صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی مطلوب ہے خاص طور سے آخری آیت کی تشریح میں مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

"اس سے پہلی آیت میں مومنین کو حق تعالیٰ کے احسانات اور اپنا عہد و پیمان یاد کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہاں بتا دیا کہ صرف زبان سے یاد کرنا نہیں بلکہ عملی رنگ میں ان سے اس کا ثبوت مطلوب ہے۔ اس آیت میں اس پر تنبیہ کی گئی ہے، کہ اگر تم نے خدا کے بے شمار احسانات اور اپنے عہد و اقرار کو بھلا نہیں دیا تو لازم ہے کہ اس محسن حقیقی کے حقوق ادا کرنے میں بھی پوری جدوجہد کرو۔ چنانچہ "قوامین للّٰہ" میں حقوق اللہ کی، اور "شہداء بالقسط" میں حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے"

(حاشیہ مولانا شبیر احمد عثمانی)

اسی طرح اقامت دین کے مفہوم کو اظہار دین، غلبۂ دین یعنی حکومت الٰہیہ جیسی اصطلاحوں میں بیان کیا گیا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق	وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول راہ کی سوجھ دے کر اور
لیظہرہٗ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون ط	سچا دین کہ اس کو اوپر کرے سب دینوں سے اور پڑے بُرا مانیں شرک کرنے والے۔ (ترجمہ از شیخ الہند)

حضرت شاہ ولی اللہ علیہ رحمۃ اس آیت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

"جان لینا چاہیئے کہ اس آیت کے سلسلے میں صحیح توجیہ یہ ہے کہ دین حق کو جس قدر بھی غلبہ حاصل ہوا وہ سب مظہرہ میں داخل

ہے اور سب سے بڑا غلبہ جو کسریٰ اور قیصر کی حکومتوں کو زیر و زبر کر دیئے جانے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس لیے ظہرہ کے اندر بعبارت اولیٰ داخل ہے اس شرف کے حامل خلفاء راشدین تھے اور ان صفات کی مساعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقتضاء تھیں اور اس کے عملی پروگرام میں شامل :" (ازالۃ الخفاء مقصد اول صد ۹۳ بحوالہ زندگی دام لیہ)

غلبہ دین اور نظام عدل کا قیام انبیاء کی بعثت کے اہم ترین مقاصد میں سے ہے :- جیسے فرمایا

لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط . . .

ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل دے کر جس مقصد کے لئے بھیجا ہے اور جس غرض کے لئے ان پر کتابیں نازل کیں اور ان کو ضابطۂ حق کی میزان عطا کی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ انصاف پر قائم ہو جائیں۔

ن آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دعوت حق کا منشا انسانی زندگی کو نظام قسط کے سانچے میں ڈھالنا اور اس میں عملاً عدل اور توازن پیدا رہا ہے اسی آیت میں آگے "انزل الحدید" کا ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نظام حق کی اقامت، اس کے تحفظ اور اس کے فروغ کے لئے آہنی اسلحہ کا استعمال یعنی سیاسی اور فوجی قوت بھی ناگزیر ہے،

اسی طرح اقامت دین کے مفہوم کو جماعت نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر محض اخلاقی تبلیغ و تلقین کا فریضہ نہیں کہ صرف وعظ گوئی اور درس و تدریس کے مشاغل سے پورا ہو سکے۔ بلکہ یہ قرآن کی اپنی مخصوص اصطلاح ہے جس سے سارے احکام شریعت کی ترویج اور تنفیذ کی جدوجہد مراد ہے۔ اس کی تشریح میں امام رازی فرماتے ہیں کہ :-

"معروف کی اصل اللہ پر ایمان ہے اور منکر کی اصل اللہ کا انکار ہے"

امام غزالی فرماتے ہیں کہ جو اس فریضہ کو ترک کر دے وہ "دائرہ مومنین سے خارج ہے :-

- اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ پس جو شخص امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ترک کر دے وہ ان مومنین سے خارج ہے جن کا اس آیت (توبہ ۷۱) میں بیان ہوا ہے"

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فریضہ کی ادائیگی کی جن الفاظ میں تاکید فرمائی ہے، اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر محض اخلاق کی تبلیغ و تلقین تک محدود نہیں۔ آپ فرماتے ہیں :-

- ــــ "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے یا تو تم امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرو گے یا قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر عذاب نازل فرمائے، پھر تم دعا مانگو گے اور تمہاری دعا قبول نہیں کی جائے گی" (ریاض الصالحین)
- ــــ "مجھ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جس امت میں بھی اپنا کوئی نبی بھیجا ہے تو اس امت میں ایسے مددگار اور ساتھی ضرور رہے ہیں جو اس کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرتے اور اس کے احکام کی اتباع کرتے۔ پھر ان کے ایسے برے جانشین پیدا ہونے لگے، جو باتیں وہ کرتے جن پر خود عمل نہیں کرتے اور کام وہ کرتے جن کا ان کو حکم نہیں دیا جاتا پس جس نے ان سے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے، اور جس نے ان سے زبان سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے ان سے اپنے دل سے جہاد کیا وہ مومن ہے اگر یہ بھی نہیں ہے تو ایمان رائی کے ذرے کے برابر بھی نہیں" .

"تمہارے اوپر کچھ حاکم اور امیر مقرر کیے جائیں گے لہٰذا تم ان کی بعض باتوں کو پہچانتے ہوگے اور بعض باتوں کو نہ پہچانتے ہوگے۔ پس جس نے ان کی باتوں سے کراہت ظاہر کی وہ بری ہوگیا اور جس نے انکار کیا وہ سالم رہا مگر اس کے سوا جس نے رضامندی ظاہر کی اور اتباع کیا صحابہ نے عرض کی یارسول اللہؐ کیا ہم ان سے جہاد نہ کریں؟ تو آپ نے فرمایا نہیں جب تک کہ نماز قائم کرتے رہیں"

(ریاض الصالحین)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے قومی بگاڑ اور تباہی کے ذکر کے بعد امت کو ہدایت کی ہے کہ

"ہاں! قسم خدا کی تم ضرور معروف کا حکم دو اور ضرور منکر سے روکو ظالم کا ہاتھ لازماً پکڑلو اور اس کو ضرور حق کی طرف پھیر دو"

ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بعض لوگوں کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا:- یا ایہا الذین آمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم۔ یعنی اے ایمان والو اپنے نفسوں کو لازم پکڑو جو شخص گمراہ ہوگیا تم کو ضرر نہیں پہونچا سکتا جب تک کہ تم خود ہدایت پر ہو" اس پر انہوں نے فرمایا:-

"میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو (اس آیت کے بارے میں) فرماتے ہوئے سنا ہے کہ لوگ ظالم کو دیکھیں کہ وہ ظلم کر رہا ہے اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ حق تعالیٰ ان کو اپنے عذاب میں گرفتار کردے" (ریاض الصالحین)

ایک موقع پر آپ نے خوش خبری دی ہے کہ اس امت کے دور آخر میں بھی ایسے لوگ موجود ہوں گے جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دیں گے اور دین کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا مقابلہ کرتے رہیں گے!

"اس امت کے آخر میں ایسے لوگ ہیں، جن کو اس امت کے اگلوں کا سا اجر ملے گا اور وہ معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے، اور فتنوں کا مقابلہ کریں گے۔

یہ ہے جماعت اسلامی کا نصب العین اقامت دین اور یہی اس کا نصب العین بھی ہے اسی فریضہ کی ادائیگی کا حکم سارے انبیاء علیہم السلام کو دیا گیا اور یہی وہ نصب العین ہے جس کے بارے میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور اس وقت فرمایا ہے جب کہ مظلوم اور بے سہارا حق پرستوں کی ایک نہایت ہی مختصر جماعت آپ کے ساتھ تھی کہ:-

"بس وہ ایک کلمہ ہے، اسے اگر قبول کرکے میرے ساتھ آؤ تو تم اس کے بل پر سارے عرب کو ہاتھ میں لے لوگے اور اس کے اثر سے عجم تمہارے زیرنگیں ہوگا"

اقامت دین کی یہی انقلابی دعوت تھی کہ جب مکہ میں گونجی تو جاہلیت کا پورا ایوان لرز اٹھا، مخالفتوں کا ایک سیلاب امڈ پڑا، ہر گھر اور ہر قبیلے میں ایک کشمکش بپا ہوگئی، بھائی بھائی سے کٹ رہا ہے، بیٹا باپ کو چھوڑ رہا ہے، ماں اپنے لخت جگر کو الوداع کہہ رہی ہے۔ ظلم کے الاؤ بھڑکائے گئے حق پرستوں کی پیٹھوں اور سینوں کو داغا گیا۔ استبداد نے بے گناہوں کے خون کو چوسا اور پیا مگر پھر بھی اس کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ اس کا غضب اور بھڑکا حضورؐ کے چچا پر دباؤ ڈالا گیا کہ کسی طرح اقامت دین کے فریضہ کی ادائیگی سے آپؐ کو روک دے۔ چچا بھی حالات سے گہرا اثر قبول کئے ہوئے تھے، حضورؐ کے پاس گئے اور اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ اگرچہ آپ نے بارہا پڑھا اور سنا ہوگا لیکن ایک بار پھر پڑھ کے دیکھ لیجئے، اس سے اقامت دین کا مفہوم اور روشن ہوجائے گا۔

"چچا جان خدا کی قسم یہ لوگ اگر میرے دائیں ہاتھ پہ سورج اور بائیں ہاتھ پہ چاند رکھ کر چاہیں کہ اس مشن کو چھوڑ دوں تو میں

اس سے باز نہیں آسکتا۔ یہاں تک کہ یا تو اللہ تعالیٰ اس مشن کو غالب کر دے اور یا میں اسی جدوجہد میں ختم ہو جاؤں "۔
حکومت الٰہیہ کے قیام کی خبر اور اقامت دین کی کشمکش کا ذکر تو بکثرت روایات میں پایا جاتا ہے لیکن ذیل کی حدیث میں آپ اس کا پہلا نقشہ ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ حضرت خبابؓ بن الارت فرماتے ہیں :-

"ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اپنے مصائب) کی شکایت کی جب کہ آپ کعبہ کے سائے میں اپنی ایک چادر سے تکیہ لگا کر لیٹے ہوئے تھے ہم نے کہا کیا آپ ہمارے لئے (اب بھی) اللہ سے مدد نہ مانگیں گے۔ کیا آپ ہمارے لئے دعا نہ کریں گے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا تم سے پہلے کے لوگوں میں مرد مومن کا حال یہ تھا کہ اس کے لئے زمین کا گڑھا کھود کر اس میں اسے داخل کر دیا جاتا، پھر آرہ لے کر اس کے سر پر رکھا جاتا اور اسے دو ٹکڑوں میں چیر دیا جاتا لیکن یہ ظلم بھی اس کو اس کے دین سے نہ پھیرتا اور کسی کے جسم میں لوہے کی کنگھیاں گڑو کے اس کی ہڈی اور پٹھے تک کھرچ دیا جاتا لیکن یہ سزا بھی اس کو اس کے دین سے نہ پھیرتی! خدا کی قسم! اسلام پورا ہو کر رہے گا یہاں تک کہ سوار صنعاء سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اس کو خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا یا یہ کہ اس کو اپنی بھیڑ بکریوں پر بھیڑیے کے حملے کا خوف ہو"

آپ کے ان ارشادات کا صاف مقصد یہی تھا اور یہی مقصد سننے والوں نے سمجھا کہ آپ جس دین کی دعوت دے رہے ہیں اس کا ظہور غلبہ حکومت کی صورت میں ہوگا۔

لیکن قرآن و سنت کی ان واضح تصریحات کے باوجود اقامت دین کے اس متفق علیہ نصب العین کو بھی اعتراض کا ہدف بنایا جا رہا ہے حالانکہ ابھی معترضین میں اکثر اپنی عمر کا ایک نہایت قیمتی حصہ اسی مقصد کی تبلیغ اور اشاعت میں صرف کر چکے ہیں لیکن اب اس نصب العین کی اس تعبیر میں ایک ایسی غلطی نظر آتی ہے کہ جس سے ان حضرات کے نزدیک دین کا حلیہ بگاڑ کر رہ گیا ہے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان بزرگوں کی اس حیرت انگیز جسارت کے حقیقی اسباب کیا ہیں؟

متین عسکری

فلاحی مملکت کا اسلامی تصور

اصل مضمون پر گفتگو کرنے سے پہلے آئیے لفظ "فلاح" کو سمجھ لیں۔ اصطلاح عرف عام میں دنیاوی کامرانی اور مصائب آلام سے نجات کے بارے بولا جاتا ہے۔ مادی نقطہ سے ہر وہ شخص فلاح یافتہ ہے جو رنج و غم سے بے پروا، برائی بھلائی، نیکی بدی اور خیر و شر کے مفہوم سے ناآشنا، ایک کثیر دولت الک زندگی کی تمام سہولتوں اور نفس کی تمام لذتوں سے متمتع ہو ــــ لیکن اسلام کے مکتبۂ فکر میں یہ لفظ بالکل علیحدہ مفہوم رکھتا ہے۔ اس کے ن اسلام کے بنیادی حقائق کی آمیزش سے اجاگر ہوتے ہیں۔

اسلام اس دنیا کو دارالامتحان اور انسان کی اس کائناتی زندگی کو غیر مستقل و ناممکن قرار دیتا ہے۔ جو لوگ اس دنیا میں مادی اسباب و سائل سے بہرہ مند اور لذت و عیش سے ہمکنار ہیں، ضروری نہیں کہ وہ فلاح یافتہ بھی ہیں۔ بلکہ وہ قادر مطلق کی طرف سے سخت امتحان میں مبتلا ہیں مالک حقیقی یہ جاننا چاہتا ہے کہ ان میں سے کون لوگ ایسے ہیں جو اس دنیا میں ہر طرح کا عیش و آرام پانے کے باوجود میری اطاعت کا دم بھرتے میرے اتارے ہوئے قانون کو مانتے اور میرے بھیجے ہوئے نبی کی سنت پر چلتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ اس دنیا میں مادی اسباب کی تنگی، مصیبت، بت اور کشمکش سے دوچار ہیں اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ لازماً ناکام و نامراد بھی ہیں بلکہ وہ حاکم مطلق کی طرف سے ایک آزمائش میں مبتلا ہیں، وہ آزمانا چاہتا ہے کہ ان میں سے کون لوگ ایسے ہیں جو واقعی میرے تابعدار اور اطاعت گزار بندے ہیں، اور رنج و راحت ہر حال میں میری رضا قدم رکھنے والے ہیں ــــ جو لوگ امتحان کی ان دونوں صورتوں میں کامیاب رہتے ہیں، اسلام ان کے متعلق یہ خوشخبری سناتا ہے کہ بے شک لوگ فلاح یافتہ ہیں۔ اور اس عارضی زندگی کے بعد وہ ایک مستقل پائیدار اور لازوال زندگی سے بہرہ ور ہوں گے، جہاں کبھی نہ ختم ہونے والی نعمتیں اور سہولتیں میسر آئیں گی۔

اس وضاحت کے بعد آئیے فلاحی مملکت کے مادی تصور پر بھی نظر ڈال لیں تاکہ اصل مضمون اور نکھر کر سامنے آجائے۔

[فلا]حی مملکت کا مادی تصور جس طرح مادی نقطۂ نظر سے انفرادی فلاح کا مفہوم یہ ہے کہ فرد دکھ اور تکلیف سے بے نیاز ہر طرح کی دنیاوی خوش حالی و کامرانی سے لذت یاب ہو، بالکل اسی طرح قومی اصطلاح کا مفہوم بھی ٹھہرایا جاتا ہے کہ حرام و حلال اشیاء جائز کی فرسودہ منطق کو چھوڑ کر خالص مادی منافع کی بنیاد پر پوری کی پوری قوم حرکت کرے اور کاروبار دانائی ریاست ایک فلاحی مملکت کے کے مقاصد خطوط پر چلیں، جن سے ایک ہیبت شان و شوکت وجود میں آجائے۔ فلک بوس عمارتیں، وسیع و عریض سکریٹریٹ، جدید سامان تعیش سے متہ قیام گاہیں، کشادہ سڑکیں، باغات، ایٹمی آبدوزیں، دیوپیکر سمندری جہاز، تیز رفتار طیارے، آرام دہ ریلیں، جدید اسلحہ سے لیس بری، و بحری فوجیں اور ایک محدود پیمانے پر عوام کے لئے معاشی انصاف کا قیام ــــ یہ چیزیں ایک فرض شناس، مادہ پرست فلاحی مملکت کا ظہر ہیں۔ عوام کی اصلاح و تربیت کی بجائے انہیں نفسانی خواہشات کی تکمیل کی ہر ممکن چھوٹ دی جاتی ہے، اگر عوام میں کوئی سخت جان عنصر

ر جو وہ جو اصلاح کا خواہاں اور ہر برائی کے آڑے آنے والا ہو تو حکومت کی ساری مشینری اسے دبانے اور مٹانے پر تل جاتی ہے حکومت
اس سرپرستی میں سود، قمار بازی، فحاشی، بدکاری اور اس قسم کی تمام پسندیدہ برائیوں کو فروغ دیتی ہے جس سے عوام احساس و شعور سے
ہو کر ایک وقتی حظ اٹھا سکیں۔

یہ حکومت بعض ناپسندیدہ برائیوں مثلاً رشوت، اسمگلنگ، اشیاء کی گرانی، ملاوٹ اور غبن وغیرہ کو روکنے کی بھی کوشش کرتی ہے
برائیوں کے یہ پودے اپنے حق میں نہایت سازگار رفضا کو موجود پاکر ہر آن ابھرتے رہتے ہیں اور ان کی ذرا سی چھانٹ انہیں اور پھل لانے کا
ر دیتی رہتی ہے۔

قصہ مختصر فلاحی مملکت کا مادی تصور ان مذکورہ شکلوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

حی مملکت کا اسلامی تصور

اب آئیے اپنے اصل موضوع "فلاحی مملکت کے اسلامی تصور" کی طرف رجوع کریں جس طرح اسلام انفرادی
فلاح کا یہ معیار قائم کرتا ہے کہ "ضرور وہی شخص فلاح یافتہ ہے جس نے (ہر حال میں) اپنے نفس کو پاکیزہ
ا، خدا کی یاد کو (ہر لمحہ) اپنے دل میں جگہ دی اور اس کی بندگی اختیار کی" بالکل اسی طرح وہ ایک قوم کی فلاح کا مفہوم بھی یہ ٹھیراتا ہے کہ وہ
اجی طور پر انہی لائنوں پر حرکت کرے، عمال حکومت خدا کی خشیت اور نزاکت فرض کے احساس کو اپنے دل میں جاگزیں کر کے کاروبار حکومت چلائیں
حکومت کا بنیادی مقصد لوگوں کو معاملات نفس میں چھوڑ دینا نہیں بلکہ انہیں خدا کے قانون کا سچا پیروکار بنانا ہو جس کا کام اصلاح پسند طبقے
دبانا نہیں بلکہ اسے اور ابھارنا اور پھیلانا ہو۔ جس کی عملداری میں برائی کو سر چھپانے کی جگہ نہ ملے، جس کی نگرانی میں کوئی ایسا کام نہ پھلے پھولے
اسلام کے نظریۂ فلاح کے منافی ہو، جو حکومت اسلام کی روح کے عین مطابق لوگوں میں سماجی مساوات اور معاشی انصاف قائم کر سکے جس کے زیر
یہ لوگ اپنے آپ کو مامون و محفوظ سمجھتے ہیں۔ جس کے کرتا دھرتا سرتاپا اسلامی نظریۂ حیات کے علمبردار ہوں، جن کی رہائش گاہیں عوام کی رہائش
ہوں سے ممتاز نہ ہوں جن کے لباس عوام کے لباس سے مختلف نہ ہوں اور جو دل سے اپنے آپ کو عوام کا خادم سمجھیں —— بلاشبہ ایسی ہی حکومت
مملکت اسلام کی نظر میں فلاح یافتہ کہلانے کی مستحق ہے۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا انتہائی ضروری ہے کہ ایسی خدا پرست حکومت مادی اسباب و وسائل اور جدید عصری تحقیقات سے پہلو تہی نہیں
رتی بلکہ انہیں زیادہ سے زیادہ اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتی اور عوام کے لئے کارآمد و مفید بناتی ہے۔ اسلام بنی نوع انسان کو مخاطب کر کے
ہتا ہے کہ خدائے واحد نے زمین و آسمان کی ہر شے تمہارے لئے مسخر کر دی ہے اب اگر تم ان کو ان کے صحیح مصرف میں لاؤ گے تو دنیا و آخرت کا راستہ اپنے لئے
درست کر لو گے اور اگر شیطان کی پیروی میں ان کا استعمال کرو گے تو یہی چیزیں دنیا میں بھی تمہاری ذلت کا باعث ہوں گی اور آخرت میں بھی عذاب کی
کھائی میں گرائیں گی۔

اسلامی فلاحی مملکت اس ہدایت کے عین مطابق اپنا نقشۂ کار ترتیب دیتی ہے —— وہ اپنی فوج کو جدید ترین اسلحہ سے لیس تو
کرتی ہے لیکن اس لئے نہیں وہ اپنے ہمسایہ ممالک پر اپنی فوجی برتری کی محض دھاک بٹھانے کے لئے آئے دن اپنی طاقت کے زعم میں ان سے چھیڑ خانی کرتی رہے
بلکہ وہ ملک کی مدافعت، مظلوم کی حمایت، نیکی کی اشاعت اور امن کی بحالی کے لئے انہیں کام میں لاتی ہے۔ وہ اپنی تحقیق کے مراکز، ریڈیو، ٹیلیویژن
اسٹیشن تو قائم کرتی ہے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ ان سے امن عالم کو خطرے میں ڈالے اور فحاشی و بدکاری کی تشہیر کرے، بلکہ وہ دنیا کو سلامتی کا راستہ
دکھانے اور نیکی کی تبلیغ کرنے کے لئے ان کا استعمال کرتی ہے وہ اسلام کے فلاح و بہبود کیلئے ان کا استعمال کرتی ہے، وہ عوام کیلئے کٹ وہ سڑکیں، باغات، ہموار

لہ اس دور میں رہنے سہنے، کھانے پینے اور دوسرے اسباب تمدن و تہذیب میں مساوات بہت دشوار ہے۔ (م۔ ق)

مکانات، آرام دہ ریل گاڑیاں، بسیں، ہوائی جہاز، روزگار کی سہولتیں، تعلیم کے مواقع اور حق رائے دہی کی آزادی فراہم تو کرتی ہے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ سب کچھ پا کر خدا کے باغی و نافرمان بن جائیں ——— بلکہ اور زیادہ اُس کے مطیع و فرماں بردار بنیں۔ اس کی گونا گوں نعمتوں کے شکر گزار ہوں اور ہر آن ان کی پیشانیاں سرنگوں رہیں[1]۔ یعنی یہ مادی اسباب و ذرائع اسلامی مملکت میں عین مقصود نہیں بلکہ ایک آلۂ کار کی حیثیت رکھتے ہیں، جن سے عوام کو انسانیت کا صحیح شعور دیتی اور نیابت خداوندی کا صحیح عرفان بخشتی اور انہیں فلاح و کامرانی کی حقیقی راہ پر ڈالتی اور قرآن کی زبان میں ——— واولٰئک ھم المفلحون

---

[1] قارئین کرام کو میرا یہ طرز تحریر کچھ عجیب سا محسوس ہوگا کہ دنیا کی کسی اسلامی حکومت میں بھی ان جدید مادی وسائل کو مندرجہ بالا مقصد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن میں ایسے ایک امر واقعہ کے طور پر لکھ رہا ہوں، یہ تعجب درست ہے لیکن یاد رکھیئے کہ نام نہاد اسلامی کی بجائے جب خالص اسلامی نظریہ کی بنیاد پر کوئی حکومت استوار ہوگی اور اس کے چلانے والے سرتاپا اسلامی شریعت کے پیروکار ہونگے تو کام کا خاکہ اختلاف کے یہی ہوگا۔ جس کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: "اگر ہم ان لوگوں (یعنی اسلامی نظریۂ حیات کے علمبرداروں) کو زمین پر دفرماں روائی دیں تو وہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام (واضح رہے کہ یہ صحت مند اسلامی معاشرے کے بنیادی لوازم ہیں) قائم کریں اور ان کی ساری طاقتیں بھلائی کو پھیلانے اور برائی کے مٹانے میں صرف ہوں گی۔ (الحج - ۴۱)

(ص ۴۳ کا بقیہ)

مدینہ اور سرکار مدینہ کی یاد اور تصور ہی میں ابدی نیند سو گئے:

ناظر مرحوم حمید صدیقی مرحوم کی زندگی توکل و قناعت کی زندگی تھی، اصغر علی محمد علی کارخانہ عطر (لکھنؤ) سے آخر دم تک ملازمت کا تعلق رہا، حاجی اصطفا خاں مرحوم اُن کے قدردان اور مداح تھے، خوش نویسی اور خطاطی پیشہ کے طور پر سیکھی تھی، شاعری میں جگر مرادآبادی سے متاثر بلکہ یوں کہئے اُن کے فیض یافتہ تھے، ترنم، انداز بیان یہاں تک کہ داڑھی اور چہرے مہرے میں جگر کا مثنیٰ دکھائی دیتے تھے، طبیعت میں اس درجہ تواضع و مسکنت اور مزاج میں اس قدر انکسار تھا جیسے اُنہیں اپنی شاعرانہ شہرت اور مقبولیت کی کچھ خبر ہی نہیں ہے! اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو منور و معطر اور اُن کی آخرت کو فوز و فلاح اور نجات و مغفرت سے ہمکنار بنائے۔ (آمین)

ماہر القادری

ترے نام سے جس کو نسبت نہ ہوگی
وہ افسانہ ہوگا حقیقت نہ ہوگی

خزاں کے تصور میں اس طرح گم ہوں
بہار آئے گی مجھ کو وحشت نہ ہوگی

یہ روزِ ازل فیصلہ ہو چکا ہے
خوشی سازگارِ محبت[1] نہ ہوگی

خزاں ہے غنیمت بہار آ نہ جائے
نشیمن بنانے کی فرصت نہ ہوگی

بہت شوخ ہیں میری مشتاق نظریں
خطائیں کروں گا ندامت نہ ہوگی

خدا جانے کب تک مرے ناصحوں کو
خدا کی طرف سے ہدایت نہ ہوگی

سلامت رہے میری بزمِ تصور
وہ آئیں گے اور اُن کو زحمت نہ ہوگی

بہت کچھ ہے اُن کے ستم کا سہارا
کرم کی بھی شاید ضرورت نہ ہوگی

[1] یا ــــ مسرت شریکِ محبت نہ ہوگی

ہماری نظر میں

فخرِ کونین (حصہ دوم)

از :- محشر رسول نگری، ضخامت ۲۵۶ صفحات (مجلد، خوشنما سرورق)
ملنے کا پتہ :- میسرز پاکستان پریس، جناح روڈ، کوئٹہ

جناب محشر رسول نگری خوش فکر اور خوش گو شاعر ہیں، کئی سال سے اُن کے فکر و سخن کا موضوع "نعتِ رسولؐ" ہے اور اسی میں اُن کی تمام توانائیاں صرف ہو رہی ہیں، یہ وہ سعادت ہے جو دوسرے شاعروں کے لئے قابلِ رشک ہے !

محشر رسول نگری نے سیرتِ نبوی کو بہ طرزِ مسدس نظم کیا ہے، اُن کے مسدس (فخرِ کونین) کی پہلی جلد شائع ہو کر مقبول ہوئی دوسری جلد کتابت و طباعت کے خاصے اہتمام کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہے، جس پر جناب فرمان فتحپوری (ایم۔ اے) نے بلند پایہ دیباچہ تحریر اس دیباچہ کی ایک ایک سطر معلومات آفریں ہے۔

"فخرِ کونین" (حصہ دوم) میں سیرتِ نبی کے اہم واقعات خاصی تفصیل کے ساتھ نظم کئے گئے ہیں، عقیدت و محبت کا د اس مسدس میں ہلکورے لے رہا ہے، اندازِ بیان شگفتہ، فکر سلجھی ہوئی اور تخیل پاکیزہ ہے۔

منتخب اشعار :-

ظلمت فروغ پا تی تھی لالہ کے داغ سے — بڑھتی تھی اور تیرگی دودِ چراغ سے
ہنگامۂ جہاں ہے رسالت مآب سے — قائم یہ سلسلہ ہے اسی آفتاب سے
گھر گھر ہے تذکرہ شہِ گردوں رکاب کا — آغاز ہو رہا ہے نئے انقلاب کا

ہر دورِ روزگار میں وحدت نشاں ہیں آپ
سچ پوچھئے تو خود ہی زمان و مکاں ہیں آپ
جانِ جہاں ہیں اور تب و تابِ جہاں ہیں آپ
نورِ چراغِ محفلِ روحانیاں ہیں آپ

اپنے امیر تا بہ قیامت حضورؐ ہیں
ہر کوئی دور مرکزِ ملت حضورؐ ہیں

ساقی کو اس سے کیا کوئی میخوار ہو نہ ہو
پروا نہیں گر کوئی خریدار ہو نہ ہو

بیٹھے تو حق کے لشکرِ جرار بن گئے
سمٹے اگر تو بندۂ کرار بن گئے
طوفاں کوئی اٹھا تو یہ کہسار بن گئے
آئی خزاں تو ابرِ گہر بار بن گئے
ان کے فسانے مشرق و مغرب کو یاد ہیں
یہ لوگ زندہ حجتِ فقر و جہاد ہیں
باطل کو ان کے ہاتھ سے حق نے کیا ذلیل
ہے ان کی حرب و ضرب کا مداح جبرئیل
ان کی جزا ہے کوثر و تسنیم و سلسبیل
ان کا کمال، فیضِ نبوت کی ہے دلیل
پرتو ہے سب میں آپ کے خلقِ عظیم کا
کیا زندہ معجزہ ہے رسولِ کریم کا

ہم جہاں میں بندۂ کامل حضورؐ ہیں
انسانیت کی آخری منزل حضورؐ ہیں
دولت کے واسطے نہ حکومت کے واسطے
اُٹھی ہے تیغ حق کی حفاظت کے واسطے
ذوقِ نظر سے مرحلے الفت کے طے ہوئے
آوارہ تھے جو نغمے وہ پابندِ لے ہوئے
منظور تھی خدا کو حفاظت جو دین کی
کھینچیں ملائکہ نے طنابیں زمین کی

کچھ فصلِ گل سے کم نہیں دامانِ مے فروش
پیدا ہو کیوں نہ قلقلِ مینا سے دل میں جوش
وہ مستیٔ نگاہ وہ ترغیبِ نازِ نوش
ساقی کا جلوہ دیکھ کے اُڑتے ہیں خود ہی ہوش
ہر رات مے کشوں کی شبِ ماہتاب ہے
ان کی نظر میں غم کا مداوا شراب ہے

دل تھا اسیرِ غم تو سلاسل تھیں پاؤں میں
آیا تھا بھاگ کر وہ ستاروں کی چھاؤں میں

ہر ملک اور قوم کے رہبر ہیں مصطفیٰؐ
شیرازہ بندِ اسود و احمر ہیں مصطفیٰؐ
ہر دورِ زندگی کے پیمبر ہیں مصطفیٰؐ
آئینۂ صفات کا جوہر ہیں مصطفیٰؐ
رحمت بھی ان کی عام ہے بعثت بھی عام ہے
خیر الوریٰ کا فیضِ ہدایت بھی عام ہے

ہر نوع کے لئے ہیں نبی ، شاہ و بحر و بر ۔۔۔ احمدؐ ہیں آسماں پہ ، محمدؐ زمین پہ

اقلیم کائنات کے سرور حضورؐ ہیں

کوئی جہاں ہو اُس کے پیمبر حضورؐ ہیں

نقشِ قدم ہیں آپ کے یوں کائنات میں ۔۔۔ جیسے چراغ جلتے ہوں تاریک رات میں

قندیلِ حق ہے جس کا ضمیر اور کون ہے ۔۔۔ جُز مصطفےٰؐ سراجِ منیر اور کون ہے

دوسرا رُخ

یوں ظلمتیں نہ چھائی تھیں آفاق پر کبھی ۔۔۔ ڈستی تھی سانپ بن کے نہ یوں رہگزر کبھی (ص ۱۷)

مصرعہ ثانی بھرتی کا ہے ۔ " رہگزر کا سانپ بن کر ڈسنا " یہ اندازِ فکر و بیان وجدانِ صحیح کو کھٹکتا ہے !

انساں تھا خیر و شر کے دوراہے پہ نیم جاں ۔۔۔ تاریکیاں عدم کی ڈراتی تھیں ہر زماں (ص ۱۸)

دوسرا مصرعہ بہت کمزور ہے ، ایک تو عدم کی تاریکیاں پھر اُن کا ہر لمحہ ڈرانا ، آخر یہ بات کیا ہوئی ؟

دیکھے تو کوئی ذوقِ اطاعت کی انتہا ۔۔۔ مزدور کے لباس میں ہیں خود شہِ رضا (ص ۳۶)

" شہِ رضا " کتنی نامانوس ترکیب ہے !

خلقِ محمدیؐ میں کچھ ایسا کمال ہے ۔۔۔ اس تیر سے قلوب کا بچنا محال ہے (ص ۴۴)

خلق کے ساتھ " تیر " کا ذکر بے جوڑ سا ہے !

توحید سے عرب میں کوئی آشنا نہ تھا ۔۔۔ حضرت سے پہلے کوئی یہاں باخدا نہ تھا

مقصودِ زندگی کا تعین ہوا نہ تھا ۔۔۔ فکر و عمل کسی کا حقیقت نما نہ تھا (ص ۵۵)

اس بند کے دوسرے مصرعہ میں جو بات کہی گئی ہے ، وہ خلافِ واقعہ ہے ، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل میں صدیوں تک عرب کے لوگ توحید آشنا اور باخدا رہے ہیں ! چوتھے مصرعہ میں " حقیقت نما " قافیہ کی مجبوری کی نشان دہی کرتا ہے ۔

ساتھی نبیؐ کے چین سے سوئے تمام رات ۔۔۔ کفار اپنے بخت کو روئے تمام رات (ص ۶۳)

مصرعہ ثانی جاندار نہیں ہے خاص طور سے " بخت " نے شعر کو کمزور بنا دیا ۔

پروانے حق کے صبح دم آ کر پئے نماز ۔۔۔ حضرت کی اقتدا میں ہوئے خم سرِ نیاز

" پروانے حق " کی جگہ " بندے خدا کے " ہوتا ، تو شعر میں کتنی بے ساختگی پیدا ہو جاتی !

اُٹھی تو رختِ زیست کے پُرزے اُڑا گئی ۔۔۔ جس دم گری تو کفر کے خرمن جلا گئی (ص ۶۸)

یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تیغ کی تعریف میں ٹیپ کا بند ہے ! جس میں آمد کے سوا اور کیا رکھا ہے ! اتنے کمزور اشعار اس مسدس میں دیکھ کر ذوقِ شاعرانہ کو تعجب ہوتا ہے ۔

لڑکوں کے ہاتھ سے اجل اس بد زباں کی تھی ۔۔۔ دوزخ ہی جانتا ہے یہ مٹی کہاں کی تھی (ص ۱۰

مصرعہ اولیٰ بچکانہ ہے ۔

بیٹی کوئی نہ باپ سے دولت کو پاسکی　　اخلاقِ حق سے یوں نہ گھر اپنا سجا سکی　(ص ۱۰۵)

اق سے گھر کو سجانا" یہ کہاں کی زبان اور طرزِ بیان ہے ۔ اس طرح لفظوں کے جوڑ دینے سے شعر تو بہر حال موزوں ہو جاتا ہے مگر
یہ شاعری .... !!

رکھتے تھے سب وہ حدِ نظر پر اُٹھا کے پاؤں　　ٹکتے نہ تھے زمیں پہ اہلِ جفا کے پاؤں　(ص ۱۳۱)

پاؤں کا مفہوم اجمال کی حد تک مبہم ہے ۔

یہ ایک بات چوٹ تھی تقدیسِ عشق پر　　غیرت سے شعلہ بن گیا وہ مردِ دیدہ ور　(ص ۱۹۱)

تِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ جب حدیبیہ سے مکہ گئے تھے اور قریش نے اُن کو کعبہ کا طواف کرنے کی اجازت دی تھی، ان کی یہ بات
ق کی تقدیس پر نہیں غیرتِ عشق پر چوٹ تھی، یا یوں کہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و محبت پر ایک طرح کی طنز تھی ۔
قدیس" کا یہاں استعمال بے محل ہے ۔

پھیلا عرب میں اور بھی اسلام کا اثر　　ہونے لگیں ادائیں رسالت کی کارگر　(ص ۲۱۱)

سالت کی ادائیں، پھر اُن کا کارگر ہونا، عجیب سے عجیب تر !

کر دو نیچ کر ایک طرف تور ہے گا کیا　　سمجھے گا کس طرح کوئی قرآں کا مدعا　(ص ۲۴۶)

مدعا" کہا تھا ۔ جب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے لگے، تو مختر صاحب کو چاہئے کہ نظرِ ثانی کر کے سست مصرعوں کو چست
بنادیں اور بھرتی کے مصرعوں کو بدل ڈالیں ۔

مختر صاحب نے عرفی کی طرح مرحلہ نعت کی دشواریوں اور ذمہ داریوں کا اعتراف کیا ہے، فرماتے ہیں :—

نظروں سے چومتا ہوں مدینے کے بام و در　　کرتا ہوں پھر ثنائے شہنشاہِ بحر و بر
دشوار ہے یہ مرحلۂ نعت کس قدر　　میں چل رہا ہوں تیغ برہنہ کی دھار پر

سرمست ہوں اگرچہ فروغِ نشاط سے
رکھتا ہوں ایک ایک قدم احتیاط سے

بعض مقامات پر تو شاعری اپنے عروجِ کمال پر پہونچ گئی ہے ۔ مثلاً :—

اس وقت تھا قریش سے کعبہ بھرا ہوا　　ہر شخص دم بخود تھا حرم میں کھڑا ہوا
تھا ہیبتِ رسول سے ہر سر جھکا ہوا　　ہر آدمی تھا خوف سے اک بت بنا ہوا

کوئی شک نہیں سیرتِ نبوی کو بطرزِ مسدس نظم کر کے جناب مختر رسول نگری نے اردو شاعری میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے، اُن کی
یہ کتاب مسلمانوں کے گھروں میں، محفلوں میں اور سیرت کے جلسوں میں پڑھی جائے گی اور وقت کے جذر و مد کے ساتھ اس کی مقبولیت او
شہرت میں اضافہ ہوتا رہے گا !

کارمینا
دردِ شکم، بدہضمی، بھوک کی کمی،
اپھارہ، قبض، قے، دست،
ہضم کی خرابی
یہ اور معدہ اور جگر کے دوسرے امراض آج کل عام ہیں۔ اور ان شکایتوں کی وجہ سے نہ صرف صحتیں خراب رہتی ہیں بلکہ کاروبار اور زندگی کے دوسرے مشاغل پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اچھا ہاضمہ اور صحیح معدہ اچھی صحت کا ضامن ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ وہی ہیں جو کچھ آپ کھاتے ہیں۔ لیکن جب آپ کا کھایا ہوا جسم کو نہ لگے، اور جزو بدن ہو کر، خون بن کر آپ کو طاقت نہ پہنچائے تو کھانا پینا ہی بے کار نہیں ہوتا بلکہ اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا مشکل ہو جاتا ہے اور جینا دو بھر۔
ہمدرد کی لیبارٹریوں اور ہمدرد مطبوں میں چیدہ جڑی بوٹیوں اور ان کے قدرتی نمکیات پر طویل تجربات اور سائنسی تحقیقات کے بعد ایک متوازن اور مفید دوا کارمینا تیار کی گئی ہے جو ہضم کی جملہ خرابیوں کو دور کرنے میں خصوصیت رکھتی ہے۔ کارمینا معدے پر نہایت خوشگوار اثر کرتی اور اس کے افعال کو درست کرتی ہے۔ ہضم کے فعل کے لیے جو رطوبتیں ضروری ہیں کارمینا ان کو مناسب مقدار میں پیدا کرتی ہے۔ جگر کی اصلاح کرتی اور جگر کی جملہ خرابیوں کو درست کرتی ہے۔
سینے کی جلن، تیزابیت، پیٹ کا بھاری پن، نفخ، بدہضمی، پیٹ کا درد، کھٹی ڈکاریں، دردِ شکم، متلی اور قے، بھوک کی کمی، قبض یا معدہ اور جگر کی دوسری بیماریوں میں کارمینا کا استعمال نہایت مفید ہوتا ہے۔
کارمینا نظامِ ہضم کو درست اور تقویت دینے کی یقینی دوا ہے۔ ہر موسم اور ہر آب و ہوا میں ہر مزاج کے لوگوں کے لیے فائدہ بخش اور موثر ہے۔ بلا خطر استعمال کی جا سکتی ہے۔
کارمینا ہر گھر کی ایک ضرورت ہے
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی ڈھاکہ لاہور چاٹگام

طابع: انٹرنیشنل پریس کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

جماعتِ اسلامی کے قیام کا مقصد "اقامتِ دین" ہے اور یہ جماعت اپنے آغازِ قیام ہی سے اس مقصد کے لئے اپنی استطاعت کی حد تک جدوجہد کر رہی ہے، بعض مسائل میں جماعت کے طریقِ کار سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے مگر اس واقعیت اور حقیقت سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ جماعت کا مقصود و منتہاء "اقامتِ دین" ہی رہا ہے جس کی اصل غرض و غایت اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے، اس مقصد اور غرض و غایت سے جماعتِ اسلامی ایک قدم بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوئی انتہائی ناساز گار فضا میں بھی اُس نے اس جدوجہد کو جاری رکھا ہے اور اس راہ میں مرطرح قربانیاں دی ہیں! جماعت کی تاریخ صداقت و استقامت اور ایثار و قربانی کی تاریخ ہے!

جماعتِ اسلامی کے پیش کئے ہوئے لٹریچر نے مسلمانوں میں تعمیری فکر پیدا کی ہے اور تجدد زدہ ماحول اور مادیت پرورده فضا میں ایمان و یقین کے چراغ روشن کئے ہیں، یہ فرشتوں کی نہیں انسانوں کی جماعت ہے اس لئے جماعت کے کاموں میں کمزوریاں اور کوتاہیاں بھی پائی جا سکتی ہیں، مگر مجموعی طور پر جماعت کا وجود ملتِ اسلامیہ کے لئے باعثِ خیر و برکت ہے! جماعت پر اُس کے ارکان اور امیر پر تنقید کی جا سکتی ہے، ان کوتاہیوں کی نشان دہی دین و ملت کے بہی خواہوں کو کرنی ہی چاہئے، نقد و احتساب سے کوئی تنگ نہیں اصلاحِ حال کی جانب دین کے خدمت گزاروں کی توجہ کا رُخ پھرتا ہے!

مگر

ایک تو ہوتا ہے دردمندانہ نقد و احتساب پُرخلوص وعظ و نصیحت، اور اصلاحِ حال کی خیر خواہانہ کوشش! جس کا ہر حق پسند فرد اور جماعت کی طرف سے خیر مقدم ہونا چاہئے، اس کے مقابلہ میں دوسرا رُخ اُس تنقید، طعن و طنز اور احتساب کا ہے جو کسی فرد یا جماعت کی تنقیص، تذلیل اور تحقیر پر مبنی ہے۔ اس قسم کی تنقید کے تیور معاندانہ اور حریفانہ ہوتے ہیں، ایک ایک لفظ میں نیرونشتر چھپے ہوئے، زیادہ سے زیادہ کچوکے دینے اور جراحتیں پہنچانے کی کوشش! آج جماعتِ اسلامی کو زیادہ تر اسی قسم کے بغض و عناد اور بے رحمانہ تنقید اور جارحانہ احتساب سے سابقہ پڑ رہا ہے اہلِ عداوت معاندین اور مخالفین کی ایک پلٹن ہے جو جماعت کے خلاف ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر صف آرا بلکہ نبرد آزما ہے! ہم تمام احوال و کوائف کا طرح جائزہ لینے کے بعد اس احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے قول و عمل کی جواب دہی کرنی ہے، اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی کی معاندانہ مخالفت سے دراصل دینی محاذ کمزور ہو رہا ہے اور اس مخالفت اور بغض و عناد کے مظاہروں کا لادینی گروپ تجدد زدہ طبقہ کو فائدہ پہونچ رہا ہے! ایک ہی کیمپ کے لوگوں کے ہاتھوں سے جماعتِ اسلامی پر چاند ماری اور گولہ باری ہوتے دیکھ کر ترقی پسند اور منکرینِ حدیث خوشی سے پھولے نہیں سماتے، کہ اس سیلاب کفر و ضلالت کے آگے جو پشتہ سب سے زیادہ روک ثابت ہو رہا ہے اُسکا پشتہ [illegible]

کھا لیں گے کر پل پڑے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس غلط اندیشی اور خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہیں کہ آج کل دنیا میں اسلام کی بقا خدانخواستہ جماعت اسلامی کے وجود سے وابستہ ہے، ہمارا کہنا یہ ہے کہ جماعت اسلامی اسلام کی مخلص خدمت گزار اور دین حق کی نمائندہ جماعت ہے، اس لئے اُس کے دریئے آزار رہنے سے کسی نہ کسی درجہ میں ہی، دینی محاذ کو نقصان ضرور پہونچتا ہے! لوگ اپنے زہد و تقویٰ پر نہ جائیں اور علم و فضل پر مغرور نہ ہوں قیامت کے دن انہیں اپنی اس لیاقتی کی جواب دہی کرنی پڑے گی، اور اس دن یہ جان کر انہیں بڑی پشیمانی ہوگی کہ شیطان دین ہی کے نام پر دینی محاذ کو اُن کے ہاتھوں سے پارہ پارہ کرا رہا تھا!

اس تمہید کے بعد ہم جو کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں وہ ایک ایسا جرعہ ناخوش گوار ہے جسے ہمیں جانتے ہیں کہ کس بے دلی اور ناخوشی کیساتھ گوارا کیا جا رہا ہے!　　؟!

پی لے بے ، تو مشکل ، نہ پیئے تو مشکل
زہر کا نام ستمگر نے دوا رکھا ہے

کاش! اس کی نوبت نہ آتی اور یہ اذیت کوش داستان "فاران" کے صفحات پر نہ دہرائی جاتی ، مگر کیا کیا جائے ایک طرف ایک بلند و بالا محترم شخصیت کا سوال ہے اور دوسری طرف ایک حق پسند جماعت کی مظلومیت کا مسئلہ درپیش ہے، ذہن و فکر اور ضمیر بات کی اس کشمکش میں ضمیر کا یہی فیصلہ ہے کہ مظلوم کی حمایت اور مدافعت کی جائے!

جماعت اسلامی سے بعض ارکان خود بھی علیحدہ ہوئے ہیں اور بعض کو جماعت سے خارج بھی کیا گیا ہے، مگر جماعت نے ارکان کی علیحدگی اور اخراج پر اخبارات میں نہ کوئی بیان دیا نہ ان کے خلاف فرد جرم شائع کی نہ اس نوع میں رد کردہ کیا کرتے رہے ہیں اور نہ جماعت کی برتری قائم رکھنے کے لئے ان حضرات کی تنقیص کی گئی، مگر جماعت سے علیحدہ ہونے والے بعض ارکان نے یہ ضرور کیا ہے کہ سیاسی لیڈروں کی طرح اپنی علیحدگی اور جماعت کی کوتاہیوں کا اخبارات میں اعلان کیا اور اس کے بعد جماعت کے عناد و مخالفت کی گرہ ان کے دل میں پڑ گئی! ہمارے محترم بزرگ مولانا امین احسن اصلاحی بھی انہی حضرات میں شامل ہیں، جو جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد جماعت کے خلاف مسلسل نیش زنی کئے جا رہے ہیں! اُن کے علم و فضل اور ادب و انشاء کا رخ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر طنز و طعن بلکہ تنقیص و تکذیب کی جانب ہو گیا ہے اور اب چند دنوں سے زمانہ کی ہوا دیکھ کر جماعت کی دشمنی میں وہ اس سطح تک آگئے ہیں جو دنیا داروں، حاشیہ نشینوں اور خوشامدیوں کی پست سطح ہے، تغیر فرمائی کا جائز و موقف اور چڑھتے سورج کی تصیدہ خوانی اور بھبتی، اس کا کسی طرح دل کو یقین نہیں آتا مگر کیا کیا جائے کہ یہ انہونی بات ہو کر رہی، ماہنامہ "میثاق" کے صفحات اس کی شہادت دے رہے ہیں

مولانا اصلاحی جماعت اسلامی سے جب علیحدہ ہوئے ہیں تو انہوں نے جماعت پر گمراہی اور راہِ حق سے انحراف کا الزام لگایا تھا حالانکہ اس وقت ملک خلافِ کعبہ کی نمائش کا واقعہ ظہور میں آیا تھا نہ عورت کی صدارت کا مسئلہ درپیش تھا، اس الزام کے بعد بھی وہ جماعت کو اُس کے حال پر چھوڑ سکتے تھے مگر وہ جماعت کے خلاف اپنے عناد و برہمی اور بغض و عداوت کے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے، انہوں نے مروت اور شرافت کے علی الرغم پورے خلوص عداوت و بے دردی بلکہ ناانصافی کے ساتھ جماعت اور مولانا مودودی کی ذات کو نشانہ بنایا ہے! مولانا اصلاحی صاحب جب تک جماعت سے وابستہ رہے، زبان و قلم سے مولانا مودودی کے مداح رہے، اُن کی تحریریں موجود ہیں، جن میں انہوں نے مودودی صاحب کی عربی دانی، وسعتِ مطالعہ اور تفقہ فی الدین کا بڑی کشادہ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے، مگر جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے کے بعد انہوں نے اعلان فرمایا کہ "مودودی اور پرویز میں کوئی فرق نہیں ہے" (لا فرق بین المودودی و پرویز) یعنی یہ دونوں ایک ہی علمی سطح کے آدمی ہیں! یہ پہلی ناانصافی ہے جو مولانا مودودی کے بارے

ن سے سرزد ہوتی یا اس کے بعد سے مودودی صاحب کی تنقیص کا سلسلہ کمل کر یا رمز و اشارات کے پیرایہ میں جاری رہا ہے وہ اپنی پرائیویٹ
ں اور نجی مجلسوں میں مودودی صاحب پر "امیرالمومنین" کی پھبتی کستے رہتے ہیں حالانکہ جماعت کے دستور میں واضح طور پر اس سوءِ ظن، التباس اور
باہ کا پہلے ہی سے ازالہ کر دیا گیا ہے۔ دستور کی دفعہ ۱۱ میں لکھا ہے :—

"جماعتِ اسلامی پاکستان کا ایک امیر ہوگا جس کی حیثیت "امیرالمومنین" (باصطلاح معروف) کی نہ ہوگی۔ بلکہ صرف اس
جماعت کے امیر کی ہوگی۔ جماعت کے ارکان اس کی اطاعت فی المعروف کے پابند ہوں گے"

مارشل لار کا دور جماعت کے شدید ابتلا کا دور تھا، اس دور میں ——— مولانا اصلاحی صاحب نے جماعت کی مظلومیت کا اس طرح مذاق اُڑایا
اعت کے ارکان کو بلوں میں گھس جانے والے "چوہوں" سے تشبیہ دی، حالانکہ اس دور میں مولانا اصلاحی صاحب نے بھی کوئی کارنامہ اسداللہی
م نہیں دیا، جماعت سے علیحدگی کے بعد وہ قید و بند کے خطروں سے بھی آزاد اور نچنت ہوگئے ہیں، وادی اُن کے بارے میں اب چین ہی چین لکھتا ہے
کے مزاج کا اب یہ عالم اور ان کی طبیعت کا یہ رنگ ہو گیا ہے کہ حکومت عورت کی صدارت کے مسئلہ میں اُن کی تحریروں کو اپنے لئے مفید پاکر بڑے
نہ پر ان کی اشاعت کا انتظام کرتی ہے تو اصلاحی صاحب اس کا فخر کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں! وہ جو علامہ اقبال نے کہا تھا —

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ آشیاں کہ نہ ہو جس کی گھات میں صیاد

مولانا اصلاحی صاحب کی طبیعت اب — "خطر پسند" نہیں رہی، "امن پسند" بلکہ "آرام پسند" بن گئی ہے، اب تو اس قسم کے تذکروں سے وہ لطف
ہ ہیں کہ کس بڑے آدمی نے اُن کا کتنے قدم بڑھ کر استقبال کیا اور سرکاری "تائید و حمایت" پر مشتمل اُن کے مضامین کو کس انداز میں کس لب و لہجہ کے
اتھ سراہا گیا۔ اُن کا قلم اب اس درجہ "درباری" ہو گیا ہے کہ جمال عبدالناصر جیسے مستبد آمر کی مدح و منقبت کا زہر اُن کے قلم سے ٹپکا ہے، اس
کی تبدیلی کو کیا کہیئے جو علم و حکمت کے موتی لٹاتے لٹاتے کنکر اور پتھر بکھیرنے لگے! بلندیوں کو اس قدر پست ہوتے کم ہی دیکھا گیا ہے، اس ٹریجڈی
اظہارِ افسوس کے لئے کہاں سے کوئی الفاظ لائے کہ ایورسٹ کی چوٹی دیکھتے ہی دیکھتے سطح سمندر سے بھی زیادہ پست ہو گئی۔

پاکستان میں معروف آزاد اور عوامی جمہوریت کی بجائے "بنیادی جمہوریت" کا جو نسخہ کیمیا "ایجاد کیا گیا ہے، اُس کے نتائج لازمی طور پر
ہی نکلنے چاہئے تھے، جو ہمارے سامنے آئے ہیں، اسی نسخہ کے ذریعہ "مطلق العنانی" کی عمر بھی دراز ہوئی ہے اور اُسے استحکام بھی میسر آیا ہے
یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اُس سے مولانا اصلاحی اچھی طرح باخبر ہیں مگر اُن کے "علم و تقوی" کی پوری ہمدردیاں "حزب اقتدار" ہی کے ساتھ رہی ہیں
ن کا "انتخابی فتح مندی" پر مولانا موصوف نے تبریک و تہنیت کے پھول نچھاور کئے ہیں یہاں تک کہ اس معرکہ میں اخبارات کے جو تاثرات سب ہی
وام نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے! ان تمام حقائق و واقعات سے مولانا اصلاحی جان بوجھ کر بے خبر بن گئے ہیں! "متحدہ محاذ" کا انہوں نے
خوب مزے لے لے کر مذاق اڑایا ہے، خاص طور سے جماعت اسلامی کی تضحیک و تذلیل میں اُن کے قلم نے بغض و عناد کے تقاضوں کا پورا پورا حق
ادا کر دیا ہے "تازہ ترین میثاق" (ماہ ذی الحجہ) کا صرف ایک اقتباس ہی مولانا موصوف کے ذہن و فکر کو سمجھنے کے لئے بہت کافی ہے فرماتے ہیں

"ہم کو اس متحدہ محاذ کے اُن دیندار حلیفوں کی اس عبرت ناک شکست پر ذرا بھی اُن کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے، ایسے
بے اصول لوگوں سے آخر کس خیر کی اُمید تھی کہ اُن کی شکست پر افسوس ہو، ہمارا یہ خیال بھی نہیں ہے کہ یہ شکست حکومت اور
پولیس کے جبر اور دباؤ کا نتیجہ ہے" ۔۔۔ (ص ۳)

مشرقی پاکستان میں صوبائی اسمبلی کے ضمنی انتخابات ہوئے تھے، اس سلسلہ میں وہاں کے الیکشن ٹریبونل نے صوبائی وزیر زراعت قاسمی عبدالقادر صاحب کو بدعنوانیوں کا مرتکب قرار دیتے ہوئے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ وزیر موصوف نے سرکاری اختیار کا ناجائز استعمال کیا، سرکاری غرض سے متعدد ادا میں کر انتخابی قواعد کے پیش نظر روپیہ دیا، سرکاری جماعت کے امیدوار کے حق میں کنویسنگ کے لئے سرکاری گاڑیوں کے استعمال کی اجازت دی، حلقہ انتخاب میں صوبائی گورنر کی آمد پر ووٹروں کو دعوت پر بلایا اور اپنے پسندیدہ امیدوار کے لئے ووٹ حاصل کرنے کی خاطر اپنا اعلیٰ پوزیشن سے ہر طرح کام لیا، حتیٰ کہ ایک موقعہ پر ایک ووٹر کو یہ دھمکی بھی دی کہ سرکاری جماعت کے نامزد امیدوار کے حق میں ووٹ نہ دیا تو اسے خطرناک نتائج بھگتنے پڑیں گے ...... ۔

مولانا اصلاحی صاحب کے رشحات خامہ اور افکار عالیہ کا یہی رنگ رہا تو کیا عجب ہے کہ اُن کا قائم کیا ہوا "حلقۂ تدبر قرآن" رفتہ رفتہ "حلقۂ تدبر اقتدار" میں تبدیل ہو جائے! حکومت واقتدار کی مدافعت اور وکالت کا یہ رنگ اور طرز خاص مولانا اصلاحی صاحب کے علاوہ اور کسی عالم دین کو میسر نہیں آیا! ایکیا ہو رہا ہے! یا اللہ! ہم یہ کیا دیکھ رہے ہیں! جماعتِ اسلامی کی دشمنی میں اتنے بڑے آدمی کے ذہن وفکر کی یہ تبدیلی کا دین ودانش کی کتنی عبرت انگیز ٹریجڈی ہے!

ع پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے جماعتِ اسلامی سے جن وجوہ واسباب کی بنا پر علیحدگی اختیار کی تھی، جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ان میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ جماعت کو اسمبلی کے انتخابات کے جھمیلوں اور دوسرے سیاسی مخمصوں کی بجائے خالص دینی امور کی جانب توجہ دینی چاہئے! جب ایسی صورت تھی تو مولانا موصوف کو تبلیغی جماعت کی طرح ملک کے سیاسی امور سے بے تعلق ہو جانا چاہئے تھا، بے چاری جماعت اسلامی کو بھی وہ اس کے حال پر چھوڑ دیتے تو ان کی یہ روش سلامت پسندی کی روش ہوتی! مگر انہوں نے جماعت کو سیاسیات میں سوث دیکھ کر اس سے علیحدگی اختیار کر لی مگر خود سیاسیات سے کنارہ کش نہیں ہوئے، متحدہ محاذ پر تنقید خاص طور سے ان معاملات میں جماعت پر شدید عتاب، حزب اقتدار کی مدح خوانی اور اس کی سیاسی فتحمندی پر مبارک باد دیں ...... ! یہ "سیاست" نہیں تو اور کیا ہے! جو زبان کنونشن مسلم لیگ کو انتخابات کی فتح پر مبارک باد دے سکتی ہے، وہ متحدہ محاذ وسیع جماعتِ اسلامی کے تعاون پر کس منہ سے اس قسم کی پھبتیاں کس سکتی ہے کہ ،

"متحدہ محاذ کے پیچھے انہوں نے دنیا بھی برباد کی اور دین بھی ......" (میثاق)

یہ بات تو بے شک درست ہے کہ جماعتِ اسلامی نے دین کی جو خدمت انجام دی ہے اس نے جماعت والوں کی "دنیا" کو بے شک نہیں بنایا، اب رہا "دین" تو اس کے بارے میں قیامت ہی کے دن پورا فیصلہ ہو سکے گا لیکن مولانا نے سیاست وحکومت کے معاملات میں جو روش اختیار فرمائی ہے اور ان کی تحریروں میں تقیہ کا جو رنگ پیدا ہو گیا ہے اُسے دیکھ کر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُن کی "دنیا" کا مستقبل بہر حال روشن ہو گیا ہے۔

لطافتِ نگہ ملتفت کا کیا کہنا کبھی کبھی تو یہ محسوس بھی نہیں ہوتی

ماہنامہ میثاق کے تازہ شمارے سے مولانا اصلاحی صاحب کے نہایت عزم کا پتہ لگتا ہے کہ وہ جماعتِ اسلامی کی مخالفت کے سلسلہ کو جاری رکھنے سے باز نہیں آ سکتے اس کارِ ثواب کو وہ شاید مسلسل انجام دیتے رہیں گے اُن کے ہاتھ میں قلم ہے اُن کا اپنا رسالہ ہے اپنے اس شوق کو وہ آسانی سے پورا کر سکتے ہیں! اگر وہ ذرا اس کا بھی خیال رکھیں ؎

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہی ویسی سُنی!

ف آخر جماعت اسلامی جس مقصد اور پیام کو لے کر اُٹھی ہے وہ کسی سازگار ماحول اور عوام کی ہردلعزیزی اور مقبولیت
کا پابند نہیں ہے، لوگ مانیں یا نہ مانیں ماحول موافق وسازگار ہو یا نہ ہو، اُسے تو اقامتِ دین کی جدوجہد کو
بحال جاری رکھنا ہے، اسمبلیوں کے انتخابات کی ہار جیت اُس کے ارکان کو دل شکستہ اور مایوس نہیں کر سکتی، ہاں، طبعی طور پر
ہم کے نتائج سے کوفت ضرور ہوتی ہے، اس کوفت کو بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے جماعت والوں کو اجر ملے گا کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی
ندی کی خاطر انہیں یہ کوفت برداشت کرنی پڑی ہے، جماعت اسلامی اب تک مشکلوں کے خارزار سے گزرتی رہی ہے، قدم قدم پہ
نیں بلکہ بڑھاتیں! مگر زخم کھا کر اس کا عزیمت میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوئی ڈھیل پیدا نہیں ہوئی! حکومت نے تو اپنی دانست
اس کا پتا پانچہ ہی کر دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ کی نصرت و رحمت عدالت کے فیصلہ کی شکل میں ظاہر ہوئی اور جماعت بحال ہو گئی! آئندہ
ت کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جاتا ہے اس کا جواب مستقبل ہی دے سکے۔ اتنے اہم اور ذمہ دارانہ معاملات میں عقل کے تیر تکے لڑانا
نادانی کی بات ہے! رہی جماعت اسلامی تو اس کا پروگرام، مقصد اور عزائم کھلی کتاب کی طرح سب کے سامنے ہیں، وہ پاکستان میں اُس
م کو قائم کرنا چاہتی ہے۔ جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا ہے! اور یہ نظام "اسلام" ہے جس کی بنیاد ایمان، اخلاق اور پاکیزگی پر ہے!
عت کا متحدہ محاذ کے ساتھ تعاون پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کی غرض سے تھا، اور مقصود صرف "جمہوریت" کی بحالی نہ تھی، یہ تو اسلامی نظام برپا
نے کے لئے ایک ذریعہ ہے، مصر کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے، وہاں آمریت، استبداد اور مطلق العنانی نے اسلامی نظام کے قیام کی ہر راہ بند کر
ی ہے، جمال ناصر نے تخت حکومت پر براجمان ہوتے ہی سب سے پہلا وار "اخوان المسلمون" پر کیا کہ یہی تنظیم اُس کی آمریت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ
تھی!

یہ دنیا ہے یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے، ظالموں اور حق ناشناسوں نے انبیا کرام جیسے نفوس قدسیہ کو قتل کیا ہے، یزید کی
جوں نے گلشنِ اہل بیت کو مسل کر رکھ دیا اور راکبِ دوشِ نبیؐ کو چشم آفتاب نے غربت و بیکسی کے عالم میں خاک و خون میں تڑپتے دیکھا! یہ سب کچھ
ہوتا رہا مگر نہ آسمان سے کوئی بجلی گری نہ بالشت بھر زمین کہیں سے شق ہوئی! بعض سطح بیں ان واقعات کو دیکھ کر اور پڑھ کر مذبذب ہو جاتے ہیں
ور ہذیان بکنے لگتے ہیں (سبحان اللہ عما یصفون) وہ نہیں جانتے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے، دارالجزا نہیں ہے، یہاں عام طور پر
یکی اور بدی کا ہاتھ کے ہاتھ بدلا نہیں ملتا اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے یوم آخرت مقرر فرمایا ہے، جہاں جس نے رائی برابر بھی نیکی اور بدی
کی ہے اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا! جن کی آخرت پر نگاہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر پورا یقین رکھتے ہیں وہ دنیا کی کامیابی پر نہ تو
غرور ہوتے ہیں اور نہ یہاں کی ناکامی اُنہیں مایوس بناتی ہے! اس دنیا میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اوقات علم و فضل اور زہد و
تقویٰ بھی جور و استبداد کے ہاتھوں کو مضبوط بناتے اور مظلوموں کی پامالی میں ظالموں کے مددگار ثابت ہوتے ہیں!

آخر میں ہمیں پھر اس حقیقت کو دہرانا ہے کہ جماعت اسلامی کے اغراض و مقاصد اُس کا ماضی اور حال اور اُس کے ارکان کی زندگیاں کھلی کتاب کی طرح
سب کے سامنے ہیں، جماعت کے پروگرام میں کوئی راز داری اور اُس کے پیغام میں قدامت ابی الجهاد تعیلی بھی ہے یہی سنے کی بات ہے کہ ہم مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں
تو انفرادی زندگی سے لے کر تجارت گاہوں اور حکومت کے ایوانوں تک اسلام ہی کا پورا پورا عمل دخل ہونا چاہیے، جہاں تک اطاعت معروف کا تعلق ہے جماعت ایک نکٹے حبشی حاکم
کے سامنے بھی سر تسلیم خم کر دے گی مگر اطاعتِ معصیت میں وہ ہفت کشور کے شہنشاہ اور ہفت اقلیم کے فرمان کو بھی ٹھکرا دے گی، نیکی کے لئے اُس کے پاس آغوش محبت ہے اور بدی کے لئے اُس
کے ہاں نفرت و حقارت کی ٹھوکریں ہیں! اللہ تعالیٰ اس حق پسند جماعت کو قائم اور صحیح و سلامت رکھے کہ اس نے پرآشوب اندھیروں میں حق و صداقت کے چراغ روشن کر رکھے ہیں!

ماہر القادری

حکیم محمود احمد برکاتی

شاہ محمد محدث دہلویؒ
شاہ ولی اللہؒ دہلوی کے ایک گم نام فرزند

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (ف سنہ ۱۱۷۶ھ) کی شخصیت سے اظہار عقیدت کے باوصف ان کی جامع و کامل سوانح کی ترتیب پر اب تک کوئی توجہ نہیں کی گئی، شاہ صاحب کی حیات کے صدہا پہلو ہنوز تشنۂ تحقیق و تفحص ہیں، مثلاً :

● ــــ شاہ صاحب کے فرزندانِ گرامی کی تعداد عموماً چار بتائی جاتی ہے حالانکہ یہ تعداد پانچ ہے !

● ــــ شاہ صاحب کی عربی و فارسی شاعری میں تو کلام کی گنجائش نہیں ہے لیکن ان کی اردو شاعری میں کلام کیا جا سکتا ہے، شاہ صاحب میر و سودا اور مظہر جان جاناں کے معاصر تھے اس لئے ان کا اردو میں شعر کہنا بعید از قیاس نہیں ہے، لیکن کہے بھی تھے یا نہیں ؟ اس کی تحقیق ابھی تک نہیں کی گئی، بعض تذکروں میں شاہ صاحب کی طرف چند اردو اشعار منسوب کئے گئے ہیں، ہو سکتا ہے یہ اشعار ان کے ہم نام معاصر کے ہوں، جو التباس کی بنا پر شاہ صاحب کی طرف منسوب ہو گئے اور شاہ صاحب کے اردو اشعار کسی اور کے مجموعہ کلام میں شامل کر دئے گئے ہوں۔

● ــــ شاہ صاحب پر نجف خاں کے مظالم کا افسانہ بھی جرح و نقد کا مستحق ہے۔[1]

● ــــ شاہ صاحب اور محمد بن عبد الوہاب نجدی کے اشتراک تلمذ کا بھی فیصلہ ہونا چاہیئے، ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کا کتب خانہ شاہ عبدالعزیز کو منتقل ہوا ہوگا، شاہ عبدالعزیز نے وہ شاہ اسحٰق صاحب کو دے دیا تھا، شاہ اسحٰق صاحب ہجرت کے وقت بڑا حصہ اپنے ساتھ حجاز لے گئے تھے ان کے ایک نواسے عبدالرحمٰن کا ذکر آتا ہے جو حجاز ہی میں تھے اب ان کے ورثاء کے پاس وہ کتب خانہ ہوگا، شاہ اسحٰق صاحب کے ایک داماد مولانا عبدالقیوم بڈھانوی نے بھوپال میں وفات پائی ہے، کچھ کتابیں ان کے پاس بھی ہوں گی، بھوپال میں ان کے اخلاف کے یہاں ممکن ہے اب بھی مل جائیں، بہر حال جہاں جہاں بھی ممکن ہو اس خاندان کی کتابوں کا سراغ لگایا جائے، ان میں کچھ کتابیں شاہ صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہوں گی، کچھ تالیفات کے مسودات ہوں گے کچھ کتابوں پر حواشی ہوں گے، کہیں کہیں کوئی یادداشت ہوگی، اس طرح شاہ صاحب کی حیات کے بہت سے گوشے آشکار ہوں گے سنین کا تعین ہوگا کئی غلط بعض غلط فہمیاں دور ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان رجال و کتب کا یقین ہو سکے گا جن سے شاہ صاحب متاثر ہوئے۔

● ــــ شاہ صاحب کے افادات پر بھی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، مثلاً :

شاہ صاحب کے کئی رسائل ہنوز غیر مطبوعہ ہیں، ہم کتابوں میں صرف اُن کے نام پڑھتے ہیں آج تک ان کی زیارت سے محروم ہیں، النوادر، النخبہ،

---

[1] اس پرچہ ہی میں مضامین آئے ہیں کہ یہ واقعہ صحیح نہیں ہے۔ (م۔ق)

مقدمہ در فن ترجمۂ قرآن، غالباً آج تک کہیں طبع نہیں ہوئے،

● بعض رسائل چھپ چکے ہیں لیکن نامکمل و ناقص چھپے ہیں، انتباہ کے تین اقسام (حصوں) میں سے صرف پہلا حصہ چھپا ہے، باقی دو حصے ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔

● شاہ صاحب کی جو کتابیں پہلے طبع ہوئی تھیں وہ بھی اب "نوادر" کی صنف میں شامل ہو گئی ہیں اس لئے ان کی دوبارہ اشاعت کی شدید ضرورت ہے، شاہ صاحب کی فکر کو سمجھنے کے لئے ان کے پورے سیٹ کا پیش نظر رہنا لازمی ہے ہم ایسے کئی حضرات سے واقف ہیں جو شاہ صاحب پر کام کر رہے ہیں لیکن ان کی تالیفات سے محرومی کے شاکی ہیں، ان دنوں بعض ادارے اس طرف متوجہ نظر آ رہے ہیں مگر وہ صرف ترجموں کی طباعت پر اکتفا کرتے ہیں غیر حامل المتن ترجموں سے مقصد پورا نہیں ہوتا۔

● شاہ صاحب کے رسائل و کتب کی صحیح تعداد ہی اب تک متعین نہیں ہوئی، ہماری نظر سے آج تک کوئی ایسی تحریر نہیں گذری جس میں حضرت شاہ صاحب کی تالیفات کی مکمل فہرست درج ہو، شاہ صاحب کی بعض کتابوں کے اجزا کو ناشرین نے علیحدہ بھی شائع کر دیا تھا، ان کو اکثر حضرات ——— اہل علم تک ——— مستقل رسائل سمجھ لیتے ہیں، الجزء اللطیف اور مکتوب مدنی اصل میں انفاس اور تفہیمات کے اجزا ہیں۔

● ایک گروہ ——— اہل حدیث حضرات ——— نے شاہ صاحب اور ان کے اخلاف کی طرف ایسی تحریروں کو منسوب کر دیا جو حقیقتاً ان کی نہیں تھیں، اس سلسلہ کا آغاز ۱۲۸۵ھ سے قبل ہی ہو گیا تھا، چنانچہ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی اور نواب قطب الدین خاں نے اس زمانے میں اس کی تردید کر دی تھی، پھر موجودہ صدی کے آغاز میں سید ظہیر الدین احمد ولی اللّٰہی نے بار بار اس کی تردید کی لیکن البلاغ المبین اور تحفۃ الموحدین جیسے رسائل آج تک شاہ صاحب کے نام سے چھپ رہے ہیں۔

ایک اور ستم یہ کیا گیا کہ شاہ صاحب کے حقیقی رسائل میں ترمیم و اضافہ کی کوششیں کی گئیں، الفوز الکبیر اور حجۃ میں ابن تیمیہ وغیرہ کے جو اقتباسات بلا حوالہ درج ہیں وہ غالباً اسی قبیل سے ہیں، فیوض کے مطبوعہ نسخوں میں نمایاں اختلافات ہیں۔

● متعدد وجوہ سے سب سے زیادہ ضرورت، ان کی تحریروں کی تاریخی ترتیب کا تعین ہے داخلی و خارجی شواہد سے بڑی حد تک اس کام کی تکمیل ہو سکتی ہے، شاہ صاحب کی مختلف تحریروں میں انداز بیان کا تفاوت یا ان کے بعض اقوال و افکار میں جو تضاد نظر آتا ہے اس کا واحد حل یہی ہے مختصر یہ کہ شاہ صاحب کی حیات اور تالیفات کی ترتیب و اشاعت کی طرف اہل علم کی توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بعد ان کے علوم پر تحقیق کی راہ کھلے گی خصوصاً شاہ ولی اللہ اکیڈمی (حیدرآباد) اگر "الرحیم" میں غیر متعلق مضامین کی اشاعت کے بجائے یہ اہتمام و التزام کرے کہ ہر ماہ شاہ صاحب کے مختصر رسائل کے اصل متن صحت کے ساتھ شائع ہوتے رہیں تو سال دو سال میں بیشتر رسائل عام ہو جائیں گے۔

ہم ان میں سے فی الحال پہلے مسئلے کے سلسلے میں اپنے نتائج مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

شیخ محمد اکرام تحریر فرماتے ہیں:—

"عام طور (شاہ صاحب کے فرزندوں کے) تذکروں میں چار نام ہی ملتے ہیں"

رود کوثر ص ۵۶۴

اور یہ واقعہ ہے کہ عام طور پر مورخین شاہ صاحب کے چار صاحبزادوں کا ذکر کرتے ہیں، حالانکہ پانچ صاحبزادے[1] تھے جن میں سب سے

---

[1] اور ایک صاحبزادی امۃ العزیز تھیں جن کا عقد شاہ محمد عاشق کے صاحبزادے سے ہوا تھا، تذکرۃ الرشید ص ۳۰

بڑے شاہ محمد محدث دہلوی تھے، اُن کو لوگوں نے بھلا دیا۔

مولوی محمد محسن ترہتی اپنی تالیف الیانع الجنی (تالیف ۱۲۸۰ھ) میں لکھتے ہیں :-

وکان لعبد العزیز اخ اقدم منہ سناً اسمہ محمد وکان اخاہ لابیہ اخذ عن ابیہ وھو ایضاً قدیم الوفاۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ" (ص ٦٦)	شاہ عبدالعزیز کے ایک بھائی تھے جو آن سے عمر میں بہت بڑے تھے ان کا نام محمد تھا، وہ شاہ صاحب کے اخیافی بھائی تھے اور ان کی وفات بھی شاہ صاحب سے بہت پہلے ہوئی تھی، ان پر اللہ کی رحمت ہو

مولانا عاشق الٰہی لکھتے ہیں -

"شاہ ولی اللہ کے پانچ صاحبزادے تھے ایک پہلی بیوی کا سے مولوی شیخ محمد . . . . مولوی شیخ محمد لاولد گئے"

تذکرۃ الرشید ص ۳۰

شاہ ولی اللہ کی پہلی شادی اپنی ماموں زاد بہن شیخ عبید اللہ کی صاحب زادی سے ۱۱۲۸ھ میں ہوئی تھی، انہی کے بطن سے شیخ محمد پیدا ہوئے تھے، شاہ صاحب کی کنیت اسی بناء پر ابو محمد تھی، "الارشاد" کے سرورق پر شاہ صاحب کا مکمل اسم گرامی یوں تحریر ہے -

"ابو محمد احمد بن عبد الرحیم المدعو بہ شاہ ولی اللہ الدھلوی"

اس کتاب کے ص ۲ پر تحریر ہے -

ولہ ولد قبل مولانا عبد العزیز مسمیٰ بہ محمد فکنی بابی محمد"	شاہ عبدالعزیز سے بڑے آپ کے ایک صاحب زادہ محمد تھے اس لئے آپ کی کنیت ابو محمد ہے -

مولوی سید ظہیر الدین احمد ولی اللہی نے جو اس خانوادے کے ایک فرد تھے، "تاویل الاحادیث" کے آخر میں شاہ صاحب کے حالات تحریر کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں :-

"شاہ صاحب کا پہلا عقد شیخ عبید اللہ صاحب پھلتی کی صاحب زادی اور شیخ محمد عاشق پھلتی کی بہن کے ساتھ ۱۴ سال کی عمر میں ہوا تھا" ص ۸۷

صاحب نزہۃ الخواطر مولوی عبد الحی نے ۱۸۹۳ء میں دہلی اور اس کے اطراف کا سفر کیا تھا دہلی میں ان کی ملاقات سید ظہیر الدین احمد سے ہوئی جنہوں نے انہیں بتایا تھا کہ

"شاہ صاحب کی بھی دو شادیاں ہوئی تھیں پہلی پھلت میں ہوئی . . . . ان سے ایک صاحبزادے ہوئے شیخ محمد صاحب" (دہلی اور اس کے اطراف) ص ٦٨

شیخ محمد کی تعلیم و تربیت شاہ صاحب ہی کی نگرانی میں ہوئی تھی انہوں نے علوم دینیہ کی تکمیل اپنے والد ماجد ہی سے کی تھی، شاہ عبدالعزیز نے شمائل ترمذی اپنے ان بڑے بھائی کی قرأت ہی سے پڑھی تھی -

مولوی عبد الحی جنہوں نے ان کے ترجمہ کے لئے "الشیخ العالم المحدث" کا عنوان قائم کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

وقرء شمائل ترمذی سماعاً علیہ بقراۃ اخیہ	شاہ عبدالعزیز نے شمائل ترمذی اپنے والد سے اپنے

آسی ضیائی

وہ لفظ کون سا ہے؟

مولانا آزاد نے آبِ حیات میں بتایا ہے کہ ایک بار میر سوز نے سودا کے سامنے اپنی غزل کا یہ مطلع پڑھا ؎

نہیں نکسے ہے مرے دل کی اُپا ہے گا ہے اے فلک! بہرِ خدا، رخصتِ آہے، گاہے

سودا نے اس پر فقرہ کسا "میر صاحب بچپن میں ہمارے ہاں پشور کی ڈومنیاں آیا کرتی تھیں۔ یا تو جب یہ لفظ سنا تھا، یا آج سنا ہے"

مولانا آزاد نے یہ قصہ نقل کر کے یہ نہیں بتایا کہ وہ لفظ کون سا تھا جس پر سودا کو اعتراض ہوا۔ لیکن پروفیسر محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں کسی شاعرہ "خفیہ بیگم" والدہ میر صابر کی ایک غزل نقل کی ہے، جس کا مطلع ہے ؎

اتنا سخن ہے، دل میں سمائی ہو جاوے گی جہاں بات منہ سے نکسی، پرائی ہو جاوے گی

اور اس کے لفظ "نکسی" پر حاشیے میں آبِ حیات کا مندرجہ بالا قصہ بلا تبصرہ نقل کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیرانی مرحوم کے نزدیک سودا کے بچپن میں پشور کی ڈومنیاں "نکسنا" بولا کرتی تھیں۔ بالفاظِ دیگر، یہ لفظ بھی شیرانی کے نظریے کی رُو سے اصلاً پشاور، پنجاب وغیرہ کا ہے، جہاں سے رفتہ رفتہ دہلی اور دوسرے علاقوں میں مستعمل ہو گیا۔

پروفیسر شیرانی میدانِ تحقیق میں اردو کے مایۂ ناز اور لائقِ رشک بزرگ گزرے ہیں، ان کے پائے کا محقق ہمارے ہاں ایک آدھ ہی اور ہوا ہے، مگر ان کی کتاب "پنجاب میں اردو" ان کے "ذہنی تحفظ" کی ایک عجیب مثال ہے، اس میں انہوں نے تحقیق کو اپنے مفروضے کا تابع بنایا ہے، اور اسی بنا پر ایسی کتنی ہی باتیں کہہ گئے ہیں جو تحقیق بلکہ عقلِ عام کے بھی خلاف پڑتی ہیں، مندرجہ بالا واقعہ اس کی ایک عبرت ناک مثال ہے۔

سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ کیا "نکسنا" سودا کے زمانے سے پہلے اردو میں رائج ہی نہ تھا؟ اگر نہیں، تو کیا وجہ ہے کہ آج تک اس لفظ کے دو ایک مشتقات "نکاس" اور "نکاسی" —— اردو میں عام ہیں، حالانکہ بطورِ فعل اسے اردو میں کبھی بار نہ ملا؟ پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اگرچہ "نکسنا" اردو اور بعض دوسری مقامی بولیوں (کھڑی بولی، ہریانی) میں مستعمل نہیں، مگر مشرقی بولیوں، اودھی، بھوجپوری، ماگھی وغیرہ میں یہ فعل بہت عام ہے؟ گویا "پشور" سے یہ لفظ کیا تو دہلی، میرٹھ، نجیب آباد وغیرہ کو پھلانگ کر لکھنؤ، پرتاب گڑھ، گونڈہ وغیرہ جا پہنچا، اور وہاں بڑی آسانی سے بس گیا! آپ آج بھی اودھ وغیرہ کے علاقے میں دیہاتیوں سے اس قسم کے فقرے عام سن سکتے ہیں کہ "ہمرے پران نکسے جات ہیں"، "گاڑی نکس گئی" وغیرہ۔ لیکن مغربی یوپی اور دہلی کے دیہات میں نکسنا اور اس کی مختلف شکلیں سننے میں نہیں آتیں۔ پھر کیا یہ لفظ "پشور" سے سیدھا مشرق میں پہنچا، اور سارا درمیانی علاقہ چھوڑ گیا؟ (واضح رہے کہ پنجابی میں بھی "نکسنا" استعمال نہیں ہوتا۔) اور مشرق میں بھی پہنچتے ہی ایسا مقبول ہوا کہ سودا کے بچپن سے آج تک دو ڈھائی صدی ہی میں دیہاتی بولیوں کا جزو بن گیا؟ (مشرقی یوپی کے شہروں میں بھی یہ مستعمل نہیں۔)

میرے پاس پشتو کی صرف ایک مختصر سی لغت "نیر اللغات" ہے، جو پشتو کی پہلی لغت بھی ہے۔ اس میں بھی "نکسنا" نہیں ملتا، حالانکہ اگر

آج سے ڈھائی سو سال پہلے بھی یہ لفظ "پشور کی ڈومنیاں" بولتی تھیں تو اسے اتنا عام تو ہونا چاہیئے تھا کہ پشتو کی لغت میں درج کیا جا سکتا۔ اس کے برخلاف، پلیٹس (JOHN T. PLATTS) کی "اردو، کلاسیکی ہندی اور انگریزی لغت" (DICTIONARY OF URDU, CLASSICAL HINDI AND ENGLISH) میں "نکسنا" اور "نکاسنا" درج ہیں، اور ان کی اصل پراکرت "نکاس" بتائی گئی ہے، جو سنسکرت "نِشکس" سے ماخوذ ہے۔ سنسکرت میں یہ لفظ (نِس + کس) کا مرکب ہے، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لفظ پشاور یا لاہور سے نہیں آیا، بلکہ اُسی علاقے کا قدیم لفظ ہے جو متھرا اور اس کے مضافات پر مشتمل ہے کیوں کہ پراکرت اور سنسکرت اسی خطے کی پیداوار ہیں۔

اس کے بعد ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا سودا کے بچپن میں پشور سے صرف ڈومنیاں ہی آتی تھیں؟ جن کی زبان سے نکلا ہوا یہ لفظ اُنہیں یاد رہا؟ سودا خود کابلی خاندان کے فرد تھے، اُن کے والد میرزا محمد شفیع بسلسلہ تجارت آئے اور دلی میں بسے تھے، ظاہر ہے کہ سودا کے بچپن میں اُن کے گھر میں پشتو ہی بولی جاتی ہوگی۔ اگر نکسنا پشتو کا لفظ ہوتا تو یہ ایسا غریب اور کم استعمال ہونے والا لفظ تو نہ تھا کہ سودا نے کبھی اپنے گھر میں سنا ہی نہ ہو، اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کابلی پشتو میں یہ لفظ نہیں ہے، پشاوری پشتو میں ہوگا تو کیا دلی میں پشاور کے باشندے کبھی آتے ہی نہ تھے؟ ظاہر ہے کہ پشاور سے ڈومنیاں تو کبھی کبھار ہی آتی ہوں گی، اور ان کا دائرۂ عمل بھی زنان خانوں تک محدود رہتا ہوگا۔ البتہ پشاور سے مرد بڑی تعداد میں، اور آئے دن، آتے رہتے ہوں گے، کیونکہ دلی کے ہمیشہ سے پایۂ تخت ہونے کے باعث نہ صرف برصغیر بلکہ دوسری ولایات کے لوگ بھی مختلف ضروریات کے تحت دلی آتے جاتے رہتے تھے۔ پھر یہ تو عجیب بات ہوئی کہ سودا نے یہ لفظ پشاوری مردوں سے کبھی نہ سُنا، صرف پشاوری ڈومنیوں سے سُنا۔

گویا نتیجہ یہ نکلا کہ میر سوز کے اس مطلع میں سودا کے نزدیک قابلِ اعتراض لفظ "نکسے ہے" نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ کون سا لفظ ہے؟ آزاد نے اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ اُن کی تحریر میں جا بجا بے تکلف گفتگو کا سا رنگ ملتا ہے اور اسی لئے انہوں نے اس نکتے میں بھی وہی بے تکلفی برتی، اور غالباً فرض کر لیا ہے کہ قاری خود ہی جانتا ہوگا کہ سودا نے کس لفظ پر اعتراض کیا۔ مگر آج ہمارے لئے یہ معما بن کر رہ گیا ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو یہ بہت مختصر سا شعر ہے، جس میں ایک آدھ کے سوا کوئی لفظ بھی نامانوس نہیں، اس لئے زیرِ بحث لفظ کی تفتیش میں زیادہ دقت نہیں ہونی چاہیئے، مگر پروفیسر شیرانی نے اپنے عجیب نظریئے کی ترویج میں ایک ایسے لفظ پر انگلی رکھ دی جو کسی طرح متکلم فیہ لفظ نہیں ہو سکتا۔

دوسرا لفظ جس پر نظر پڑتی ہے "اُپایا ہے" معلوم ہوتا ہے، اور بادی النظر میں یہی قرینِ قیاس بھی ہے، کیونکہ اُردو میں یہ لفظ بالکل بیگانہ ہے اور تمام اُردو لغات اس سے خالی ہیں، یہاں تک کہ پلیٹس کی "اردو، کلاسیکی ہندی اور انگریزی لغت" میں بھی اس کا سراغ نہیں ملتا۔ بمشکل نوراللغات سے اتنا قیاس ہوتا ہے کہ یہ لفظ شاید سنسکرت "اُپاہت" بمعنی "خستہ و شکستہ" سے ماخوذ ہو۔ (صاحب نوراللغات نے بھی "اُپاہت" کی تحقیق "اُپاہج" کے ذیل میں کی ہے؛ "اُپایا ہے" انہوں نے بھی نہیں دیا ہے۔) لہٰذا اس کے معنی خستگی، غمگینی، حسرت وغیرہ کے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی "اُپاہ" سے "اُپاؤ" اور "اُپائے" بمعنی درماں، مداوا بھی بنے ہوں۔ بہرحال، یہ طے ہے کہ "اُپایا ہے" اُردو میں کبھی مستعمل نہیں رہا لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ سودا نے اُسی لفظ کا مذاق اُڑایا تھا تب بھی وہ اعتراض اپنی جگہ برقرار رہتا ہے کہ اس ضمن میں "پشور کی ڈومنیوں" کا کیا مذکور تھا، جب کہ پنجابی اور پشتو میں بھی "اُپایا ہے" موجود نہیں ہے۔

اس کے بعد جس لفظ پر تامل ہوتا ہے وہ صرف ایک ہی رہ جاتا ہے؛ اور وہ بھی تنہا نہیں بلکہ دوسرے لفظ سے مل کر وہ مضحکہ خیز آواز پیدا کرتا ہے جس پر سودا کو یہ پھبتی سوجھی۔ گانے والے بالعموم گانا شروع کرتے وقت طرح طرح کی عجیب اور بے معنی آوازیں نکالتے ہیں، اور اس طرح گلے کو مخصوص گ

ب ہونے کے قابل بناتے ہیں۔ بلکہ قوال تو گانے کے بیچ بیچ میں بھی اس قسم کی آوازیں نکالتے رہتے ہیں، مثلاً آآآ... آہے آہے، آہے واہ...
ہے جی... وغیرہ... مجھے ڈومنیوں کا گانا سننے کا تو ایک آدھ دفعہ کے سوا کبھی اتفاق نہ ہوا اور وہ بھی کم عمری میں، خصوصاً لپشاور کی ڈومنیوں کو تو دیکھا تک نہیں، لہٰذا میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس قسم کی آوازیں نکالتی ہیں (" واقف کار" صاحبان اطلاع دیں۔) البتہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ آہے گا ہے" جیسی آوازیں نکالتی ہوں گی۔

اس قیاس کو ایک تقویت اس کی صوتی ترکیب سے پہونچتی ہے۔ حقیقتاً اس شعر سے علیحدہ کر کے یہ فقرہ زبان سے ادا کیا جائے تو مضحکہ خیز ہو گا۔ دوسری تقویت اس روایت کے بقیہ حصے سے پہونچتی ہے، جس کو شیرانی مرحوم نے بالکل حذف کر دیا ہے، کیونکہ ان کے مقصد کے لئے وہ حصہ بے کار اور وہ یہ ہے کہ سودا نے اس مطلع کے جواب میں خود بھی ایک مطلع کہا ؂

ابر کہسار ہوں، جوں برق نکا ہے گا ہے —— (بحوالہ آب حیات) ؟

[اور نہ صرف اِس میں، بلکہ سودا کے دیوان میں شامل پوری غزل میں کوئی شعر ایسا نہیں ہے جس میں "آہے" کا قافیہ انہوں نے باندھا ہو، حالانکہ فیہ بہت ہی سامنے کا اور برجستہ ہے، اور سودا کو میر سوز کے مطلع سے اس قافئے کی سجھاوٹی بھی مل گئی تھی۔ مطلع میں نہ سہی، کسی اور شعر میں یہ باندھا سکتا تھا۔] اور اگر سودا کا اعتراض اِسی لفظ پر نہ ہوتا تو انہیں یہ قافیہ باندھنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے تھا۔ مگر انہوں نے اس طرف مطلق اعتنا ۔ —— خود حزیں کی اصل غزل جس کی زمین میں ان دونوں صاحبوں نے یہ غزلیں کہیں، اُس کا مطلع بھی اس قافئے سے خالی ہے ؂

می گرفتیم بجاناں سر راہے، گاہے　　او ہم از لطفِ نہاں داشت نگاہے گاہے

ں کے بعد آزاد لکھتے ہیں کہ اُسی صحبت میں کسی نے سودا سے میاں جراَت کی طرف اشارہ کیا (جو اُن دنوں نوعمر تھے) کہ انہوں نے بھی کچھ کہا ہے۔ انچہ ان کا شعر (مطلع) بھی نقل کیا ہے، جسے سن کر سودا نے تحسین کی ؂

سرسری اُن سے ملاقات ہے گا ہے گا ہے　　غیر کی بزم میں گا ہے، مرا ہے گا ہے

در پھر آزاد نے حسبِ عادت اپنی طرف سے ظفر کا شعر بھی (ذوق کا بتا کر) پیش کیا ہے ؂

اِس طرف بھی تجھے لازم ہے نگا ہے گا ہے　　دم بدم، لحظہ بہ لحظہ نہیں، گا ہے گا ہے

ان دونوں مطلعوں میں، جیسا کہ ظاہر ہے، "آہے" کا قافیہ نہیں ہے۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ نہ صرف سودا کو "آہے" پر اعتراض تھا بلکہ خود آزاد بھی ہی سمجھتے تھے کہ سودا کو اسی پر اعتراض تھا، اور یہ کہ واقعی یہاں یہ قابلِ اعتراض ہے ؟

بہر صورت، اس تمام بحث کا حاصل محض ایک قیاس پر مبنی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ شیرانی کا مذکورہ بالا دعویٰ بھی محض قیاسی ہی ہے۔ اب یہ قارئین ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کس کا قیاس درست ہو سکتا ہے، یا یہ کہ دونوں ہی کی قیاس آرائی غلط ہے۔ اس موضوع پر اگر کوئی اور صاحب بھی میری رہنمائی کریں تو میری ممنونیت کا باعث ہو گا۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں

۱؎ اقبال نے یہ قافیہ اپنے ایک فارسی قطعے میں باندھا بھی ہے ؂ وادی عشق بسے دور و دراز است ولے ؂ طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

ماہر القادری

مدح ومناقب

سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

صدیقؓ آفتاب، عمرؓ ماہتاب ہے — عثمانؓ حیا کی جان، علیؓ بوتراب ہے
اللہ رے! فراستِ مومن کا ارتقا — رائے عمرؓ مطابقِ وحی و کتاب ہے
فاروقؓ جا رہے ہیں مدینہ سے سوئے شام — اس شان سے کہ فتح و ظفر ہم رکاب ہے
خادم سوار اور خلیفہ پیادہ پا — اس حسنِ سادگی کا بھلا کیا جواب ہے
اسلام میں عمرؓ کے ہے اک شانِ امتیاز — یہ حاصلِ دعائے رسالت مآبؐ ہے
وہ زندگی کہ جس پہ فرشتوں کو رشک آئے — اور اس پہ آخرت کا غم بے حساب ہے
جس دل میں جتنی کھوٹ ہے جس ذہن میں فساد — اتنا ہی اس طرف سے اُسے اجتناب ہے

ماہر! رہے گی سطوتِ فاروقؓ شمعِ راہ
جب تک جہاں میں کشمکشِ انقلاب ہے

سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

یہ جامعِ قرآں ہیں، عثمان غنیؓ ہیں — اللہ کے مقبول ہیں، محبوبِ نبیؐ ہیں
صدیقؓ ہوں فاروقؓ کہ عثمانؓ و علیؓ ہوں — یہ لوگ تو اللہ کی آیاتِ جلی ہیں
ایمان و حیا جود و سخا ہو کہ مروت — دیباچۂ اخلاق کا عنوان یہی ہیں
جنت کی بشارت کے سزاوار ہیں کتنے — اللہ کے بندے تو زمانے میں سبھی ہیں
دل ذکرِ خدا میں ہے زہے شانِ شہادت — آنکھیں ہیں کہ قرآں کے حروفوں پہ جمی ہیں
جس روز خلیفہ کو خود امت نے کیا قتل — اس دن سے اخوت کی حدیں ٹوٹ گئی ہیں
اے جانِ وفا! یثرب و حبشہ کے مہاجر — راہیں ترے قدموں کے نشاں ڈھونڈ رہی ہیں

امت کے امیں، خویشِ نبیؐ، صاحبِ نورین
یہ نسبتیں، یہ عزتیں اللہ نے دی ہیں

دینی مسائل اور اضطرار

محمد نواز - ایم اے

پاکستان کے صدارتی انتخاب کے موقع پر جماعت اسلامی پاکستان کی مجلس شاورت نے جو قرارداد پاس کی تھی۔ اس سے علمی حلقوں میں یہ
بحث نکلی ہے کہ آیا شریعت کی حرام کی ہوئی چیزوں میں بعض ایسی بھی ہیں جن کی حرمت اکراہ، اضطرار یا شدید ضرورت کے وقت ساقط ہو
ہے یا ساری حرمتیں ابدی، اٹل اور قطعی ہیں کہ جن سے ان کی حرمت کسی حال بھی الگ نہیں ہو سکتی، یہ ایک نہایت سنجیدہ علمی سوال تھا
س بات کا متقاضی تھا کہ اس پر سنجیدگی اور عالمانہ وقار کے ساتھ گفتگو کی جاتی۔ لیکن افسوس ہے کہ بزرگانِ دین کے ایک مختصر گروہ نے
اختلاف کا جس انداز اور جس زبان میں اظہار کیا ہے، اس نے حسن ظن، اکرام مسلم، اور رواداری کے ان سارے مسلمہ ضابطوں کو
ل کر کے رکھ دیا ہے جن کی تبلیغ اور تلقین میں ان بزرگوں کی عمریں بیت گئی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوس اور حیرت کا یہ مقام ہے کہ دین و
حیت کے ان مسلمات کی پامالی، ان کے ہاتھوں عین اس وقت ہوئی ہے جب وہ دنیا کو سمجھا رہے تھے، کہ دین کی ساری حرمتیں ابدی اور
ی ہیں اور کسی میں بھی ہرگز کوئی استثنا نہیں اور انہی حرمتوں میں ایک مسلمان کی آبرو کی حرمت بھی شامل تھی، لیکن نہ معلوم ان بزرگوں
بلا میں اس شخص کی عزت اور آبرو اب کیسے مباح ہو گئی ہے، جس شخص کے علم و دیانت کی کل یہ حضرات قسمیں کھایا کرتے تھے، آج وہی
س ان کے نزدیک جاہل، بددیانت اور اقتدار کا حریص ہے، کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب انہی قابل احترام بزرگوں میں سے ایک
رگ نے تحریر فرمایا تھا:-

" میں تو نہیں جانتا کہ مودودی صاحب نے کہاں پڑھا ہے اور کیا پڑھا ہے، لیکن اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ نہایت
ین، نہایت قابل آدمی ہیں اور نہایت وسیع النظر عالم ہیں۔ ان کا مرتبہ صرف اسی پہلو ہی سے اونچا نہیں ہے کہ وہ جدید علوم و افکار
نہایت وسیع نگاہ رکھتے ہیں اور ایک بلند پایہ انشا پرداز ہیں بلکہ ان کی اصلی خوبی یہ ہے کہ وہ کتاب و سنت پر نہایت گہری اور وسیع نظر
رکھتے ہیں، قرآن کا انہوں نے ایک اسکالر کی طرح مطالعہ کیا ہے اور برابر اس پر تدبر کرتے رہتے ہیں، صرف بیضاوی اور جلالین " بقدر نصاب"
پڑھ کر مفسر نہیں بن بیٹھے ہیں انہوں نے حدیث کی تمام مستند کتابوں کو حرف حرف نہایت غور و فکر کے ساتھ پڑھا ہے، صرف ان کے " دورہ" پر
قناعت نہیں فرمایا، اسی طرح فقہ، اصول، سیرت، اور رجال کی تمام ضروری کتابیں ان کی نگاہوں سے گزری ہوئی ہیں ......
...... وہ عربی زبان کو عالمانہ طور پر سمجھتے ہیں، حاطب اللیلوں کی طرح ہوائی تیر تکے نہیں چلاتے ...... پھر کام کو وہ جس ذمہ داری
کے ساتھ کرتے ہیں، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی تقریر بھی اس وقت تک کرنا پسند نہیں کرتے، جب تک
اس کے لئے اچھی طرح تیاری نہ کر لیں ___ اگر ایک ایسے شخص پر بھی کتاب و سنت کے علوم کے بارے میں ہم اعتماد نہیں کر سکتے تو پھر میں نہیں
سمجھ سکتا کہ کتاب و سنت کے علم کے بارے میں اس ملک میں کسی شخص پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔" (مولانا اصلاحی۔ تنقیحات ۱۴۲)

آج یہی بزرگ مولانا مودودی کو بوالہوس اور نجانے کیسے کیسے القاب اور خطابات سے نواز رہے ہیں، کل انہی بزرگوں نے عقیدت واحترام سے ان کے ہاتھ "چومے تھے" اور اُن کا گریبان پکڑ کر منصب امارت پر لا بٹھایا تھا — اور مولانا مودودی کو یہ خراج تحسین پیش کرنے والے بھی یہی بزرگ تھے :—

"اس کے برعکس ان لوگوں کو دیکھیے، جن پر خانقاہی طریق تربیت کا پرچھاواں بھی نہیں پڑا ہے میرا اشارہ مولانا ابوالّلیث صاحب اور مولانا مودودی کی طرف ہے انتہائی رنجدہ اور اشتعال انگیز رویہ کے مقابلے میں جس صبر جس رزانت، جس شرافت لہجہ اور کظم غیظ اور عفو عن الناس کا مظاہرہ کیا ہے کیا کوئی شخص، اس کا انکار کرسکتا ہے ؟ پھر بتایئے کہ اگر مودودی صاحب اور ابوالّلیث صاحب اپنے مرکیوں اور مرکا کے مقابل میں سخط اور رضا دونوں حالتوں میں سچائی اور انصاف پر قائم رہنے میں بہتر آدمی ثابت ہوسکتے ہیں۔ درانحالیکہ انہوں نے ایک دن بھی خانقاہی طریق پر تربیت نہیں پائی " (تنقیحات، ص۲۳۷)

محترم مولانا اصلاحی صاحب کی یہ رائے غالباً ۱۹۵۵ء تک رہی کیوں کہ یہ اقتباسات جس کتاب سے نقل کئے گئے ہیں اس کے دیباچے کے آخر میں خود محترم مولانا نے "جولائی ۱۹۵۵ء" تحریر فرما دیا ہے، لیکن انہوں نے ۱۹۵۶ء کے اوائل میں یہ خبر دی کہ مولانا مودودی کے طرز عمل اور طرز فکر میں حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ ان کی اس تبدیلی کے اسباب کیا تھے ؟ اس کے جواب میں مولانا اصلاحی لکھتے ہیں :—

"لیکن پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد مولانا کے طرز فکر اور طرز عمل میں بڑی نمایاں تبدیلی واقع ہوگئی۔ یہ تبدیلی کچھ تو حالات کی تبدیلی کے طور پر واقع ہوئی اور اس کا واقع ہونا ضروری تھا۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ وہ حالات کی نسبت سے کہیں زیادہ بدل گئے ہیں۔ یہاں وہ سیاسی طرز سے سوچنے اور اسی طور پر کام کے نقشے بنانے لگے۔ ان کے اقدار اور پیمانے بھی آہستہ آہستہ بدلنے لگے یہ پتہ خدائے علام الغیوب ہی کو ہے کہ اس تبدیلی میں اصل دخل کس چیز کو ہے، ممکن ہے پاکستان میں اُن کو ایک روشن سیاسی مستقبل کی جھلک دکھائی دی ہو۔ یہ گمان اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو قومی اور بین الاقوامی دونوں ہی میدانوں میں ضرورت اور حقیقت سے زیادہ اہمیت دینے لگے تھے، ان کے پاس بیٹھنے والوں نے بھی ان کو غلط فہمیوں میں مبتلا کیا اور پامسٹری کے ایک ماہر صاحب نے بھی ان کو سبز باغ دکھائے۔ (الفرقان ص۳ شوال ۷۵ھ)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا مودودی کو گمراہ، جاہل اور سادہ لوح ثابت کرنے کے لئے مولانا اصلاحی صاحب کے پاس کتنے وزنی، کتنے ٹھوس اور کس قدر جاندار دلائل ہیں[1] ؟

---

[1] مولانا اصلاحی فرماتے ہیں :- مولانا مودودی کے صبر وضبط اور سکون واطمینان کا جب بھی میں نے کوئی اندازہ لگایا تو ہم ہمیشہ اس سے کچھ زائد نکلے، خود اس بیان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہ ہوتا تھا کہ اس کا مصنف ابھی ابھی ایک طویل قید تنہائی سے نکلا ہے اور گذشتہ رات ہی کو اسے ایک سخت قسم کی اعصابی جنگ سے سابقہ پیش آچکا ہے، نہ غصہ نہ جھنجلاہٹ نہ تلخی اور نہ درشتی بلکہ اس کی بجائے وہی باوقار انداز، سنجیدہ طرز بیان، ٹھوس دلائل اور ٹھنڈا طریق استدلال۔ پس یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیل کی چار دیواری میں نہیں بلکہ اپنی لائبریری کی پُرسکون فضا میں بیٹھ کر یہ بیان لکھا ہے۔ شاید یہ اسی تاثیر کا نتیجہ ہے کہ جب بھی باہر جانے سے قبل مولانا سے رخصت ہونے اور ان کا تحریری بیان واپس کرنے کے لئے ان کے پاس گیا تو مصافحہ کے ساتھ ہی میں نے بے ساختہ ان کے ہاتھوں کو چوم لیا جن میں اللہ تعالیٰ نے اظہار حق کی کیسی قدرت ودیعت فرمائی"

(بروایت جناب سلطان احمد) بحوالہ چراغ راہ احتجاج نمبر ص ۱۰

(بقیہ صفحہ ۱۸ پر)

پاکستان بننے کے بعد مولانا مودودی نے مولانا اصلاحی کے ساتھ ۲۰ ماہ تک جیل کاٹی مارچ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۵ء تک مولانا دوبارہ قید میں رہے
ء سے ۱۹۵۸ء تک کا عرصہ اندرونی خلفشار میں گذرا جو زیادہ تر مولانا اصلاحی صاحب ہی کے ساتھیوں کا پیدا کردہ تھا۔ پھر مارشل لاء نافذ
گیا۔ اس سارے دور کے حالات خود مولانا اصلاحی ہم سب سے بہتر جانتے ہیں۔ خود ہی ارشاد فرمائیں کہ مولانا مودودی کو اپنا "روشن سیاسی
تبل" پہلی نظر بندی کے دوران نظر آیا تھا جب کہ مولانا اصلاحی صاحب بھی ان کے ساتھ تھے یا اُس وقت اُس مستقبل کی جھلک انہوں نے
ملی تھی، جب وہ پھانسی، عمر قید اور شاہی قلعہ کی اذیتیں برداشت کر رہے تھے، اور کیا مولانا مودودی کو اپنی سیاسی ترقی کے امکانات اس وقت
ئے تھے، جب خود جماعت اپنے اندرونی بحران کا شکار تھی اور خود مولانا کو اپنی امارت سے بھی استعفیٰ دینا پڑ گیا تھا۔ یا اس وقت انہیں اس مستقبل کا
ہوا تھا جب کہ مارشل لاء نے ملک کی ساری سیاسی سرگرمیوں کو ختم کر دیا تھا؟ ــــــ کیا ان حالات میں کوئی عقل مند انسان اس طرح کے
مغالطہ کا شکار ہو سکتا ہے جس کا مولانا اصلاحی ذکر فرما رہے ہیں؟ بدگمانی کی بنیاد پر اتنی بڑی بات گھڑ لینا مولانا اصلاحی جیسے خدا ترس انسان کے
ہرگز مناسب نہیں تھا اور غالباً اسی بدگمانی کی روشنی میں جب مولانا محترم نے جماعت اسلامی کی مجلس شاورت کی قرارداد پڑھی تو انہیں اس میں
بے زیادہ خطرناک بات جو نظر آئی وہ یہ تھی کہ جماعت اسلامی نے اپنے سیاسی مستقبل کو حسین تر اور روشن تر بنانے کے لئے دین کی حرمتوں کو ابدی
غیر ابدی میں تقسیم کر ڈالا ہے اور یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے، اس لئے اس فتنے کا سر کچلنے کے لئے وہ میدان میں آ گئے۔ اس بدگمانی نے انہیں اس
کے سوچنے کی ہرگز مہلت نہ دی کہ شریعت کی حرمتوں کے بارے میں ابدی اور "غیر ابدی" یا "قطعی" اور "غیر قطعی" کے الفاظ کے استعمال
سے جماعت اسلامی کی فی الواقع مراد کیا ہے؟ اور اگر اس تفریق و تقسیم کی شریعت میں واقعۃً گنجائش نہیں تو اس بات کا بھی جائزہ لے کر دیکھنا
بیے تھا کہ جماعت سے یہ غلطی کہیں سہواً تو سرزد نہیں ہوئی؟ کیوں کہ خود مولانا محترم ہی کا ارشاد ہے کہ:

"حق پر قائم رہنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک شخص سے کوئی غلطی صادر ہی نہ ہو۔ اس کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ متبع ہو اور
طالب طریقۂ جاہلیت نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اجتہاد میں غلطی کر جائے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی امر کو مسلمانوں اور اسلام
کے مصالح کے مطابق سمجھے فی الواقع وہ مصالح کے خلاف ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی امر کو روح دین کے مطابق خیال کر کے اختیار
کرلے اور اس کا گمان ہو کہ یہ کم از کم نعم البدعۃ کے حکم میں داخل ہے۔ لیکن اس کے بعد والے اس کے نقطۂ نظر سے متفق نہ ہو
سکیں اور اسے بدل ڈالیں" (تنقیحات صـ)

لیکن مولانا محترم اپنے ہی تحریر کردہ اصولوں کے برعکس صرف ایک شخص کے خلاف ہی نہیں بلکہ پوری جماعت کے بارے میں سوءِ ظن میں مبتلا
گئے وہاں تک کہ یہ بدگمانی شریعت کے ممنوعات میں سے تھی مگر اسے ایک بڑے شر ــــــ جماعت اسلامی ــــــ کا "سر کچلنے"
لئے گوارا فرمالیا۔ جماعت کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت دستیاب نہ ہی ہو جب بھی مولانا کے لئے غالباً یہ بات اب مباح ہو گئی ہے کہ وہ جماعت
رہنماؤں کی نیتوں کو کرید کر کچھ غلط قسم کے مفروضات قائم کر کے ان کے خلاف ایک نئی فرد قرارداد جرم تصنیف فرمائیں اور انہیں ملکہ

شیہ ص۱۷ ـ بعض "ذہین" لوگوں نے تو یہ بات تک باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ مولانا مودودی کو "دماغی دورے" پڑتے ہیں۔ کیونکہ
ں میں مولانا کو کچھ اس طرح کی ذہنی اذیتیں پہنچائی گئی ہیں کہ جن کی وجہ سے مولانا محترم کو "دماغی عارضہ" لاحق ہو گیا ہے ــــ اس لئے ان کے فکر و
ج میں "عظیم تبدیلی" واقع ہو گئی ہے۔

ختم نبوت اور سنت کا انکار کرنے والوں سے بھی زیادہ خطرناک بلکہ محرف دین ثابت کریں۔ لیکن اس کے باوجود اگر یہ حضرات کچھ نیاوہ سخت جان نکلیں تو ان کے اس مقصد پر حملہ کر کے اس کی صداقت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر دئے جائیں جو ان کی تحریک کا حقیقی محرک ہے اور جس کی وجہ سے خدا نے ان کی تنظیم کو قوت و شوکت کی دولت سے نوازا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ :-

"یہ بات تو ٹھیک ہے کہ اسلام صرف مسجد کا دین نہیں ہے بلکہ حکومت کا بھی دین ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ اسلام کی دعوت ہر معاشرے اور ہر ماحول میں حکومت الٰہیہ یا انقلاب قیادت کی دعوت سے شروع ہوتی ہے۔ یہ بڑی ہی شدید غلط فہمی ہے بلکہ شدید قسم کی جہالت ہے، جس کی جس قدر جلد اصلاح ہو جائے اچھا ہے" (میثاق جون ۶۲ء)

اس اقتباس میں نہایت محتاط طریق پر اقامت دین کے کام کو شدید جہالت سے تعبیر کیا گیا ہے اب تازہ شمارہ میں یہ "شدید جہالت" ترقی کر کے "خبط" تک پہونچ گئی ہے، فرماتے ہیں :-

"ہمارا خیال ہے کہ ہر آدمی انبیاء کے طریقے پر پورے دین کو لے کر نہیں اٹھ سکتا بلکہ سچ پوچھئے کہ ہم تو اس کو ایک خبط سمجھتے ہیں (میثاق مارچ) سردست اس بحث کو جانے دیجئے کہ انبیاء کے طریقے پر پورے دین کو لیکر اٹھنا ہر شخص کی ذمہ داری ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہر شخص کے لئے خود شریعت نے عملی تدابیر کا کیا ضابطہ تجویز کیا ہے؟ اس کی اگر تفصیل معلوم کرنی ہو تو خود مولانا محترم ہی کی تصانیف میں سے "دعوتِ دین اور اس کا طریق کار" "اسلامی ریاست۔ اطاعت کی شرائط و حدود" "تفہیمات، توضیحات، اور اُن کے ساتھ ساتھ مولانا کی وہ تحریریں مطالعہ فرمائیں جو جماعت کی رودادوں میں درج ہیں۔ اس لئے اس مسئلہ پر وقت صرف کرنا بھی تحصیل حاصل ہے کہ سورہ شوریٰ کی آیت شرع لکم من الدین ما وصّا بہ نوحاً ... الآیہ میں "کُم" کے مخاطب سارے مسلمان ہیں یا نہیں ان بحثوں کو میثاق کے صاحب علم بزرگ ہم سب سے زیادہ جانتے ہیں۔

پھر یہ بات بھی اب کوئی راز نہیں کہ ان اقتباسات میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ محض نظری اور اصولی ہے اور اس کا فی الحقیقت کوئی متاثر الیہ نہیں۔ انداز اور پیرایۂ بیان خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، ان استنادات کا صاف اور واضح مطلب بس یہ ہے کہ :

"اقامت دین کا وہ کام جو جماعت اسلامی کر رہی ہے وہ ناقابل اعتماد ہے، شدید جہالت ہے اور ایک قسم کا خبط ہے"

اس کے علاوہ کوئی دوسرا مطلب مولانا اصلاحی صاحب کی بے شمار تحریروں کی موجودگی میں ہرگز متعین نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو کھل کر کہنا پڑا کہ :

- "جماعت اسلامی کے متعلق تو ہماری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ اس وقت اسلام کے لئے اس ملک میں اس سے زیادہ مضر جماعت کوئی نہیں ہے"
- "اس نازک موقعہ پر اس بات کو بھی یاد رکھیئے کہ دین اور عقل دونوں سے بعید تر جماعت اس ملک میں کوئی ہے تو جماعت اسلامی ہے"

(میثاق ص۷ دسمبر)

میثاق کے قابل احترام بزرگ نے مولانا مودودی یا جماعت اسلامی کی جس لب ولہجہ میں خدمت فرمائی ہے وہ ان کے اپنے علم و مرتبہ سے بہت فروتر ہے۔ نیتوں کو کریدنا، غلط مفروضات کی عمارتیں تعمیر کرنا اور بے بنیاد اتہامات[1] لگانا اور پھر ان کی بنیاد پر خدا کے مخلص بندوں کے

---

[1] مولانا محترم نے میاں طفیل محمد پر یہ اتہام لگایا ہے کہ انہوں نے مس فاطمہ جناح کو نعوذ خدا سے تشبیہ دی ہے ... پھر اس پر مزید تبصرہ - باقی ص۱۹ پر

دین، ایمان اور ان کی عزت حد سے بڑھ کر جارحانہ حملوں کو اپنا شعار بنا لینا اس آسمان کے نیچے خدائے قادر و توانا کی اس زمین پر ایک بہت بڑی جسارت ہے اور یہ جسارت اس وقت اور بھی سنگین ہو جاتی ہے، جب کہ خدا کے یہ بندے ان کے ایک ایک مفروضے اور ان کے ایک ایک الزام اور اتہام سے واضح اور کھلے الفاظ میں اپنی برأت کا اعلان کر چکے ہوں۔

مولانا اصلاحی صاحب، مولانا مودودی یا جماعت اسلامی کے خلاف جب بھی قلم اٹھاتے ہیں ان کا انداز یہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے سارے دلائل کی بنیاد چند من گھڑت مفروضات سوءِ ظنی پر رکھتے ہیں۔ یہی انداز انہوں نے "حکمت عملی" کی بحث میں اختیار کیا اور اسی انداز کو انہوں نے حرمتوں کی اس تقسیم کے باب میں بھی اختیار کیا ہے۔

محترم مولانا امین ... ن اصلاحی مجلس مشاورت کی قرارداد کے جن الفاظ پر زیادہ برہم ہیں وہ یہ ہیں:—

"شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں، ان میں بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں تبدیل نہیں ہو سکتی اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقع پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے۔"

اس پر مولانا محترم نے جن الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں:۔

"شریعت کی حرمتوں میں ابدی اور غیر ابدی، قطعی اور غیر قطعی کی کوئی تفریق و تقسیم نہیں ہے سب حرمتیں ابدی اور قطعی ہیں یہ شیطان کا اٹھایا ہوا فتنہ ہے۔ اگر آج اس کا سر نہ کچل دیا گیا تو شیطان اس حربے سے کام لے کر ساری شریعت کو تاراج کر کے رکھ دیگا۔" (میثاق نومبر)

قرارداد میں جو بات کہی گئی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ بعض حرمتیں تو ایسی ابدی اور قطعی اور اٹل ہیں جن کی حرمت کسی حال بھی اُن سے الگ نہیں ہو سکتی اور بعض حرمتیں ایسی ہیں جن کی حرمت اگرچہ عام حالات میں تو ابدی اور قطعی ہے لیکن اضطرار اور اکراہ یا شدید ضرورت کی وجہ سے ان کی حرمتیں ان سے مرتفع ہو جاتی ہے۔ ابدی اور قطعی کے الفاظ جن معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں، وہ یہ ہیں کہ بڑے سے بڑا اکراہ اور شدید سے شدید اضطرار حرمتوں سے اُن کی حرمت ہرگز الگ نہیں کر سکتا۔ لیکن حرمتوں کی ایک دوسری قسم ایسی بھی ہے جو اضطرار، یا اکراہ یا شدید ضرورت کے موقع پر ضرورت کی حد تک سقوط قبول کرتی ہیں۔ لیکن آپ غور فرمائیں کہ مجلس مشاورت نے حرمتوں کی اس دوسری قسم کے بارے میں "غیر ابدی" اور "غیر قطعی" کے الفاظ استعمال نہیں کئے ——— کیوں؟ اس لئے کہ حرمتوں کی یہ قسم بھی عام حالات میں ابدی اور قطعی ہی ہوتی ہے، اس میں اگر عارضی طور پر استثنا کی صفت پیدا ہوتی ہے تو بعض اضطرار، یا شدید ضرورت ہی کی وجہ سے نہ کہ غیر ابدی یا غیر قطعی ہونے کی وجہ سے۔ اس لئے مجلس مشاورت نے ابدی اور قطعی کے الفاظ تو استعمال کئے ہیں لیکن اس لئے یا جماعت کے کسی بھی رہنما نے اپنی کسی تقریر یا تحریر میں

(بقیہ حاشیہ ص۱۸) ان الفاظ میں فرماتے ہیں: "جب کسی کی غیرت ایمانی مردہ اور بصیرت روحانی سلب ہو جاتی ہے تو اس کو اس طرح کے عجائب نظر آتے ہیں" (ملاحظہ ہو میثاق جنوری) اسی طرح غالباً مدیر تجلی کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:۔ "اس جماعت سے وابستہ بعض رسائل مجھے ہمیشہ اپنی گالیوں سے نوازتے بھی رہتے ہیں۔ لیکن میں نے ان کا بھی کبھی نوٹس نہیں لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان رسالوں کا جماعت اسلامی پاکستان سے شریفانہ معاہدہ ہے کہ وہ جتنی گالیاں میثاق کے ایڈیٹر کو دیں گے فی گالی کے حساب سے پاکستان کی جماعت ان کے اتنے ہی پرچے بیچے گی۔ یہ ان کے معاش اور پیشے کا معاملہ اور میں دوسروں کے پیشے کے معاملے میں مرزا غالب کی طرح بڑا روادار واقع ہوا ہوں۔" (میثاق فروری ص۱۵)

"غیر ابدی" یا "غیر قطعی" کی قسم کا کوئی لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔ مجلس مشاورت کا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ حرمتیں دو قسم کی ہیں، ایک وہ جن کی حرمت کسی بھی وجہ سے ہرگز زائل نہیں ہوتی اور دوسری وہ جن کی حرمت ضرورت اور اضطرار کے موقع پر حلت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ حرمتیں بھی عام حالات میں ابدی اور قطعی ہی ہوتی ہیں۔

یہ صاف اور سیدھی بات تھی جس سے کوئی صاحب علم اختلاف کی جسارت نہیں کر سکتا تھا، لیکن مولانا اصلاحی صاحب نے اس کی بھی تردید کر ڈالی۔ فرماتے ہیں کہ کسی بھی حرام چیز سے اس کی حرمت ہرگز الگ نہیں ہو سکتی۔ بڑے دعوے سے ارشاد ہوتا ہے:۔

"شریعت کی کوئی حرمت حکمت عملی، یا عملی ضرورت یا شدید ضرورت یا مصلحت کے عذرات پر حلت میں تبدیل نہیں ہو جاتی بلکہ اکراہ اور اضطرار کی حالت میں اس کو حرام سمجھتے ہوئے احتیاط اور بے دلی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھا لینے کی رخصت ہو جاتی ہے"
(ص۲۰ میثاق نومبر)

ان سطروں میں یہ بات بصراحت بیان کی گئی ہے کہ "اضطرار کی حالت میں اس ــــ (حرام) ــــ کو حرام سمجھتے ہوئے احتیاط اور بے دلی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھانے کی رخصت حاصل ہو جاتی ہے گویا ان کے نزدیک اضطرار کی حالت میں بھی کوئی حرمت سقوط قبول نہیں کرتی۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"اکراہ و اضطرار کے معنے شدید ضرورت کے نہیں ہیں، جو شخص بھی جب چاہے شدید ضرورت کے عذر پر حرام کو حلال بنا لیا کرے بلکہ بے بسی کی اس حالت کے ہیں جس میں گھر جانے کے بعد آدمی کے لئے دو حراموں میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے سوا کوئی راہ فرار باقی نہ رہ جائے۔ اس صورت میں شریعت نے اجازت دی ہے کہ اس حرام سے فائدہ اٹھالے جو دونوں میں مقابلۃً اہون ہو"
(میثاق نومبر)

اس سلسلے میں مولانا کا یہ ارشاد بھی نگاہ میں رہے کہ:۔

"اضطرار و اکراہ کو شدید ضرورت سے تعبیر کرنا اور شرعی حرمتوں کو ابدی اور غیر ابدی یا قطعی اور غیر قطعی کے دو الگ الگ خانوں میں بانٹ دینا محض تعبیر کی عامیانہ غلطی نہیں ہے بلکہ اسلامی شریعت کے خلاف دیدہ و دانستہ ایک ایسی شرارت ہے جس کی اگر بروقت بیخ کنی نہ کی گئی تو یہ فتنہ بن کر بہت جلد پوری شریعت کو اپنے لپیٹ میں لے لے گی" (میثاق نومبر ص۵)

مولانا محترم کے ان ارشادات کا ماحصل یہ ہے کہ:۔

● ــــ حرمتوں کی ابدی اور غیر ابدی کی تقسیم اور تفریق غلط ہے البتہ ان کو اہون اور غیر اہون میں تقسیم کیا جا سکتا ہے بالفاظ دیگر شریعت کی کوئی حرمت ہرگز سقوط قبول نہیں کرتی۔ پھر اہون کے اختیار کرنے کا فیصلہ بھی مضطر کا اضطرار کرتا ہے اس سلسلے میں "شدید ضرورت" کے لفظ کا استعمال اسلامی شریعت کے خلاف "دیدہ و دانستہ" ایک شرارت ہے۔

● شدید ضرورت کو "اضطرار" کے بجائے ہرگز استعمال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اضطرار کا مطلب بے بسی کی وہ حالت ہے جس میں گھر جانے کے بعد آدمی کے لئے دو حراموں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔

مولانا محترم کی ان دونوں باتوں پر اچھی طرح غور کر لیجئے اور پھر فیصلہ دیجئے کہ ان سے کوئی ایک بات بھی ایسی ہے جو آنکے علم و مرتبہ کے شایان شان ہو؟

پہلا سوال یہ ہے کہ آیا شریعت کی حرمتوں میں بعض ایسی ہیں جن کی حرمت کسی وقت اضطراراً مرتفع ہو سکتی ہے۔ مجلس مشاورت کا جواب
ں" میں ہے لیکن مولانا اصلاحی اپنے نومبر ۶۴ء کے میثاق میں اس کے جواب میں "نہیں" فرماتے ہیں۔ ان کے نزدیک حرام ہر حال میں حرام ہی رہے گا
ی حرمت کسی اضطرار سے مرتفع نہیں ہوگی۔

ہم اپنی علمی مائیگی کے اعتراف کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ مولانا کا یہ ارشاد ناقص اور نامکمل ہے اور ہم باصرار کہتے ہیں کہ بات وہی حق ہے
بس مشاورت نے بیان کی ہے اس سلسلے میں اگر آپ اصول شاشی، نور الانوار، حسامی اور مسلم الثبوت اور قدوری وغیرہ کے متعلقہ ابواب نکال
بکھیں تو آپ بھی مجلس مشاورت ہی کی بات کو صحیح اور درست پائیں گے، ان کتابوں میں سے چند ایک کے اقتباسات یہاں درج کئے جاتے ہیں جن
مطالعہ سے قارئین خود فیصلہ کر سکتے ہیں :-

● اصول شاشی میں ہے کہ :- واما الرخصة ..... انوعها مختلفة لاختلاف اسبابها وهى اعذار العباد فى العاقبة تؤول الى نوعين احدهما الفعل مع بقاء الحرمة بمنزلة العفو فى باب الجناية وذلك نحو اجراء كلمة الكفر على اللسان مع اطمينان القلب ...... وحكمه انه لو صبر حتى قتل يكون ماجوراً لامتناعه عن الحرام تعظيماً لنهى الشارع عليه السلام والنوع الثانى تغيير صفة الفعل بان يصير مباحاً .... وذلك نحو الاكل وعلى كل الميتة وشرب الخمر وحكمه انه لو امتنع تناوله حتى قتل يكون اثماً لامتناعه من المباح وصار كقاتل نفسه یعنی رخصت کی مختلف اسباب کی بنا پر مختلف قسمیں ہوتی ہیں اور ان اسباب کا دارومدار
انجام کار کے لحاظ سے بندوں کے عذرات پر ہوتا ہے اور اس کی دو قسمیں بنتی ہیں، ایک قسم وہ ہے جبکہ حرام اختیار کرنے کی صورت
میں اس کی حرمت باقی رہتی ہے جیسا کہ باب الجنایہ میں معاف کر دینا ہوتا ہے اور اس پہلی قسم کی مثال یہ ہے جیسے اکراہ کے
وقت اطمینان قلب رکھتے ہوئے زبان سے کفر کا کلمہ ادا کرنا .... اس کا حکم یہ ہے کہ اگر مجبور شخص جبر کرنے
یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا جائے تو اسے اجر ملے گا کیونکہ وہ شارع علیہ السلام کے حکم کی خلاف ورزی سے تعظیماً باز رہا ہے :-

رخصت کی دوسری قسم وہ ہے جس میں حرام فعل کی صفت اباحت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال حالت اضطرار میں
مردار کا کھانا شراب کا پینا ہے اگر کوئی مضطر اپنی جان بچانے کی خاطر یہ حرام چیزیں استعمال نہ کرے اور مر جائے تو وہ ایک مباح
شے کے استعمال نہ کرنے کی وجہ سے گناہگار ہوگا۔ اور خودکشی کرنے والے شخص کی طرح خیال کیا جائے گا۔

● اسی طرح نور الانوار میں اکراہ کی مختلف شکلیں اور اس کی مختلف اقسام کی تشریح کرنے کے بعد یہ الفاظ ملتے ہیں :-
والفرق بين الاباحة والرخصة ان فى الرخصة لايباح ذالك الفعل بان ترتفع الحرمة الخ یعنی
اباحت اور رخصت میں یہ فرق ہے کہ رخصت میں کسی فعل پر عمل کرنے سے اس کی حرمت مرتفع نہیں ہوتی البتہ اس پر عمل کرنے سے
اس کا گناہ نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس اباحت میں حرام فعل کی حرمت ختم ہو جاتی ہے :

● مسلم الثبوت میں رخصت کی چار قسمیں بیان کی گئی ہیں جن میں سے پہلی یہ ہے :-
الاول ما استبيح مع قيام المحرم وقيام حكمه كاجراء كلمة الكفر على اللسان عند الاكراه وفيه

العزیمۃ اعلیٰ ولوصلت کان ماجوراً یعنی رخصت کی پہلی قسم کی رو سے کسی حرام فعل پر عمل کرنا تو جائز ہو جاتا ہے لیکن اس کا حکم اور اس کی صفت برقرار رہتی ہے، جیسے زبان سے کلمۂ کفر ادا کرنا اور اس میں عزیمت کی راہ اختیار کرنا اولیٰ ہے اور اس صورت میں اگر کوئی مر جائے تو اجر پائے گا۔

مسلم الثبوت کی چوتھی قسم یہ ہے:- والرابع ما سقط مع العذر مع مشروعیتہ فی الجملۃ ویسمی رخصۃ اسقاط کسقوط حرمۃ المیتۃ للمضطر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی چوتھی قسم "رخصت اسقاط" کی ہے، جس میں کسی حرام چیز کے جائز ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی حرمت کا حکم بھی ساقط ہو جائے جیسے مضطر شخص کے لئے مردار کی حرمت ساقط ہو جاتی ہے"

" اصول فقہ کی تقریباً ہر چھوٹی بڑی کتاب کے اندر یہ تقسیم موجود ہے اس سلسلے میں تفسیر ابن کثیر کی یہ صراحت بھی پیش نظر رہے:-

" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غرض ایسے وقت میں خدا کی مہربانی اور نوازش سے یہ حرام اس کے لئے حلال ہے۔ حضرت مسروقؒ فرماتے ہیں اضطرار کے وقت بھی جو شخص حرام چیز نہ کھائے اور مر جائے وہ جہنمی ہے۔ (جلد ا صد ۲۲۔ مترجم)

ان حوالوں سے یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ جہاں ایسی ابدی اور دائمی حرمتیں ہیں جن سے ان کی حرمت کسی حال بھی ساقط نہیں ہوتی اضطراراً ان کے اختیار کرنے سے صرف گناہ مرتفع ہوتا ہے وہاں اس بات کی صراحت بھی موجود ہے کہ کچھ دوسری حرمتیں ایسی بھی ہیں جن کو اگر اکراہ شکل میں اختیار کیا جائے تو ان کی حرمت حلت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور گناہ بھی نہیں ہوتا اور بعض صورتوں میں ان پر عمل نہ کرنے سے الٹا گناہ ہوتا ہے اور سزا کا خدشہ بھی۔

ظاہر بات ہے کہ شریعت کی حرام کی ہوئی چیزوں سے حرمت کا ساقط ہو جانا اور ان کا اضطرار کی شکل میں تا بحدِ اضطرار حلت میں تبدیل ہو جانا اور بعض صورتوں میں ان پر عمل نہ کرنے سے گناہ اور سزا کا مستوجب ہونا اس بات کے ہرگز مستلزم نہیں کہ وہ حرام چیز حرام ہی رہے گی اور بس "اہون" سمجھ کر اختیار کیا جائے گا۔ لیکن مولانا اصلاحی صاحب کو صدارتی انتخاب کے فیصلے کے اعلان سے قبل تک تو اس بات پر اصرار تھا کہ شریعت کی حرمتوں میں سے کسی سے بھی ان کی حرمت ہرگز مرتفع نہیں ہوتی۔ یہ حرمتوں کی تقسیم بالتفریق شیطان کا پیدا کیا ہوا فتنہ ہے، لیکن جب دو جنوری کی شام اس فتنہ کا "سرکچل" دینے کا اعلان کیا گیا تو مولانا امین احسن اصلاحی نہایت فراخ دلی سے اور ایک فاتحانہ تمکنت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ:-

"یہ خیال آپ کے مفتی صاحب کا بالکل غلط ہے کہ قتل کی حرمت بھی ان حرمتوں میں سے ہے جو کسی حالت میں سقوط قبول نہیں کرتی، واضح رہے کہ انفرادی اضطرار میں بالعموم یہی صورت ہے کہ قتل ناحق کی حرمت ساقط نہیں ہوتی لیکن اجتماعی ــــ اضطرار کی بہت سی حالتیں ہیں جن میں قتل ناحق تو درکنار قتل مومن کی حرمت بھی ساقط ہو جاتی ہے اس کا ذکر قرآن، حدیث اور فقہ سب میں ہے۔ (میثاق جنوری)

مولانا محترم کی اس تصریح کے بعد حساب فرمایئے مجلس شاورت کی قرارداد پر کیا اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اگر آپ کو بلاوجہ "ابدی" اور "قطعی" کے الفاظ پر غصہ ہے تو کم از کم یہ بات تو ار۔ تقریباً متفق علیہ ہے کہ شریعت کی حرمتیں دو قسم کی ہیں ایک وہ جو کسی بھی صورت میں سقوط قبول نہیں کرتیں بلکہ ان کی حرمت اضطرار اور اکراہ کے درمیان ساقط ہو جاتی ہے ــــــــ اور یہی نقطۂ نظر جماعت اسلامی کی مجلس شاورت کا ہے۔ حد بس!!

اب مولانا اصلاحی صاحب کے دوسرے اعتراض کا جائزہ لے کر دیکھئے انہوں نے شدید ضرورت کی اصطلاح کے استعمال پر گرفت فرمائی

ہر کے میثاق میں مولانا شدید ضرورت کو اضطرار سے مختلف لفظ بتاتے ہیں اور اضطرار کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ اس حالت کو قرار دیتے ہیں، جس میں آدمی بغیر نے کے بجائے آدمی کے لئے دو حراموں میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے سوا کوئی راہ فرار باقی نہ رہے۔

لیکن یہ باتیں بھی مولانا نے صدارتی انتخاب کی کامیابی سے قبل فرمائی تھیں مگر فتح کا اعلان سننے کے بعد جنوری کے میثاق میں اپنی رائے میں ترمیم فرماتے ہیں:—

"میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ فقہا جو ضرورت کا لفظ استعمال کرتے ہیں یہ ان کی اپنی اصطلاح ہے اور اس سے مراد وہی چیز ہے جس کو قرآن میں اضطرار کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اضطرار کا مفہوم اردو میں ہرگز ضرورت یا شدید ضرورت سے ادا نہیں ہوتا" (میثاق جنوری)

یہ بات تو اب طے ہوگئی کہ فقہا نے ضرورت کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور فقہا کے استعمال کئے ہوئے معنوں میں اب بھی استعمال ہو سکتا ہے لیکن یہاں یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ اضطرار کے لفظ کے ہوتے ہوئے فقہا نے خواہ مخواہ ضرورت کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اضطرار کا مطلب صرف وہی ہے جو مولانا نے بیان فرمایا ہے؟ اور کیا یہ مفہوم عمل کی ساری صورتوں پر حاوی ہے۔ مثال کے طور پر مولانا فرماتے ہیں:—

"قلبی اعتقاد جو سقوط قبول نہیں کرتا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ظاہر اقرار کے سقوط سے اضطرار رفع ہو جاتا ہے" ص۱۱

محترم مولانا کے نزدیک اضطرار کی بس ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ ہے کہ مضطر بے بسی کی حالت میں دو حراموں میں سے کسی ایک کو اہون سمجھ کر اختیار کر سکتا ہے مگر مندرجہ بالا مثال کی صورت میں مضطر کے سامنے صرف ایک ہی حرام ہے اور وہ ہے منہ سے کلمۂ کفر نکالنا لیکن وہ دوسرا حرام کون سا ہے جسے ترک کر کے اس کو اختیار کیا جائے گا۔ اس صورت میں دوسری بات تو صرف یہ ہے کہ مومن ظاہری اقرار پر مصر رہے اور قتل ہو جائے تو کیا اپنے قتل کا اختیار کرنا مولانا کے نزدیک دوسرا حرام ہے۔ ہم تو جانتے ہیں کہ اس حالت میں مومن اگر قتل ہو جائے تو شہید ہوگا۔ (زندگی لاہور مارچ ۶۵ء)

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ علماء نے معمولی معمولی ضرورتوں کے پیش نظر پاسپورٹ پر تصویر کھچوانے کو جائز قرار دیا ہے اور نسخہ جات میں حرام اجزاء کے استعمال کی عام اجازت دے ڈالی ہے۔ ہومیوپیتھی کی کوئی دوائی بھی قطرۂ شراب سے پاک نہیں ہوتی لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لینے والے اس کے استعمال میں ہرگز قباحت محسوس نہیں کرتے اور دینے والے اس کو حلال اور طیب سمجھ کر دیتے ہیں اور اس کے بیچنے کو اپنی معاش کا پاکیزہ ذریعہ جانتے ہیں۔ اسی طرح سود کی ہر شکل حرام ہے لیکن استحسان ضرورت اور مصلحت مرسلہ کے اصول بیان کرنے والوں نے سود کی اس شکل کو جائز اور مباح قرار دیا ہے جو ایک ہمسایہ کسی دوسرے ہمسایہ سے روزمرہ کے معاملات میں ایک چھٹانک وزنی روٹی بطور قرض لیتا ہے اور پھر ڈیڑھ چھٹانک وزن کی روٹی واپس کر دیتا ہے۔

یہ اور اس طرح کی متعدد صورتوں پر مولانا اصلاحی کی اضطرار کی تعریف منطبق نہیں ہوتی۔ اس لئے یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ مولانا نے اضطرار کی جو تعریف فرمائی ہے وہ ناقص اور ادھوری ہے اور یا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مندرجہ بالا مسائل کی ساری صورتیں غلط ہیں۔ اب ظاہر بات یہ ہے کہ اس کا فیصلہ بھی اہل علم ہی کر سکتے ہیں چنانچہ اس سلسلے میں چند حوالے نقل کرتا ہوں جس سے اضطرار کی صحیح تعریف بھی معلوم ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ "ضرورت" اور "اضطرار" کا باہمی رشتہ بھی واضح ہو جائے گا۔ سب سے پہلے مولانا عروج قادری مدیر زندگی کا نقطۂ نظر تحریر کرتا ہوں:—

"اضطرار مجبوری کو کہتے ہیں اور اکراہ زبردستی کو ——— اکراہ میں کسی دوسرے شخص کی طرف سے زبردستی ضروری نہیں"
(زندگی۔ رامپور۔ مارچ ۶۵ء)

● امام رازی علیہ الرحمۃ ضرورت اور اضطرار کے مفہوم پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں :—

اضطر احوج والجئ وھو افتعل من الضرورۃ واصلہ من ضر روھو ضیق ۔ یعنی اضطر کے معنی ضرورت مند اور مجبور ہوا کے ہیں اور یہ لفظ ضرورت سے مشتق ہے، اس کی اصل "ضر" ہے جس کے معنی "ضیق" یعنی تنگی کے ہیں ۔ (الکبیر رازی ۔ جلد ۲ ص")

امام رازی "ضرورت" کی تشریح میں مزید فرماتے ہیں کہ ضرورت دو اسباب سے پیدا ہوتی ہے ایک اضطرار اور دوسرے اکراہ چنانچہ امام موصوف کے الفاظ یہ ہیں :— لما حرم اللہ تعالیٰ تلک الاشیاء استثناء عنہا حال الضرورۃ وھذہ الضرورۃ لہا سببان احدھما الجوع الشدید وان لا یجد ما کولا حلالا یسد بہ الرمق فعند ذالک یکون مضطرا ۔ الثانی اذا اکرہ علی تناولہ مکرہ فیحل تناولہ ۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو حرام قرار دے دیا تو ضرورت کے وقت ان میں استثناء پیدا کر دیا اور ضرورت دو اسباب کی وجہ سے ہوتی ہے ان میں سے ایک شدید بھوک ہے جب کہ کوئی حلال کھانے کو نہ پائے جس سے اپنی بھوک مٹا سکے تو اس انسان کو مضطر کہتے ہیں اور دوسرا سبب یہ ہے کہ جب کسی انسان کو حرام چیز کے کھانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے تو اس صورت میں بھی حرام کا کھانا اس کے لئے حلال ہو[illegible]

● امام رازی کے مندرجہ بالا قول کی تائید طبری کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ :—

قولہ فمن اضطر افتعل من الضرورۃ وغیر باغ نصب علی الحال من من فکانہ، قیل فمن اضطر لا باغیا ولا عادیا فاکلہ فھو لہ حلال وقد قیل ان معنی قولہ فمن اضطر فمن اکرہ علی اکلہ فاکلہ فلا اثم علیہ

یعنی "اضطر" ضرورت سے مشتق ہے اور "غیر باغ" مضطر کی کیفیت بیان کرنے کے لئے ہے گویا کہ یوں کہا جا رہا ہے کہ جو مضطر ہو اور نہ حد سے تجاوز کرے اور نہ سرکش ہو تو اس شکل میں اگر وہ حرام کھائے تو وہ حرام چیز اس کے لئے حلال ہو جائے گی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فمن اضطر سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی "مکرہ" حرام چیز کھائے تو اس کے کھانے میں اسے کوئی گناہ نہ ہوگا ۔ (طبری ج۔

ان تصریحات سے مندرجہ ذیل باتیں کھل کر سامنے آگئی ہیں کہ :

● ضرورت اضطرار سے مختلف چیز نہیں بلکہ ضرورت اصل ہے اور اضطرار اور اکراہ اس کی دو مختلف صورتیں ہیں ۔

● اکراہ میں کسی زبردست کی طرف سے دباؤ کا ہونا ضروری ہے ، لیکن اضطرار میں کسی دوسرے شخص کی طرف سے زبردستی ضروری نہیں

● اضطرار کی شکل میں یہ بھی ضروری نہیں کہ مضطر ہمیشہ دو حراموں سے ہی دوچار ہو اور ان میں سے صرف "اہون" کو اختیار کرے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا سابقہ صرف ایک ہی حرام سے پڑے اور جس کو اختیار نہ کرنے کی شکل میں اسے قتل ہونا پڑے تو اس شکل میں وہ صاحب عزیمت اور شہید کہلائے گا ۔ اور بعض اوقات شخصی یا اجتماعی زندگی میں شرعی نقطۂ نگاہ سے آسانیاں پیدا کرنے کے لئے کسی مفید کو گوارا کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے ، جیسے پاسپورٹ کے لئے فوٹو کا حاصل کرنا یا ہومیوپیتھی میں شراب کا استعمال وغیرہ ۔

ضرورت کا لفظ اتنا جامع ہے کہ صرف اکراہ اور اضطرار کی ان شکلوں پر ہی حاوی نہیں جو مولانا اصلاحی صاحب نے بیان فرمائی ہیں بلکہ مرض، نسیان، جہل، عام ابتلاء یا کسی فطری یا طبعی نقص وغیرہ کی بنا پر جو انفرادی یا اجتماعی زندگی کے میدان میں احتیاجات پیدا ہوتی ہیں جن کا اثر شرعی احکام پر پڑتا ہے ضرورت کا لفظ ان سب کے تقاضوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے ۔

جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے شاید ضرورت کے لفظ کو انہی معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں فقہاء نے الضرورات تبیح المحظورات کے قاعدے میں استعمال کیا ہے ۔ لیکن مولانا اصلاحی صاحب کو اس بات پر شدت اصرار ہے کہ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ ۔

،تو اس لفظ کو ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں یہ عام طور پر اردو میں معروف اور مستعمل ہے اور دوسرے اس لفظ کو استعمال کر کے دین
لاف دیدہ و دانستہ شرارت کی ہے۔

مجلس مشاورت کے ارکان کی نیت کے راز جاننے کا دعویٰ تو مولانا محترم ہی کر سکتے ہیں اور یا پھر علام الغیوب نیتوں کے راز جان سکتا ہے؟

اس ساری بحث سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا محترم نے جن بنیادوں پر مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی تحقیق اور تفسیق
مارت تعمیر کی تھی وہ کس قدر کمزور ہے۔ نومبر ۶۴ء میں مولانا نے حرمتوں کو اصولی اور غیر اصولی میں تقسیم کر کے اس بات کا انکار کیا تھا کہ کسی بھی حرمت کو
طرار سے حلت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ حرام بہر صورت حرام ہی رہے گا لیکن جنوری ۶۵ء میں تسلیم کر لیا کہ بعض حرمتیں ایسی بھی ہیں جن کی ان کی
ت بعض حالتوں میں ساقط یا زائل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح نومبر ۶۴ء میں مولانا محترم نے یہ بات فرمائی تھی کہ شدید ضرورت کے تحت کسی حرام چیز
حرمت کا سقوط دین کے خلاف دیدہ دانستہ ایک شرارت ہے لیکن جنوری ۶۵ء میں ضرورت کو اضطرار کے مترادف قرار دے کر تسلیم کیا کہ ضرورت تو
اصطلاح ہے اور اضطرار کے حکم میں داخل ہے۔ نومبر ۶۴ء میں جماعت اسلامی کا بڑا جرم تحریف دین تھا مگر جنوری ۶۵ء میں فرماتے ہیں کہ:—

"اصل سوال جس پر ان حضرات کو غور کرنا تھا وہ تو یہ تھا کہ صدر ایوب کے مقابل مس فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ جو جماعت اسلامی نے بعد از
طرار کیا وہ روئے شرع ٹھیک ہے یا نہیں؟ (جنوری ۶۵ء)

گویا اب حرمتوں کی تقسیم کا قضیہ بھی ختم "شدید ضرورت" کی اصطلاح بھی درست۔ اب جھگڑا صرف مس فاطمہ جناح کی حمایت کے جواز و عدم
ز کا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر مولانا اصلاحی صاحب خود اپنے موقف پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈال دیتے کہ آیا انہوں نے جس والہانہ شیفتگی کے ساتھ
ب صدر کی حمایت فرمائی ہے وہ ان کے حقیقت شرک اسلامی ریاست" اطاعت کی شرائط و حدود اور اسلامی ریاست۔ کارکنوں کے اوصاف میں
ہ شدہ اصول و نظریات کے عین مطابق ہے؟

اب ذرا مولانا محترم کے مندرجہ بالا سوال پر بھی غور کر لیں لیکن اس سے پہلے خود مولانا موصوف کی تحریر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرما لیں کیونکہ
ہیں اس مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے لئے ایک مختصر راہ اختیار کرنی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:—

"غیر منقسم ہندوستان میں جب کہ ہم نے اپنا دستور بنایا تھا اس وقت ہم نے انگریزی نظام کے ساتھ ہر قسم کے تعاون کو حرام قرار دیا تھا اس لئے کہ ملک کے سیاسی نظام کے اندر ہمارے لئے اس بات کی گنجائش موجود تھی کہ ہم اپنے نصب العین کے مطابق ملک کے نظام کو تبدیل کرنے کی جدوجہد کر سکتے تھے، پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم انگریزوں کی گاڑی پر قانع رہتے یا ملک میں اس نوعیت تبدیلی کے لئے جدوجہد کرتے جس نوعیت کی تبدیلی دوسری سیاسی جماعتیں پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن فرض کیجئے کہ اسی زمانہ میں نازیوں نے ہندوستان پر حملہ کر دیا ہوتا اور اس کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہوتا کہ ہندوستان پر جاپان یا جرمنی کا قبضہ ہو جائے گا اور ان کی حکومت میں ہمارے لئے نظام حق کے قیام کی جدوجہد کے اتنے مواقع بھی نہ رہ سکیں گے، جتنے انگریزی حکومت میں موجود ہیں تو ہم انگریزوں کے نظام کو جرمنوں اور جاپانیوں کے حملے سے بچانے کی ضرور کوشش کرتے اس لئے نہیں کہ ایسی صورت میں ہمارے لئے باطل سے تعاون جائز ہو گیا ہے بلکہ اس لئے کہ جب دو برائیوں میں سے کسی ایک برائی کا اختیار کرنا ناگزیر ہو جائے اور خیر کی راہ مسدود ہو جائے تو شریعت اور عقل دونوں کا فتویٰ یہ ہے کہ ایسی شکل میں اس برائی کو اختیار کیا جائے جو ہمارے اپنے نصب العین کے پہلو سے ہلکی ہو۔" (تفہیمات صفحہ ۲۴۴)

اس اقتباس کو دوبارہ پڑھیے اور فیصلہ دیجیے کہ صدارتی انتخاب کے موقع پر جماعت اسلامی نے محترمہ خاتون کی حمایت کا جو فیصلہ کیا تھا، کیا وہ مولانا اصلاحی کے انگریزوں کے نظام کی حمایت کے فتوے سے مختلف تھا؟ ایک طرف صدارتی نظام تھا، دوسری طرف پارلیمانی نظام، جس کے اندر اس کے امکانات تھے کہ جمہور کا اقتدار دین و اخلاق کی قدروں کا احترام کرے گا یا مطلق العنانی اور جمہوریت کے حدود عمل سب کو معلوم ہیں، جماعت اسلامی نے جمہوری یعنی پارلیمانی نظام کو ترجیح دی، کیوں کہ اس کے نزدیک عقل و شریعت کا یہی فیصلہ تھا! مولانا اصلاحی صاحب قبلہ نے انگریزوں کے جس نظام کی حمایت کا مشورہ دیا تھا ملحدانہ اور مشرکانہ پارلیمانی جمہوریت کا نظام تھا اور یہ مشورہ غیر مسلم اکثریت کے ایک کافرانہ ملک کے لئے دیا تھا اور جماعت اسلامی نے جس نظام کی حمایت کی وہ مسلمان کلمہ گو (مشرکانہ اور ملحدانہ نہیں) غیر صالح پارلیمانی جمہوریت کا نظام تھا وہ بھی مسلمانوں کی غالب اکثریت کے ایسے ملک کے لئے جو بفضلہ تعالیٰ مسجد کی طرح مقدس ہے! جماعت اسلامی کی رائے میں پاکستان میں اسلام کے لئے راہیں اسی وقت کھل سکتی ہیں جب یہاں جمہوریت کا عملی دخل ہو۔

اب قارئین خود ہی انصاف کر کے بتائیں کہ کس کا "جرم" زیادہ سنگین ہے۔ جماعت اسلامی کا یا مولانا اصلاحی صاحب کا؟ اور فکر و عمل کا عبرت ناک تضاد کس کے یہاں ملتا ہے!

کاش! محترم مولانا امین احسن اصلاحی اپنے موجودہ موقف پر نظر ثانی فرما سکتے!

(صنا کا بقیہ)

الشیخ محمد (نزہۃ الخواطر جزء سادس ص۲۳) بھائی شیخ محمد کی قرأت سے پڑھی تھی،

شیخ محمد غالباً شاہ ولی اللہ کی دوسری شادی کے بعد پھلت منتقل ہو گئے تھے، مولوی سید ظہیر الدین احمد کا بیان ہے کہ:-

"وہ ہمیشہ پھلت ہی میں رہے" (دہلی اور اس کے اطراف) ص۶۸

مگر مولوی عبدالحیٔ لکھتے ہیں:-

وانتقل بعد وفاۃ ابیہ الی بڈھانہ فسکن بھا مات سنۃ ثمان ومائتین والف ندافن فی الجامع الکبیر بقصبۃ بڈھانہ

اپنے والد کی وفات کے بعد بڈھانہ منتقل ہو گئے اور وہیں رہے ۱۲۰۸ھ میں وصال ہوا اور بڈھانہ کی جامع مسجد کے متصل دفن کئے گئے۔

(نزہۃ جلد ۶ ص۴۷۲)

بڈھانہ اور پھلت ضلع مظفر نگر (یوپی، بھارت) کے دو گاؤں ہیں، شاہ ولی اللہ کا مولد اور ننہال بھی پھلت ہے شاہ صاحب کے چھوٹے بھائی شاہ اہل اللہ کا مزار بھی یہیں ہے، پھلت میں آج بھی وہ کمرہ محفوظ و مقفل ہے جس میں شاہ ولی اللہ کی ولادت ہوئی تھی ہم نے ان دونوں مقامات کی زیارت کی ہے!

دعوتِ انبیاء کا ایک بنیادی پہلو

محمد حسام الدین شریفی

ابتدائے آفرینش سے لیکر شبابِ عالم تک اللہ تعالیٰ نے مختلف اوقات میں، جب کوئی قوم راہِ راست سے بھٹک کر کفر و شرک کی ظلمتوں میں ڈوب گئی اور انسانیت سے ناطہ توڑ کر حیوانیت و بہیمیت سے اُس نے رشتہ استوار کر لیا تو اس گم کردہ راہ قوم کی رہبری اور رہنمائی کے لئے اپنے خصوصی نمائندے بھیجے۔ جنہوں نے اپنی پوری زندگی انسانوں کے سدھارنے اور کائنات کے ذرے ذرے کی اصلاح کے لئے وقف کر دی۔ رُشد و ہدایت کا یہ سلسلہ حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم الانبیاء و المرسلین جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک چلتا رہا اور آپ پر اس سلسلے کی تکمیل کر دی گئی۔

تمام انبیاء کی دعوت و تبلیغ کا جائزہ لینے سے ایک بات واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے جسے اُن کے پیغام کا بنیادی نقطہ قرار دیا جا سکتا ہے اُن کی ساری دعوت و تبلیغ اسی ایک نقطے اور محور کے گرد گھومتی نظر آتی ہے جسے احساسِ کمتری اور احساسِ برتری کا نام دیا جاتا ہے اور یہی وہ قدرِ مشترک اور بنیادی پتھر ہے جس پر انبیاء نے اپنے ارشاد و ہدایت کی عمارت تعمیر کی ہے۔

تمام انبیاء نے اپنے پیغام کے ذریعے ان دونوں چیزوں کو ختم کرنے کی کوشش کی کہ اسی کے نتیجے میں کفر و شرک کو ختم کر کے توحید و ایمان کی عمارت کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے کیونکہ جب تک کوئی قوم احساسِ کمتری کا شکار رہتی ہے وہ اپنے مقام کو بھلا کر ہر ادنیٰ چیز کے سامنے اپنے آپ کو لپت کر دیتی اور سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے پتھروں کو تراش کر ان کے سامنے سر ٹیک دیتی اور مظاہرِ قدرت کی پرستش میں مبتلا ہو جاتی ہے اور جب وہی قوم احساسِ کمتری سے نکل کر احساسِ برتری میں مبتلا ہوتی ہے تو پھر اس کی نظر میں کوئی جچتا ہی نہیں جسے وہ خدائی کے منصب کے اہل قرار دے سکے اور بالآخر خدا کا انکار کرتے ہوئے خود کو ہی سب کچھ سمجھنے لگتی اور انا ربکم الاعلیٰ کا دعویٰ کرنے لگتی ہے۔

انبیائے کرام نے اپنی دعوت کے ذریعے بنی نوعِ انسان کو احساسِ کمتری اور احساسِ برتری کے اسی چکر سے نکال کر اس کی عزتِ نفس کو بحال اور خودداری کے جذبے کو بیدار کیا اور اس میں احساسِ ذمہ داری پیدا کیا۔ اسے سمجھایا کہ تمہیں مخلوقات میں مقامِ امتیاز بخشا گیا اور اشرف المخلوقات کے اعزاز سے نوازا گیا ہے پھر تم کیوں اپنی عزتِ نفس کو پامال کرتے اور خودداری کو ٹھیس پہونچاتے ہو؟ کیوں اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھروں کے سامنے سر جھکاتے ہو؟ کیوں شمس و قمر کو پوجتے اور خدا کے نیک اور برگزیدہ بندوں کی پرستش کرتے ہو؟ قانونِ خداوندی کے مقابلے میں کیوں غیروں کے قانون کو اپنے اوپر نافذ کر کے احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہو؟ ذرا سوچو تو سہی کیا تمہارے شایانِ شان ہے؟

انبیاء نے اس معاملے کو ادھورا نہیں رہنے دیا بلکہ بنی نوعِ انسان کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرائی کہ جس طرح انسان احساسِ کمتری کا شکار ہو کر اپنے مقامِ بلند کو کھو بیٹھتا ہے اسی طرح انسان کے لئے یہ بھی مناسب نہیں کہ وہ اپنے مقام سے اونچا اٹھنے کی سوچنے لگے اور "ہمچو ما دیگرے نیست" کا نعرہ بلند کر کے دعویٰ خداوندی کرنے لگے ——— خداوندی کا دعویٰ کرنے والوں کا جو حشر ہوا اُس سے تاریخ کا ایک ادنیٰ طالبِ علم بھی بخوبی واقف ہے "بندگانِ خاص" نے اپنی دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں جس احساسِ کمتری اور احساسِ برتری سے لوگوں کو نجات دلائی اُس کی کارفرمائی صرف

اسی ایک میدان تک محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اُنہوں نے اس کے ذریعے اگر ایک طرف کفر و شرک کو ختم کر کے زیورِ ایمان کی دولت سے لوگوں کو مالا مال کیا تو دوسری طرف زندگی کے مختلف شعبوں میں اسی کی وساطت سے اصلاح و تطہیر فرمائی اور لوگوں کے دل و دماغ سے ان تصورات کو ختم کر کے عزتِ نفس اور خودداری کی نئی عمارت کی بنیاد رکھی۔

تہذیب و تمدن، معاشرت اور ثقافت کے معاملے میں بھی نبی آخرالزماںؐ نے امتِ مسلمہ کو احساسِ کمتری کا شکار ہونے سے بچایا۔ عزتِ نفس کی بحالی اور خودداری کے جذبے کو پروان چڑھایا اور اس احساس کو اس کے اندر اس حد تک بیدار کیا کہ پھر ان کی نظر میں اپنی زبان، اپنا لباس اور اپنے رہن سہن کا طریقہ ہی سب کچھ تھا۔ غیروں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کے بھی وہ روادار نہ تھے۔ عمرؓ جیسا جلیل القدر خلیفہ بیت المقدس پہونچتے وقت اپنے سیدھے سادے لباس میں امرائے فوج کے اصرار کے باوجود ذرہ برابر تبدیلی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ـــــ پھر اسی پر اکتفا نہیں بلکہ حسن و خوبصورتی کے لئے انسانی شکل و صورت کو بگاڑنے اور اس پر مختلف مصنوعی اشیاء کا خول چڑھانے سے بھی روکا گیا کہ یہ بھی احساسِ کمتری کا نتیجہ ہے:

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ
(مسلم عن عبداللہ بن مسعودؓ)

آدمی کا شمار ان لوگوں ہی میں کیا جاتا ہے جن سے اُسے تعلق ہو جن کے اقوال و افعال کو اور طرزِ معاشرت کو اس نے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنا رکھا ہو اور قیامت کے روز اُس کا حشر و نشر بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی ہوگا دنیا میں جن کی پیروی کیا کرتا تھا۔

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المتشبّھین من الرجال بالنساء والمتشبّھات من النساء بالرجال
(بخاری عن ابن عباسؓ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن مردوں پر لعنت فرمائی جو عورتوں کے ساتھ مشابہت پیدا کرتے ہیں اور اُن عورتوں پر بھی جو مردوں کے ساتھ مشابہت پیدا کرتی ہیں۔

وہ لوگ جو اپنے چہرے کو بے ریش کرنے کے علاوہ لباس، وضع قطع، چال ڈھال، غرض ہر طرح عورتوں سے مشابہت پیدا کرنے کی کوشش ناکام کرتے ہیں اور وہ خواتین جو نہ صرف اپنے سر کو، بالوں کے بوجھ سے، ہلکا کرانا پسند کرتی ہیں بلکہ اپنے لباس، وضع قطع اور بول چال میں بھی مردانہ صفات پیدا کرنے کی خواہش مند ہیں اُنہیں اپنے نبیؐ کے اس فرمان پر بھی غور کرنا چاہیئے جس میں ان افعال میں مبتلا خواتین و حضرات کے لئے زبانِ مبارک سے لعنت کے الفاظ نکلے ہیں ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو صاف طور پر منع فرما دیا کہ وہ اپنے سروں کو بالوں کی نعمت سے محروم نہ کریں سر کے بال ختم کرانے اور کم کرانے کی بھی اُن کو ہرگز اجازت نہیں:

نَھٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تحلق المرأۃ راسھا
(نسائی)

حضرت علیؓ نقل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو سر کے بال منڈانے سے منع فرمایا۔

ایک پیش گوئی میں نبی کریمؐ نے اس حالت و کیفیت کو بھی بیان فرما دیا جب امت مسلمہ بے غیرتی اور بے ہمتی میں مبتلا ہو کر احساسِ کمتری کا اس درجہ شکار ہو جائے گی کہ وہ اپنی شکل و صورت تک بدل ڈالے گی۔ بود و باش، معاشرت اور ثقافت، بول چال، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور تعلیم و تعلم غرض زندگی کے تمام شعبوں میں وہ یہود و نصاریٰ کی اندھی تقلید کو اپنے لئے لازم قرار دے دے گی۔ ان کی اچھی باتوں کو اختیار کرنے کے بجائے ان کی برائیوں کو اپنا لے گی اور ان تمام معاملات میں وہ اپنی عقلِ سلیم سے کام لینے کو گناہ و کبیرہ سمجھے گی، ارشاد فرمایا

لتتبعنّ الذین من قبلکم شبراً بشبرٍ و ذراعاً بذراعٍ حتی لو دخلوا فی جحر ضبٍّ لا تبعتموھم ـــ قلنا یا رسول اللّٰہ الیھود والنصاریٰ ؟ قال فمن ؟

(مسلم عن ابی سعید الخدریؓ)

(ایک وقت وہ آئے گا جب تم احساس کمتری میں اس درجہ مبتلا ہو جاؤ گے کہ اپنے تمدن و معاشرت کو غلط تصور کرتے ہوئے) پہلی امتوں کے طریقے کو (بعینہٖ) اختیار کرو گے بالشت بھر اور ہاتھ برابر (یعنی معمولی سا فرق بھی نہیں رہنے پائے گا) یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے سوراخ میں بھی گھسیں تو تم بھی ان کے ساتھ گھس جانے کی کوشش کرو گے۔ ہم نے دریافت کیا کہ پہلی امتوں سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ان کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے ؟

حدیثِ مذکورہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک زمانہ وہ آئے گا جب امت مسلمہ سوچنے سمجھنے کی زحمت گوارا کئے بغیر یہود ۔۔۔ ںاریٰ کے طریقوں کو اپنانے کی کوشش کرے گی۔ لباس میں ان کی پیروی کو اپنے لئے باعثِ عزت، ان کی زبان اور ادب کو حق آسمانی کی طرح ۔۔ لِ سمجھ کر سیکھنے لگے گی۔ ترکہ کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھنا ۔۔۔ پینے میں اُن کے طریقے کو اختیار کرنا ذریعہ اظہارِ تہذیب و تمدن سمجھنے لگے گی ـــ حالاں کہ امت مسلمہ کی اس نقالی اور اندھی تقلید کا یہود و نصاریٰ پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا بلکہ الٹا اثر ہوتا ہے اور اس طرح دھوبی ۔۔ نا گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا ـــــــ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں اس طرح بیان فرمایا :

ولن ترضیٰ عنک الیھود ولا النصاریٰ حتیٰ تتبع ملتھم ۔

(القرآن الحکیم)

یہود و نصاریٰ ہرگز تم سے راضی نہیں ہو سکتے ، تا وقتیکہ تم ان کی ملت میں شامل نہ ہو جاؤ ۔

(صـ ۳۷ کا بقیہ)

۔۔ب ہی ہونا چاہئے اور اسلامی ادب (پاکستانی ادب) کیا ہے ؟ اُس پر ہم خاصی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال چکے ہیں۔

پاکستانی ادب وہی ادب ہے جس میں پاکستان کے مقصدِ وجود (اسلام) کی روح کوئی ہوتی ہے جو جامد نہیں نرم پسند ہے جو خشک نہیں ۔۔ن ہے ، جو تنگ نہیں وسیع بلکہ بے حد و بیکراں ہے جو رنگین ہے مگر فحش نہیں ہے۔ جس کے مطالعہ سے ذوق و وجدان کو آسودگی میسر آتی ہے اور ۔۔ں و فکر کو روشنی ملتی ہے ۔

اسلام پسند ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کی مثالیں دی جائیں تو بات بہت زیادہ لمبی ہو جائے گی۔ مضمون ختم کرنے سے پہلے ہم اشارہ ۔۔ دیتے ہیں۔ کہ پاکستانی ادب میں جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، علامہ اقبال کی شاعری اس کا بہترین نمونہ اور شاہکار ہے ، ناول اور افسانہ میں ۔۔م حجازی اور نعیم صدیقی پاکستانی ادب کے نمائندے ہیں اور علوم دین میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریریں پاکستانی ادب کا قابلِ فخر نمونہ ہیں :
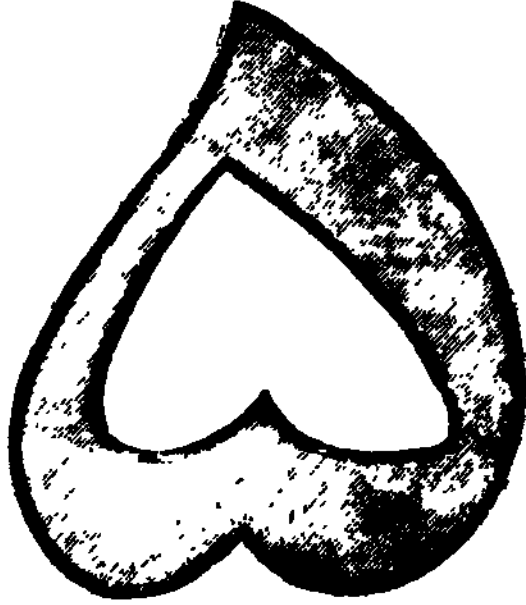
۔۔ کی مسلماں نے ترقی جو فرنگی بن کر ؛ وہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں (استسلانی مرحوم)

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سردرد۔ کمر کا درد۔ دانت کا درد
ایام۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
Spotlit

ماہر القادری

پاکستانی ادب کیا ہے

پاکستانی ادب پر گفتگو کرنے سے پہلے پاکستان کے بارے میں اختصار ہی کے ساتھ سہی مگر وضاحت ضروری ہے کہ خود پاکستان کیا ہے؟ اس
ت سے یہ فائدہ ہوگا کہ پاکستانی ادب کی تعریف اور اس کی صفات و خصوصیات متعین کرنے میں سہولت پیدا ہو جائے گی یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ:

"درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"

مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ پھل کی شناخت کے لئے خود درخت کا شجرہ نسب بیان کرنا پڑتا ہے۔ آج جس ملک اور حکومت کا نام پاکستان ہے۔
سے پہلے یہ خطہ زمین برطانوی ہند میں شامل تھا اور مختلف صوبوں اور دیسی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ملت
ے نہیں دین و تہذیب سے بنتی ہے۔ اس لئے ہم ہندوستان کے رہنے والے مسلمان ایک جداگانہ ملت ہیں، جن صوبوں میں ہماری اکثریت ہے اُن صوبوں کے
عے سے جو خطہ زمین متشکل ہوگا اس میں ہماری اپنی حکومت ہونی چاہیے۔ تاکہ ہم وہاں اسلامی قدروں کے مطابق اپنی حکومت چلا سکیں اور زندگی بسر کر سکیں

اس خطہ کا نام "پاکستان" تجویز کیا گیا، بڑی سخت آئینی کشمکش کے بعد اس جدوجہد میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ متحدہ ہندوستان تقسیم ہوا اور
ان وجود میں آگیا، مگر یہ تقسیم یوں ہی خاموشی کے ساتھ نہیں ہو گئی۔ مسلمانوں کو سچ مچ آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرنا پڑا۔ یہ داستان بڑی المناک ہے
کی تفصیل بیان کرکے بزم ادب کو میں بزم ماتم بنانا نہیں چاہتا۔

اس بارے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ پاکستان اسلام کے لئے بنا ہے اور اسلام کے نام پر بنا ہے۔ پاکستان کے مطالبہ سے پہلے متحدہ
دستان میں مسلم لیگ بھی موجود تھی اور مسٹر محمد علی جناح مرحوم بھی رہتے تھے، مسلم لیگ نیم سرکاری قسم کی جماعت سمجھی جاتی تھی اور مسٹر جناح ایک
ن پسند ماہر وکیل کی حیثیت سے مشہور تھے، اسلام کے نام پر جب پاکستان کا مطالبہ کیا گیا، اس کے بعد مسلم لیگ کو مسلمانوں میں قبول عام حاصل ہوا اور
ر محمد علی جناح کو ملت نے "قائداعظم" تسلیم کیا۔

مسلم لیگ کی غیر معمولی مقبولیت اور کامیابی مسٹر محمد علی جناح کی ممتاز قیادت کی عظمت و ہر دلعزیزی اور پاکستان کا وجود و قیام یہ سب کے سب اسلام
رہین منت ہیں کہ اسی مقدس نعرے کے طفیل میں یہ کامیابیاں اور عزتیں حاصل ہوئی ہیں۔

اسلام جب پاکستان کا مقصد وجود قرار پایا تو ظاہر ہے اس ملک کا ادب بھی اسلام کے عقیدہ و تہذیب کا ترجمان اور آئینہ دار ہونا چاہیے، مختصر لفظوں
یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی ادب دراصل پاکستانی ادب ہے اور پاکستانی ادب وہی ادب ہو سکتا ہے، جس میں اسلامی افکار اور اسلامی اقدار جلوہ گر
محسوس و مشہود ہوں۔

"اسلامی ادب" کا نام زبان پر لاتے ہی ایک اور بحث چھڑ جاتی ہے کہ کیا ادب بھی اسلامی اور غیر اسلامی ہو سکتا ہے اور ادب کی وحدت اور

آفاقیت کو کیا کفر و اسلام کے خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے ؟ اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ کائنات میں ہمہ گیر وسعت کے باوجود "خوب و ناخوب ، شریف و غیر شریف جھوٹ اور سچ ، دن اور رات ، سفید و سیاہ ، تلخ و شیریں . . . . . دو عالم جوڑے " کی فطری تقسیم ملتی ہے ۔ اس تقسیم پر ہمارے شعور اور تجربہ کی اساس قائم ہے اور اس تقسیم و تجزی کے باوجود کائنات کی وحدت بھی اپنی جگہ ثابت ہے ۔

جن لوگوں کو "اسلامی ادب" کا نام کھٹکتا ہے ، وہ ادباء تین گروہوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں ، پہلا گروہ اُن مذہبی لوگوں کا ہے جو اسلام کے بارے میں محدود تصور رکھتے ہیں ۔ حالانکہ اسلام ہندومت ، بدھ ازم ، عیسائیت ، یہودیت ، مرزائیت اور دوسرے مذاہب سکھ اور شنٹو وغیرہ کی طرح "مذہب" نہیں ہے بلکہ "الدین" ہے جس کے ترجمہ کے لئے ———— اور کسی زبان و ادب میں " الدین " کا مترادف اور ہم معنی لفظ موجود نہیں ہے اور کسی زبان و ادب میں " الدین " کا مترادف اور ہم معنی لفظ ہوتا کہاں سے ، جب کہ کسی قوم ، ملک اور زبان میں " الدین " کا تصور ہی سرے سے نہیں پایا جاتا ۔

" مذہب " ایک محدود اصطلاح ہے جو چند بنیادی عقائد اور پوجا پاٹ کی رسموں سے عبارت ہے اس کے مقابلے میں " دین " انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے ، زندگی کے کسی شعبہ کو بھی ہم " دین " کے حدودِ عمل سے خارج اور مستثنیٰ نہیں کر سکتے ——— " ادب " کا بھی زندگی سے تعلق ہے اس لئے زندگی کے دوسرے شعبوں اور خانوں کی طرح " ادب " کو دین سے خارج نہیں کیا جا سکتا ۔

صحابہ کرام کی زندگیاں اس کی گواہ ہیں کہ اسلام لانے کے بعد اُن کی پوری کی پوری زندگی بدل گئی ۔ اُن کی سیاست ، معاشرت ، تجارت ، ثقافت اور ادب بھی کچھ دین کے ماتحت ہو گیا ، جاہلیت کے زمانے میں عرب کے شعرا نسل و رنگ اور وطنیت پر فخر کرتے تھے ، شراب خواری ، قمار بازی اور بدکاری کو طرح طرح سے سراہتے تھے ، صنفِ نازک کے جسمانی اعضا کا شعروں میں مزے لے لے کر بیان کرتے تھے ۔ یہ شعراء بادۂ تصوف اور صہبائے معرفت نہیں ۔ سچ مچ کی شراب پیتے تھے ان کے یہاں شراب کا ذکر بطور استعارہ نہیں کیا گیا ، بلکہ واقعہ کے طور پر کیا گیا ہے ۔ طرفہ کہتا ہے : ۔

وما زال تشرابی الخمور ولذتی وبیعی وانفاقی طریفی ومتلدی

میرا ہمیشہ کا شغل قسم قسم کی شرابیں پینا ، مزے اُڑانا اور نئے پرانے مال کو بیچنا اور خوب دھڑلے سے ، خرچ کرتے رہنا ہے ۔

امرؤالقیس (بن حجر الکندی) اپنی محبوبہ کی تعریف یوں کرتا ہے : ۔

عصرت بفودی راسها فتمایلت علی هضیم الکشح ریا المخلخل

میں نے اس کی زلفیں پکڑ کر جو اپنی جانب جھکایا تو وہ جھک گئی ، اور عالم یہ تھا کہ اس کی کمر پتلی اور اس کی پنڈلیاں فربہ اور بھاری تھیں ۔

جاہلیت کے عرب شعراء جب وصل و خلوت کے معاملات و واقعات نظم کرتے ہیں تو شرم و غیرت کی بساط لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں اور رمز و اشارت کی بجائے برہنہ گوئی سے کام لیتے ہیں ۔ جن عرب شعراء کو قبولِ اسلام کی سعادت نصیب ہوئی اُن میں سے بعض نے تو شعر کہنا ہی ترک کر دیا اور جن شعراء نے شعر گوئی کے سلسلہ کو جاری رکھا اُن کی شاعری کا رنگ بھی بدل گیا ۔

حضرت کعبؓ اور حضرت حسانؓ نے دورِ جاہلیت اور عہدِ اسلام میں شاعری کی ہے اس لئے ان کا شمار " مخضرمی شعراء " میں ہوتا ہے ، اسلام لینے کے بعد بادہ و شاہد کی بجائے اُن کی شاعری کے موضوعات نعتِ رسولؐ اور اخلاق و شائستگی کے مضامین ہو گئے اس تفصیل پیش کرنے کا مقصود یہ تھا کہ صحابہ کرام نے اسلام کو یہ سمجھ کر قبول کیا تھا ۔ کہ ہماری پوری کی پوری زندگی کو مسلمان ہونا ہے " یہاں تک کہ شعر و ادب اور مزاح و ظرافت کو بھی اسلامی اخلاق کا عکاس و ترجمان بننا ہے ۔

دوسرا گروہ جو "اسلامی ادب" میں کھٹک محسوس کرتا ہے وہ مغرب زدہ حضرات کا گروہ ہے۔ جنہوں نے مغرب کی عینک سے اسلام کا مطالعہ
ہے، اور اُن کے خوب و ناخوب کا معیار بہت کچھ تہذیب زدہ اور مغربیت آلودہ ہے یہ وہ فن کے شیدائی ہیں۔ جو "آرٹ" کے اعتبار سے مولانا جلال الدین
ی اور تان سین کو ایک ہی صف میں کھڑا کرتے ہیں۔ شعر ہو، موسیقی و مصوری ہو، اور بت گری ہو، ان کو تو بس صنعت اور لطف و لذت چاہیئے۔

تیسرا گروہ اُن معترضین کا ہے جو مشکک، نیم ملحد، ملحد اشتراکی اور مادہ پرست ہیں۔ ان کی غالب اکثریت کو "اسلام" سے کد اور عناد ہے
لام کے نام سے بدکتے اور بھڑکتے ہیں۔

حیرت ہے کہ جو حضرات اسلامی اور غیر اسلامی ادب پر وحدتِ ادب کے ٹکڑے ہو جانے کی طنز فرماتے ہیں وہ "اشتراکی ادب" کو کس طرح گوارا کر لیتے
ہ اور انہیں اشتراکی اور غیر اشتراکی ادیبوں، وحدت کے مجروح ہو جانے کا کوئی خطرہ اور اندیشہ نظر نہیں آتا یہ بڑی ناانصافی کی بات ہے کہ اشتراکیت
تو اس کا مستحق سمجھا جاتا ہے کہ شعر و ادب میں اس کی ترجمانی ہو سکتی ہے۔ مگر اسلام کو اس حق سے نہ جانے کیوں محروم کر دیا گیا ہے۔ یہ لوگوں کی تنگ
نظری اور نادانی ہے اگر اشتراکیت ادب کے قالب میں ڈھالی جا سکتی ہے تو اسلامی افکار بھی ادب کا قالب اختیار کر سکتے ہیں۔

آج کی دنیا میں کتنے بہت سے اشتراکی ادیب اور اشتراکی شعراء پائے جاتے ہیں یہ لوگ اپنے کو اشتراکی کہنے میں کسی قسم کا کوئی عار محسوس
نہیں کرتے بلکہ فخر سمجھتے ہیں جب ایک ادیب اپنے کو اشتراکی کہہ سکتا ہے اور وہ اپنے مسلک کو نہیں چھپاتا اور مختلف پیرایوں میں اشتراکیت کا ذکر
کرتا ہے ... تو کوئی شخص اپنے کو اسلامی ادیب کہتا ہے تو اس نام کو سن کر لوگ کیوں چونکتے ہیں اور بعض پیشانیاں کیوں شکن آلود ہو جاتی ہیں —
اشتراکیت سے نسبت باعثِ فخر اور اسلام سے نسبت وجہ ندامت و عار! اس احساسِ کمتری میں جو مسلمان شاعر اور ادیب مبتلا ہے اُسے چاہیئے
وہ توبہ کے ساتھ اپنے ایمان کی تجدید کرے۔

اسلامی ادب پر ایک یہ طنز کی جاتی ہے کہ کیا اس میں غسل و وضو کے مسائل پیش کئے جائیں گے اور ادب کو مولانا اشرف علی تھانوی کا
بہشتی زیور بنایا جائے گا؟ اس قسم کی طنزیں بڑے اوچھے پن اور علم و فن سے بے خبری کی دلیل ہیں، اور اگر یہ بات نہیں ہے اور جان بوجھ کر یہ
شوشہ چھوڑا جاتا ہے تو یہ کھلی ہوئی عصبیت اور جانب داری ہے اور کم سے کم اہل علم کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔

اشتراکی ادب میں کیا ماسکو کے واٹر ورکس اور محکمہ حفظانِ صحت کے بائی لاز پیش کئے جاتے ہیں اگر نہیں کئے جاتے اور اشتراکی ادب اُس
ادب کا نام ہے جس میں اشتراکی قدروں کی ترجمانی کی جاتی ہے تو اس طرح اسلامی ادب میں بھی اسلامی قدروں کی عکاسی کی جائے گی، اب رہے غسل و
وضو کے مسائل تو یہ مسائل تو بے شک بیان نہیں ہوں گے۔ مگر غسل و وضو میں جو طہارت و نظافت کی سپرٹ کارفرما ہے۔ اُس کی جھلک اسلامی
لٹریچر میں ضرور آئے گی۔

ادب اور اخلاق

اسلامی ادب کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اخلاقی پابندیوں کے سبب اسلامی ادب خشک اور جمود پسند ہوگا یہ جواب بہت زیادہ
تفصیل چاہتا ہے اس سلسلہ میں فلسفہ اخلاق اور نفسیات کی بحث چھڑ جانے سے یہ داستان پھیلتی اور دراز ہوتی چلی
جائے گی اس لئے میں اختصار سے کام لوں گا۔ سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا ہے کہ کیا اخلاق اور نیکی میں یبوست اور جمود پایا جاتا ہے؟ اگر اخلاقی
پابندیوں کے بعد زندگی خشک اور جامد ہو جاتی ہے تو انسان کے مقابلے میں حیوانوں کی زندگیاں زیادہ رنگین اور خوش پسند ہونی چاہئیں کہ وہ
اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہیں اور ان کے اندر نیکی اور بدی کا کوئی امتیاز اور تصور ہی سرے سے نہیں پایا جاتا۔ اس دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا
انسان مل سکے، جو حیوانی زندگی کو رشک اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہو۔

اس عالم اسباب میں "پابندیوں" سے آدمی کو مفر نہیں مثلاً یہ اخلاقی احساس ہے جو انسان کو اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانے اور اُن کی ستر پوشی کے لئے مجبور کرتا ہے اور اس پابندی اور مجبوری پر کوئی یہ پھبتی چست نہیں کر سکتا کہ اس پابندی کے سبب انسان کے جسمانی حسن میں کمی واقع ہو گئی اور جسم کی عریانیت کے مقابلے میں ستر پوشی خشک اور بے رنگ چیز ہے۔

سامنے کی بات یہ ہے کہ لوگ بڑا کھانا اور بڑے "گٹ گھروں" کی کھڑکیوں پر "کیو" میں کھڑے ہونے کی پابندی گوارا کرتے ہیں اور پابندی سے ان لوگوں کی قطاروں میں کتنی شائستگی پیدا ہو جاتی ہے یہی حال "ادب" کا ہے کہ یہ اخلاقی پابندیاں ادب کو شائستہ اور مہذب بناتی ہیں۔ اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہونے کے بعد "ادب" "بے ادب" ہو جاتا ہے اور کوئی شائستہ اور مہذب آدمی ادب میں بے ادبی کو پسند نہیں کر سکتا۔

جہاں تک جمالیاتی ذوق کا تعلق ہے، سب سے بڑا حسن تو "نیکی" اور "خوش اخلاقی" میں پایا جاتا ہے۔ شجاعت، سخاوت، عفت و عصمت، ایثار و ہمدردی ...... ان صفات کا تصور کیجئے اور پھر سوچئے کہ اس تصور میں کتنا حسن اور دلکشی ہے؟ ایک جوان عورت آپ کے سامنے آتی ہے جو شباب و رعنائی کا مجسمہ اور حسن و خوبی کا پیکر ہے اگر کوئی یہ کہہ دے کہ اس عورت نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا تھا تو اس بات کے سنتے ہی اُس عورت کو آپ نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے اور اس کی خوبصورتی بھیانک اور کریہہ نظر آئے گی، اس مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نیکی حسین اور بدی بدصورت ہوتی ہے۔

اسلامی ادب چونکہ نیکی کا علمبردار اور منبع ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں بڑا حسن و جمال پایا جاتا ہے۔ اور اسلامی ادیب و شاعر کا جمالیاتی ذوق بڑا پاکیزہ اور اعلیٰ ہوتا ہے، شراب نوشی، سود خواری، بدکاری، رشوت ستانی اور اس قسم کی تمام دوسری برائیوں میں جو کشش ہے وہ نفس کے غیر فطری تقاضوں کے سبب ہے اس کشش کا بہت کچھ دار و مدار سفلی جذبات پر ہے، جب بھی جذبات کے اس طوفان کا زور ٹوٹتا ہے اور یہ دور ختم ہوتا ہے، تو آدمی اپنے اندر انفعال اور ندامت کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ نفس کی طرح طرح کی حیلہ سازیوں اور تاویلوں کے بعد بھی ضمیر مطمئن نہیں ہوتا اس کے برعکس نیکی کا جذبہ لازوال ہے۔ اس مسرت کو کوئی جھٹکا نہیں، اس لئے یہ بات عین واقعہ کے مطابق ہے کہ اسلامی ادب اُن موضوعات کو پیش کرتا ہے جن میں دائمی مسرت پائی جاتی ہے اس سے جوان اور بوڑھے یکساں طور پر اکتساب مسرت کرتے ہیں۔

جس کسی نے بھی جوانی کو "دیوانی" کہا اس نے گھٹیا قسم کی بات کہی۔ جب ادب میں جوانی کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ جوانی آوارگی اور عشق کا نام ہے اور یہ زمانہ آدمی کے ٹھوکریں کھانے کا ہے، اس قسم کا ادب ہوس کارانہ ادب ہے جس کے پڑھنے سے نوجوانوں کو غیر ذمہ دار اور بے راہ روی کی شہ ملتی ہے اسلامی ادب نوجوانوں کو نہ تو اس قسم کے بڑھاوے دیتا ہے اور نہ بے راہ روی پر انہیں اُکساتا ہے اور اُن کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسلامی ادب جوانوں کو پاکبازی، نیکی، سنجیدگی اور احساسِ ذمہ داری کا درس دیتا ہے کہ زندگی میں یہی زمانہ کام کرنے، سیکھنے اور بننے کا ہے اسی دور میں انسان کی سیرت و کردار کی تشکیل ہوتی ہے، جو کوئی نوجوانی میں بگڑ گیا، اُسے پھر زندگی بھر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

جسمانی خوبصورتی کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ حسن تناسب اعضاء کا نام ہے بالکل اسی طرح ادب کا حسن بھی خیال و اظہار کے تناسب کا ہے، جو بات کہی جائے دل نشین انداز میں سلیقہ کے ساتھ کہی جائے۔ لفظوں کا برمحل استعمال، زبان و روزمرہ کی صحت، خیال و اظہار میں توازن و ہم آہنگی ادب کے یہ وہ عناصر ثلاثہ ہیں جن سے ادب میں حسن، کشش اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے اگر کوئی خیال پھیلا کر بیان کیا گیا ہے، تو یہ اطناب ایسا نہ ہو کہ پڑھنے والا اکتاہٹ محسوس کرنے لگے اور "اطناب" کی بجائے "ایجاز" اختیار کیا گیا ہے، تو یہ اس حد تک نہ پہنچ جائے کہ قاری کا احساس کے ذہن و فکر میں گھٹن ہونے لگے۔

قرآن کریم کا موضوع "ہدایت" ہے اس لئے وہ صحیفہ اخلاق وہدایت، مکمل ترین ضابطہ حیات اور مقدس دستورِ زندگی ہے مگر ساتھ
، وادب کے اعتبار سے بھی قرآن نطق وگویائی کے خالق کا شاہکار ہے، عرب اپنی فصاحت وبلاغت اور زبان دانی کے سامنے ساری دنیا کو
زبانگا سمجھتے تھے، قرآن کریم کی آیات سن کر انہوں نے اپنے شاعروں کے قصیدے (معلقات) کعبہ کی دیوار سے اُتار لئے، قرآن کریم کے اس
لہ کوئی اس کی ایک آیت ہی کا جواب پیش کر دے آج تک کسی نے قبول نہیں کیا۔ علامہ اقبال نے تعریف تو مردِ مومن کی فرمائی ہے کہتے ہیں :-

آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن

مگر اس تعریف میں قرآن کریم کے لہجہ اور آہنگ کی یکتائی کا بھی ذکر آگیا، قرآن کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں
بانہ" و"انسجام" میں اپنا جواب نہیں رکھتے، حضورؐ کا ارشاد ہے :-

"اوتیت بجوامع الکلم"

۔ مجھے جوامع کلم دیے گئے ہیں"۔۔۔۔ "جوامع کلم" کی تعریف یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ مفہوم کو کم سے کم الفاظ میں حسن وخوبی کے
بیان کردینا۔ کلماتِ نبوی کی جامعیت اپنی جگہ بے مثال ہے۔ اس کے بعد صحابہ کرام کی تقریریں اور خطبات ہیں، خاص طور سے حضرت
علی کرم اللہ وجہہ کے خطبات ادب عالیہ کا مثالی نمونہ ہیں، پھر بعد کے دور میں سینکڑوں ادیب اور اہل قلم پیدا ہوتے ہیں۔ جن کا
ب نگارش اور طرز تحریر زبان وادب کی جان ہے اور فصاحت وبلاغت جن پر ناز کرتی ہے۔ امام شافعیؒ، زمخشریؒ، غزالیؒ، ابن خلدونؒ
قیمؒ۔ ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہ جیسے بلند پایہ انشاء پردازوں اور ادیبوں کے کارناموں سے اسلامی ادب کی تاریخ معمور ہے۔

اسلامی ادب اتفاقی واقعہ کے طور پر ایکا ایکی ظہور میں نہیں آگیا ہے۔ اس سے صدیوں کی تاریخ وابستہ ہے جو ادب اس قدر شاندار پس
اور اتنا عظیم الشان ماضی رکھتا ہو جس کی بنیادیں اس درجہ پائیدار اور استوار ہوں اُس ادب کو کس طرح نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ اس ادب سے غفلت
اہلِ علم وادب کا کتنا عظیم نقصان ہے۔

شاعری، ناول نویسی اور افسانہ نگاری ادب کی ایک شاخ ہے، یہ نہیں ہے کہ ادب تمام تر شعر وافسانہ کا نام ہے
یدان وادب اور.... ! مگر آج کل ذہنوں میں "ادب" کا عام تصور شاعری، ناول، ڈرامہ اور افسانہ سے وابستہ ہو کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ ہر وہ
یہ کتاب یا مقالہ جس میں "ادبیت" پائی جاتی ہے، ادب میں شمار کیا جائے گا، ایک شخص خالص الٰہیات پر مقالہ لکھتا ہے اور اس میں وہ عناصر ترکیب میں
سے ادب ترکیب پاتا ہے تو وہ مقالہ ادبی سمجھا جائے گا۔ اس کے برعکس دوسرا شخص رومانی افسانہ لکھتا ہے مگر اس میں زبان وبیان کی غلطیاں پائی جاتی
۔ جملے غیر مربوط ہیں، عبارت جگہ جگہ کسی غیر زبان کی کتاب کا ناقص ترجمہ معلوم ہوتی ہے ان کمزوریوں کے سبب اُس رومان انگیز افسانہ کو "غیر ادبی"
۔ دیا جائے گا۔

کس چیز میں ادبیت اور شعریت پائی جاتی ہے اور کس میں نہیں پائی جاتی۔ اس کا بہت کچھ تعلق وجدان صحیح سے ہے۔ جس طرح ہم کہتے ہیں
فلاں بات کو عقل عمومی صحیح تسلیم نہیں کرتی اسی طرح کسی نثر پارے یا شعر کے بارے میں ذوق ووجدان ہی فیصلہ دیتے اور حکم لگاتے ہیں۔ مثلاً
ب الشعرا محمد ابراہیم ذوق دہلوی کے اس شعر کو۔

واہ رے شورِ جراحت خوب ہی چھیڑا کا نمک　　　　ہڈیاں میری تہا کس کس مزے سے کھاتے ہے

وجدان صحیح ہرگز پسند نہیں کرسکتا۔ اس شعر میں زبان وروزمرہ اور گرامر کی کوئی غلطی نہیں ہے بلکہ مصرعہ اولیٰ میں تو صنعت پائی جاتی ہے لیکن

اس میں شعریت کا دور دور پتا نہیں۔ جس کسی شخص کو یہ شعر پسند آتا ہے۔ اس شخص کا وجدان مریض اور اس کا ذوق غیر صحیح ہے۔ وجدان و ذوق کا معاملہ کچھ
س قسم کا ہے کہ آسمان پر قوسِ قزح کو دیکھ کر کتوں اور بھینسوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا مگر انسان اُس کی رنگتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور وہ اس لئے
ہ انسانوں کے اندر جمالیاتی ذوق و وجدان پایا جاتا ہے۔

عرب کے مشہور شاعر فرزدق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس شعر پر ــ

دَجل السیول عن الطلول کانہا
زُبُرٌ تجد متونہا اَقلا مہا

بے ساختہ سجدے میں گر پڑا۔ یہ دلیل ہے شاعر کے وجدان کی شدتِ احساس کی!

قرآن کی تفسیر ہو، اخلاقیات والٰہیات ہو، تاریخ و فلسفہ ہو۔ افسانہ اور ناول ہو غزل یا نظم ہو جس میں ادبیت و شعریت پائی جائے گی
س کو ادب میں مقام دیا جائے گا۔ ہم نے شعر و افسانہ کی ایسی کتابیں پڑھی ہیں جن میں کوئی لطف بیان نہیں۔ روزمرہ اور زبان کی غلطیوں سے ہر صفحہ
پر ہے، ان کتابوں کے مطالعہ کے دوران وجدان کو صبر آزما کوفت سے دوچار ہونا پڑا ہے ان کتابوں کے مقابلے میں ایسی کتابیں بھی ہماری نظر سے گزری ہیں
ن کا موضوع اخلاقیات کی تبلیغ ہے۔ بعض میں فقہ و تفسیر کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔ مگر اُن میں بڑی ادبی دلکشی نظر آئی۔

"اسلامی ادب" صرف تبلیغ اخلاق اور انسانی قدروں کے احترام کا نام نہیں ہے۔ تقدیسِ فکر و خیال اور پاکیزگی موضوع کے ساتھ "اظہار"
(EXPRESSION) بھی خوب سے خوب تر ہونا چاہئے، عروسِ جمیل کے لئے لباسِ حریر بھی بہت ضروری ہے۔

شعر و ادب میں الفاظ کی نشست، ترتیب اور دروبست ساز کے پردوں کی طرح ہوتا ہے۔ جس شعر میں نغمگی نہیں اور جس نثر پارے کا لہجہ نرم و
ریں اور موضوع سے ہم آہنگ نہیں اُس پر ادب کا اطلاق ہی نہیں ہوتا، اس اعتبار سے اسلامی ادب خشک و بے کیف نہیں۔ رنگین، دلکش اور مترنم
ہوتا ہے۔

دلکشی اور جاذبیت اسلامی ادب کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔

اسلامی ادب کے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں "رومان" بھی ہوتا ہے۔ مگر کیسا رومان! جسے پڑھ کر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی خلوتیں اور
تیاں خیالی طور پر بھی ہوس آلود نہ ہونے پائیں۔ محبت کے پیغامبروں کے ساتھ غیرت و حیا اور شرافت و انسانیت کے تقاضے بھی ملحوظ رہنے چاہئیں۔ اصل
بات کا سلیقہ سے کہنا ہے۔ جواز ہوس کے واقعہ کو بھی اس انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہئے کہ اسے پڑھ کر اصل واقعہ تو معلوم ہو جائے مگر ذہن
ںکر ہوس ناکی کی طرف مائل نہ ہوں۔

اسلامی ادب اور "ترقی پسند ادب" میں یہی چیز مابہ الامتیاز ہے کہ "ترقی پسند ادب" میں معاشرے کی برائیاں اس انداز میں بیان کی جاتی ہیں کہ
برائیوں سے نفرت کی بجائے دلچسپی اور لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے، اسلامی ادب میں برائیوں کا ذکر اس طرز پر ہوتا ہے کہ اصل واقعات کے اظہار کے ساتھ وہ
ائیاں قاری کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں اور طبیعت اُن سے نفرت کرتی ہے۔

وہ جو غالب نے کہا ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تو بادہ و ساغر اور جام و مینا کے استعارے شعر و سخن میں ناگزیر ہیں۔ ان استعاروں سے ایک طرف تو شاعری میں رنگینی پیدا ہوتی ہے اور

خاکی (مدوھ) ـــــ

جو راستہ ہے ترے راستے سے ملتا ہے — جو انجمن ہے تری انجمن ہے کیا کہئے
دکھا رہے ہیں جنوں کو خرد کا آئینہ — یہ اہلِ ہوش کا دیوانہ پن ہے کیا کہئے
عجیب رنگ بلا کشش و غضب کا جمال — بہشت ہے کہ تری انجمن ہے کیا کہئے

زکی زاکانی ـــــ

حلقۂ طوق بنے چاک گریبانوں کے — آپ کے بعد بُرے حال ہیں دیوانوں کے
گھر سے ہر شخص نکلتا ہے یہاں سنگ بدست — کون رہ سکتا ہے اس شہر میں دیوانوں کے
ہم نے مانا کہ وفا کیش نہیں ہے دنیا — پھر بھی انسان ہی کام آتے ہیں انسانوں کے
کاش! مل جاتا کوئی اہلِ کرم زاکانی — ہم فقیر آ کے ہوئے شہر میں سلطانوں کے

ہنر کیفی ـــــ

ناز کرتی تھیں زمانے کی بہاریں جن پر — اب چمن میں وہ گلِ تر نہیں دیکھے جاتے
کاش! اشکوں کو میسر ترا داماں آ جائے — خاک میں ملتے یہ گوہر نہیں دیکھے جاتے

شفیق وزکی — سوتے تھے نشیمن میں بس اتنی تو خبر ہے — جاگے تو نظر آئے گرفتار قفس میں

مری خاطر جہاں میں آپ کیوں بدنام ہوتے ہیں — مرے ہمراہ رہ کر آپ کیوں مشکل میں پڑتے ہیں

نہ ہم شکوہ وہ نادم ہوں یہ منظر کون دیکھے گا — وہ محشر تو بجا ہیں گے یہ محشر کون دیکھے گا
نگہبانوں، گھر والوں کا اچھا ذکر کیا تم نے — تمہیں لے جائیں گے دل میں چھپا کر کون دیکھے گا

برہمنا قدرت قاصر (امرتسر)

مفلسی اور وہی آہ و فغاں آج بھی ہے — منعمی اور ہمہ عیش جہاں آج بھی ہے
ظلمت شر میں نہاں آج بھی ہے جلوۂ خیر — گرم پیکار بہاروں سے خزاں آج بھی ہے
اوج پرواز بشر پر بھی بشر کی منزل — خود بشر ہی کی نگاہوں سے نہاں آج بھی ہے
دولتِ علم و ہنر ہے سرِ معراجِ کمال — آدمیت کا مگر قحط یہاں آج بھی ہے

رافت حسین راغب میرٹھی

ہشیار میرٹھی

کہتے ہیں کہ ایک شاعر نے حضور اقدس کی مدح میں قصیدہ پڑھا آپ نے خوش ہو کر فرمایا "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" یعنی شعرا خدا کے شاگرد ہوتے ہیں یہ ایک ایسی بات ہے کہ جس کی صداقت میں ذرا بھی شک نہیں ہو سکتا ایک شاعر خواہ کتنا ہی ذی علم اور ہونہار ہو اُس وقت تک اچھا شعر نہیں کہہ سکتا جب تک کہ عالم قدس کی جانب سے اشارہ نہ ہو، شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک فطری اور دوسرا اکتسابی۔ فطری شاعر وہ ہوتا ہے جو پیدائشی طور پر قدرت سے موزوں طبیعت رسا ذہن، بلند تخیل اور آمد کا جوہر لے کر آیا ہو ایسا شاعر حاضر طبیعت اور زود گو ہوتا ہے اس کے کلام میں روانی اور جوش بدرجہ اتم پایا جاتا ہے، اکتسابی شاعر وہ ہوتا ہے جسے فطری طور پر یہ اوصاف نہ ملے ہوں، جس کی طبیعت میں آمد نہ ہو آورد ہو اور اپنے علم و محنت کے بل بوتے پر شعر کہتا ہو ایسا شاعر کم گو ہوتا ہے اس کے کلام میں وہ روانی، اثر اور جوش نہیں ہوتا جو ایک فطری شاعر کے کلام میں ہوتا ہے۔

میرٹھ دہلی سے تیس میل کے فاصلہ پر گنگا اور جمنا کے دوآبہ میں واقع ایک قدیم شہر ہے دریائے جمنا ضلع میرٹھ اور دہلی کے درمیان حد فاصل ہے گنگا اور جمنا کے بیسن (BASIN) کے شہروں میں سب سے اچھی آب و ہوا اسی شہر کی ہے یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے اس کو بہت بڑی فوجی چھاؤنی بنایا تھا جس سے ان کا مقصد دارالسلطنت دہلی کی حفاظت بھی تھا آزادی ہند و پاکستان کے بعد بھی اس کی وہی اہمیت ہے بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے یہ پرگنہ، تحصیل، ضلع اور کمشنری چاروں صورتوں میں ایک ہی نام میرٹھ سے موسوم ہے دہلی کے قریب ہونے کی وجہ سے دہلی جیسی تہذیب و تمدن ہے جو وہ انقلاب جو دہلی میں آیا میرٹھ پر ساتھ ساتھ اثر انداز ہوا بالفاظ دیگر دہلی اور میرٹھ کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میرٹھ ہی سے شروع ہوئی تھی، کمشنری میرٹھ عموماً اور ضلع میرٹھ خصوصاً مردم خیز خطہ ہے یہاں بڑی بڑی سیاسی، مذہبی اور ادبی ہستیاں پیدا ہوئیں اس خطہ کے شاعروں اور ادیبوں میں شاہ نصیر (استاد ذوق دہلی) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، حکیم مولا بخش قلق، مولانا رحیم الدین (مصنف قاطع برہان) سید محمد مرتضیٰ بیان یزدانی، مجدد وقت مولانا شوکت، مولوی محمد اسماعیل، ندا دگلاؤٹی، اطہر اور رفیق رامپوری (شاگرد و جانشین و فرزند مولانا شوکت) اور بابائے اردو مولوی عبدالحق بڑی قابل قدر ہستیاں ہوئی ہیں۔

میرٹھ کی اردو شاعری کی تاریخ میں سید محمد مرتضیٰ بیان یزدانی (اردو میں بیان اور فارسی میں یزدانی تخلص تھا) اور مجدد وقت مولانا شوکت کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا میرٹھ میں اردو شاعری کے دو اسکول مانے جاتے ہیں، ایک بیان یزدانی اسکول اور دوسرا مجدد وقت مولانا شوکت اسکول، دونوں اساتذہ باکمال تھے لیکن وہی فطری اور اکتسابی شاعری یا آمد اور آورد کا فرق۔ بیان یزدانی کی زود گوئی اور آمد کا یہ عالم تھا سنا ہے کہ کئی آدمیوں کو ایک ساتھ بٹھا کر اشعار کا املا کراتے تھے، ۱۸ - ۱۹ سال کی عمر میں ایک عجیب و غریب

ن کراچی   جون ۶۵ء

میں مبتلا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے آواز کا دھماکہ برداشت نہ ہوتا تھا اور روشنی سے وحشت ہوتی تھی اندھیرے میں پڑے رہتے تھے
ن شباب سے عمر بھر گوشہ نشین رہے گھر سے کہیں مشکل ہی سے جاتے تھے میرٹھ سے باہر کہیں نہیں گئے شہر میں کسی دوست یا شاگرد کے ہاں
تو پالکی میں بیٹھ کر شام کو جاتے اور صبح کو واپس آ جاتے لیکن اخبارات کی ادارت کے سبب سیاسی و ملکی معاملات سے باخبر رہتے ،
ادب میں کسی کے شاگرد نہ تھے داغ اور امیر کے ہم عصر تھے دربار رام پور سے بلاوا آیا مگر بیماری کے سبب نہ جا سکے ۔

مولانا شوکت اپنے علم وفضل کی وجہ سے مجدد وقت کہلاتے تھے بیان یزدانی کے معاصر تھے دونوں اساتذہ اور ان کے
ردوں کے درمیان خوب خوب مقابلے ہوتے تھے ، مگر نہایت شائستہ اور تہذیب کے دائرے میں مولانا شوکت کے کلام میں آمد کم اور آورد
ت زیادہ ملتا ہے !

میں نے جب ہوش سنبھالا تو ماسٹر انور ، مولانا ندرت ، اکبر وارثی ، منشی شمس الدین شمس ، ضیاء الاسلام عیاں اور عبد المجید
یار کا دور تھا ماسٹر انور ، اکبر وارثی اور مولانا ندرت تقریباً گوشہ گیر ہو چکے تھے اب سوائے آخر الذکر کے سب اللہ کو پیارے ہو
ہیں ، عبد المجید ہشیار صاحب ماسٹر انور کے شاگرد ہیں ، آپ ایک فطری شاعر ہیں مگر اساتذۂ قدیم کی طرح قدرت کی ستم ظریفیوں کے
۔ جہاں تک علم وفضل کا تعلق ہے زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں گدڑی بازار میرٹھ شہر میں برتنوں پر قلعی کرنے کی دکان ہے خود دن
تن مانجھتے رہتے ہیں اور دکان پر شاگردوں کا ہجوم رہتا ہے ۔ برتن مانجھتے جاتے ہیں اور اصلاح کرتے جاتے ہیں ، غزل گو ہیں اور
، الفاظ پڑھتے ہیں اگر جگر کی طرح ترنم سے پڑھتے تو خدا جانے کیا مقام حاصل کر لیتے میرٹھ میں ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں
پہنچتی ہے ، افسوس کہ بوجہ افلاس میرٹھ کے دوسرے اساتذہ کی طرح ان کا بھی کوئی مجموعہ کلام اب تک شائع نہیں ہو سکا مجھے میرٹھ
ے ہوئے سترہ سال ہو چکے ہیں ان کے کلام کا بیشتر حصہ جو مجھے یاد تھا بھول چکا ہوں ۔ بہرحال چند شعر سر دست حاضر ہیں ۔

کہتے ہیں جسے خواب نمونہ ہے فنا کا — اس بھیس میں مل لیتا ہوں یارانِ عدم سے

کیا کہوں پہلو میں رکھ لینے کے قابل ہو گیا — عکس سے تیرا آئینہ مرا دل ہو گیا

وہ دمِ آخر یہ کہہ کر میری بالیں سے اٹھے — ہم سے آنکھیں پھیر لیں ہشیار غافل ہو گیا

نالے فضائے دہر میں گونجیں گے حشر تک — میں غمزدہ رہوں نہ رہوں داستاں رہے

وقتِ اخیر جن سے فنا کا سبق ملا — وہ چند سانس حاصل عمر رواں رہے

عشق آئینہ بنا حسن کی رعنائی کا — اب تو منہ تکتی ہے دنیا ترے شیدائی کا

عشق میں ذلت و رسوائی سے بچنا کیسا — عشق تو نام ہے خود ذلت و رسوائی کا

وہ عیادت کو اگر آئیں مکافات تو ہو — آدمی بات پہ مرتا ہے مگر بات تو ہو

ان کی صورت دیکھ کر حیران ہوں خاموش ہوں — ابتدائے بیخودی ہوں انتہائے ہوش ہوں

دم بدم کاندھا بدلتے ہیں عزیز و اقربا — موت کے ہاتھوں بکی ہو کر وبالِ دوش ہوں

باعث بیتابیٔ دنیا کیوں نہ ہو میرا سکوت — میں کسی مایوسِ حسرت کا لبِ خاموش ہوں

کیا بتاؤں عشق نے کس حال کو پہنچا دیا — سب مجھے ہشیار کہتے ہیں مگر بیہوش ہوں

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

شیخ التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ

یہ اب سے تقریباً ۲۰-۲۲ سال پہلے کی بات ہے، مجلہ ترجمان القرآن اُن دنوں حیدرآباد دکن سے شائع ہوتا تھا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جدوجہد کا ذکر بڑے شاندار الفاظ میں کیا تھا، تبلیغی جماعت کا غالباً یہ سب سے پہلا تحریری تعارف تھا۔ یہ سعادت مولانا مودودی کے رسالہ "ترجمان القرآن" کے حصہ میں آئی۔ مولانا محمد الیاس قدس سرہٗ کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف نے تبلیغی جماعت کی رہنمائی کا فرض انجام دیا، میں نے ان کا نام سب سے پہلے دو غالباً ۱۹۵۲ء اس عنوان سے سنا کہ سکھر میں تبلیغی جماعت کے جلسے ہو رہے تھے وہاں جماعت اسلامی کی کتابوں کی دکان بھی قائم تھی مولانا مرحوم نے جماعت کی بک اسٹال کو جلسہ گاہ سے اٹھوا دیا اس خبر کو سن ——— یہ حقیقت معاً سامنے آئی کہ بسا اوقات بڑے رتبہ کے لوگوں کو بھی بعض معاملات میں غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں!

کراچی میں مکی مسجد تبلیغی جماعت کا مرکز ہے، میں جس بلڈنگ میں رہتا ہوں، وہاں سے یہ مسجد بہت سے بہت دو فرلانگ کے فاصلہ پر ہوگی، جمعہ کی نماز زیادہ تر اسی مسجد میں ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوتی رہتی ہے حضرت مولانا محمد یوسف —— کی تقریر کئی بار اسی مسجد میں سُنی، ایک بار اُن کی قیام گاہ پر خاص طور سے تعارف بھی ہوا، بڑی محبت کے ساتھ مصافحہ فرمایا اور خاکسار کو قدرے غور سے دیکھا! اُن کی آخری بار زیارت کو بھی دو سال ہو رہے ہیں، اپنی تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ ہارون الرشید کے کئی بیٹے تھے ایک بیٹے نے تخت و تاج کو چھوڑ کر درویشی سنبھالا حضرت مولانا مرحوم نے اپنے وعظ میں ایثار کا درس دیتے ہوئے یہ بھی کہا —— کہ —— "مزدوری دو، بیوی نہیں"! ان کے وعظ و ارشادات کا خلاصہ اور لب لباب یہ تھا کہ لوگ ایثار سے کام لیں اور لینے کے بجائے دینے کا جذبہ پیدا کریں تو ایسا کرنے سے ایک طرف نفس کا تزکیہ ہوگا اور دوسری طرف نفسا نفسی اور معیشت و مسابقت کی رسہ کشی سے چھٹکارا مل جائے گا! اُن کے وعظ کے دوران یہ خیال ابھرا کہ ہارون الرشید کا کیا کوئی ایسا لڑکا بھی تھا جس نے تخت و تاج چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی تھی اور مزدوری کا کام کر کے اپنی مزدوری وصول نہ کرے گا تو بے چارہ کھائے گا کیا مگر معاً ذہن اس طرف گیا کہ وعظ و نصیحت میں نیکی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے ایسی باتوں کو گوارا کر لیا جاتا ہے!

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے تبلیغی جماعت کے کام کو جس مقام پر چھوڑا تھا اُن کے لائق جانشین اور سعادت مند فرزند مولانا محمد یوسف نے اسے منزلوں آگے پہونچا دیا، مولانا الیاس صاحب؟ اپنی زندگی میں فرمایا کرتے تھے کہ وہ تبلیغی وفد کو یورپ، امریکہ اور جاپان تک میں گشت کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، مولانا مرحوم کی یہ پیش گوئی صحیح اور مطابق واقعہ ثابت ہوگئی، اہل اللہ کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ بعض اوقات آنے والے واقعات اُن کے آئینہ ادراک میں منعکس ہو جاتے ہیں۔

کراچی کی مکی مسجد میں ہر طرف سے تبلیغی جماعتیں آتی رہتی ہیں۔ اُن کے خلوص و ایثار، تواضع و فروتنی، ذکر و شغل اور نماز سے شغف کو دیکھ کر طبیعت اثر قبول کرتی ہے۔ ایک بار راقم الحروف بھی تبلیغی جماعت کے وفد کے ہمراہ شہر سے باہر ملیر کی بستی میں گیا تھا اور ان نیک لوگوں کے ساتھ ایک رات گزاری تھی!

کوئی شک نہیں تبلیغی جماعت کی جدوجہد سے لاکھوں مسلمانوں کی دینی اصلاح و تربیت ہوئی ہے۔ دنیا کے گوشوں میں ان کے وفود جاتے ہیں اور اچھے اثرات چھوڑ کر آتے ہیں ان کے دینی عقائد بھی پختہ ہیں۔ مشرکانہ رسوم و بدعات جن کا مسلمانوں میں خاصہ چلن ہے، اُن سے کوسوں دور! بے نمازیوں

باقی صفحہ ۷۱ پر

را ے جو مجھے ہدایت کرتا ہے کہ میں اپنے اور دوسر
لوں کے اندر جھانک کر ارباب دانش و بینش کا
انصب العین پورا کروں۔ ایتھنز کے لوگو! میں
ہاری عزت کرتا ہوں اور تم سے محبت رکھتا ہوں
لیکن میں اطاعت صرف خدا کی کروں گا، تمہاری نہیں! اور
ب تک مجھے زندگی اور قوت حاصل ہے میں یہ تعلیمات
پھیلانے سے ہرگز باز نہیں آؤں گا۔ کیونکہ تم جانو کہ
خدا کا حکم ہے اور میں اعتقاد رکھتا ہوں کہ میری
فرمانبرداری خدا سے عظیم تر کوئی بھلائی اس ریاست میں
ہیں پائی گئی۔ اے حاکمانِ ایتھنز! اگر آپ لوگ یہ
سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر آپ کسی کو اپنی
اسد زندگیوں پر ملامت کرنے سے روک سکیں گے تو
آپ غلطی پر ہیں۔ فرار کا یہ طریقہ نہ تو ممکن ہے،
عزت مندانہ، آسان اور شریفانہ راستہ
یہ نہیں ہے کہ آپ دوسروں کو بے بس
کردیں؟ بلکہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو بہتر
بنائیں۔ اب ہمارے جدا ہونے کی گھڑی آ
گئی ہے اور ہم اپنے اپنے راستے پر مڑ جانے
والے ہیں —— میں مرنے کے لئے اور آپ
جینے کے لئے!
کون سا راستہ بہتر ہے، یہ صرف خدا جانتا ہے۔

سقراط

سزائے موت کا فیصلہ ہو جانے پر آخری تقریر

اگر میری ہزار جانیں بھی ہوتیں تو میں انہیں اسلام کے
لامتناہی حقائق میں سے ایک حقیقت پر بھی قربان کر
دینے سے پس و پیش نہ کرتا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا
کہ میں تو ایک طالب حق ہوں۔ میں ہر چیز کو شریعت
کی میزان میں تولوں گا، میں ایسی کسی بات کو تسلیم
نہیں کروں گا جو اسلام سے خارج ہو۔ میں اس
وقت برزخ کے سامنے، جسے تم لوگ جیل کہتے
ہو کھڑا ہوں اور اس گاڑی کے انتظار میں
ہوں جو مجھے آخرت کی جانب لے جائے اور
میں جو کچھ تمہیں کہہ رہا ہوں یہ اس لئے نہیں کہ
صرف تم اسے سن لو بلکہ اس لئے کہ یہ تمام
دنیا کے علم میں آجائے۔
وقت آگیا ہے کہ اسرار منکشف ہو جائیں اور
دل کی گہرائیوں سے باہر آجائیں پس جو غیر محرم ہے
وہ ان کی طرف نہ دیکھے۔
میں سفر آخرت کے لئے پورے شوق کے ساتھ تیار کھڑا
ہوں اور ان لوگوں کی معیت کے لئے حاضر ہوں جو سولی
پہ چڑھائے جا چکے ہیں تم اس بدوی کا تصور کرو
جسے استنبول دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا مجھے بھی آخرت میں
پہونچنے کا شوق ہے تم لوگوں کا مجھے جگہ جگہ جلاوطن کر
دینا کوئی سزا نہیں اگر سزا دے سکتے ہو تو میرا ایمان کمزور کردو

بدیع الزماں نورسی (ترکی)

کا عدالتی بیان ۱۹۰۹ء

جس وقت ہم نے
۱۹۴۱ء میں
اپنے کام کا آغاز کیا تھا
اس وقت ہمیں پورا اندازہ تھا کہ ہم
کیا کرنے چلے ہیں اور اس کا خیر
مقدم دنیا میں ہمیشہ کس طرح ہوتا آیا
ہے۔ اس لئے ہم پہلے ہی اس راستہ کی
آزمائشوں کے لئے تیار ہو چکے تھے البتہ
افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اس وقت کے
راستے میں مزاحمت کا شرف خود مسلمانوں کو
حاصل ہو رہا ہے دوسرے اگر یہ کام کرتے تو
کچھ عجیب بات نہ ہوتی لیکن اپنوں کے لئے
بظاہر ایک عجیب چیز ہے ——
بہر حال —————— دنیا
کی تاریخ میں یہ کوئی پہلا ہی موقع نہیں
ہے کہ کچھ خدا کے بندوں کو وہی لوگ تکلیف
پہونچانے کے لئے تیار ہو جائیں۔
جن کی
فلاح و بہبودی کے لئے
وہ کام کرنے اٹھے ہوں یہ پہلا
موقع نہیں ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱۹۴۸ء

ہماری نظر میں

قصص النبیین (عربی) تالیف :- مولانا ابوالحسن علی ندوی (حصہ اول) ضخامت ۴۶ صفحات، قیمت ۸۵ پیسے — (حصہ دوم) ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت ۸۸ پیسے۔ ملنے کا پتہ :- مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

انبیاءِ کرام کے وہ قصے جو قرآن شریف میں بیان ہوئے ہیں ان دونوں کتابوں میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اُن کو نہایت ہی سادہ مگر دلنشین اور اثرانگیز انداز میں پیش کیا ہے، قصوں کی زبان عرب کے مشاہیر ادیبوں جیسی ہے، قصوں کے پس منظر اور مکالموں کے درمیان قرآن کریم کی آیتیں انگوٹھی میں نگینوں کی مانند جگ مگ کر رہی ہیں ان قصوں کے پڑھنے سے عربی زبان دانی میں بصیرت پیدا ہوتی ہے اور ساتھ ہی عبرت و موعظت کے دریچے ذہن و فکر پر کھلتے ہیں، یہ کتابیں بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں مگر ان سے علماء تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جامعہ ازہر (مصر) کے پروفیسر شیخ احمد الشرباصی نے ان دونوں حصوں پر مقدمہ لکھا ہے اور مولانا علی میاں کے اسلوب نگارش اور دینی فکر کو سراہا ہے

قصص النبیین کے متعدد ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ دوسرے حصہ کا چھٹا ایڈیشن (طبع سادس) ہمارے سامنے ہے، یہ دلیل ہے اس کتاب کی مقبولیت کی، یہ کتاب اعراب کے ساتھ خوش نما ٹائپ پر چھپی ہے، پاکستان اور ہندوستان کے عربی مدارس کے نصاب میں "قصص النبیین" شامل ہونی چاہئے۔

پیارے رسولؐ کی پیاری باتیں مرتبہ :- مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی۔
ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت ۷۵ پیسے
ملنے کا پتہ :- مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ، لاہور

اس کتابچہ میں وہ مبارک دعائیں۔ عربی متن اور اردو ترجمہ کے ساتھ درج کی گئی ہیں جو حضور خاتم النبیین سید الاولین و الآخرین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معمول رہی ہیں۔ ساتھ ہی مسنون نماز کی ترکیب بھی اس کتاب میں شامل ہے، اس کتاب کی ہر دعا حرزِ جاں بنانے کے قابل ہے، آج کل "بے خوابی" (INSOMNIA) کی مرض کی عام شکایت ہے اس لئے افادہ عام کے پیش نظر اس مرض کے ازالہ کے لئے دعا نقل کی جاتی ہے :-

"حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بے خوابی کے عارضہ کی شکایت کی، تو آپ نے فرمایا یہ دعا پڑھ لیا کرو۔
اَللّٰھُمَّ غَارَتِ النُّجُوْمُ وَھَدَأَتِ الْعُیُوْنُ وَاَنْتَ حَیٌّ قَیُّوْمٌ لَا تَاْخُذُکَ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ اَھْدِئْ لَیْلِیْ وَاَنِمْ عَیْنِیْ"

حضرت زید فرماتے ہیں، اس پر عمل کرنے سے میری تکلیف رفع ہوگئی (ص ۹)

للہ تعالیٰ اس کتابچہ کے مرتب اور ناشر کو دارین میں اجر عطا فرمائے گا۔

تفسیر نوری سورۃ الفاتحہ

از :- مولانا سید نوری شاہ چشتی القادری، ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت ۵۰ نئے پیسے

ملنے کا پتہ :- سید محمد عارف الدین نوری، حیدرآباد دکن ۵

کتاب کے سرورق ہی پر لکھا ہے کہ "تفسیر نوری، بطرز معارف"! مگر رموز و معارف اور تصوف کا رنگ تفسیر میں گہرا ہونے نہیں پایا

ب کے آخر میں مولانا سید نوری شاہ صاحب کے بڑے صاحبزادے نے اعلان کیا ہے —

"یہ نورانی خیالات جو ہمارے ہاتھوں میں ہیں فی الحقیقت حضرت قبلہ کی یہ کوئی ارادی تصنیف نہیں ہے، بلکہ حضرت مرشدی و مولائی والدی کے ان تعلیمات کا مجموعہ ہے جن کو حضرت قبلہ نے بر حین دورۂ تبلیغ پانڈی چیری و ٹامل ناڈمیں اہل سلسلہ کو فرما رہے تھے"

ب کی زبان میں دکنی اردو کی جھلکیاں جگہ جگہ ملتی ہیں — "پھر وہ کون سا صراط مستقیم ہے" (ص ۲۲) حالانکہ "صراط" مونث ہے — بندہ انابت کی راہ سے عبادت کیا (ص ۲۳) لکھنا یوں چاہیے، "بندہ نے انابت کی راہ سے عبادت کی" — "ماسوا اللہ سے تٹ کر اللہ ے جُٹ جائے" (ص ۲۵) صحیح زبان یہ ہے — "ماسوا اللہ سے ٹوٹ کر اللہ سے جُڑ جائے" — "جُٹ جائے" میں تو قدرے ذم کا بلو نکلتا ہے اور یہ "تٹ" تو عجیب زبان، ہجہ اور رسم الخط ہے! — اس کتابچہ کی یہ عبارت :—

"ایک بولنا الحاد ہے، دو بولنا اشراک ہے، دونوں کو نفی ایمان ہے، کچھ ان سے جھک، کچھ یوں سے جھک، جب یار تیرے ہاتھ ہے"

شکی — اللہ تعالیٰ کو ایک بولنا الحاد کیوں ہے؟؟ یہ تو "معطلین" کا مذہب ہے کہ وہ صفات الٰہی کی یہاں تک نفی کرتے ہیں کہ اُسے "واحد نہ احد" تک کہنے کو جائز نہیں سمجھتے، مگر قرآنِ کریم تو اس عقیدہ کی نفی کرتا ہے۔

اقامتِ صلوٰۃ

مرتبہ :- مولانا ابوالحسین اور مولانا محمد عبدالحلیم قاسمی، ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ :- جامعہ حنفیہ قاسمیہ ٹمپل روڈ، لاہور

اس کتابچہ میں — "نماز کی اہمیت، فرضیت نماز کی شرائط، فرائض واجبات سُنن اور دیگر ضروری مسائل کو مستند اور سان طریق پر کتاب و سنت اور مذہب حنفیہ کے تحت پیش کیا گیا ہے" — اپنے موضوع پر یہ کتاب ہر اعتبار سے کارآمد اور لائق استفادہ ہے، "امام کو اگر سجدۂ سہو نکالنے کی ضرورت پیش آئے" (ص ۷۰) "سجدہ نکالنا" غلط زبان ہے، صحیح زبان و محاورہ اور روزمرہ "سجدہ کرنا" ہے! کتاب کی زبان آسان اور عام فہم ہے، جس سے معمولی لکھے پڑھے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

قرآن حکیم کا عمرانی فلسفہ

از مولانا محمد فضل الرحمٰن انصاری قادری، ضخامت ۴۴ صفحات قیمت ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ :- المرکز الاسلامی ۲ ماسٹر ٹاؤن سمرسٹ اسٹریٹ کراچی ۳

اس کتابچہ میں سورۃ والعصر کی تفسیر "عمرانی انداز و اسلوب" پر کی گئی ہے، طرز بیان خالص علمی اور سائنٹیفک ہے۔ ڈاڈس، مالی نوسکی گولڈن وائزر، سوروکن اور میکس ویبر وغیرہ مستشرقین کی کتابوں کے حوالے لائق مفسر کی وسعت مطالعہ کا اتا پتا دیتے ہیں ظاہری صورت

ڈگیٹ اپ) کے اعتبار سے بھی یہ کتابچہ کتابت وطباعت کا مثالی حسین نمونہ ہے۔

تھوڑی دیر اہلِ حق کیساتھ

از:- جناب یونس نگرامی، ضخامت ۱۴۶ صفحات، قیمت ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ طیبہ بی ۲۰۷/۲۸ ڈیوڑھی آغا میر، لکھنؤ

اس کتاب کی پہلی جلد پر "فاران" میں تبصرہ ہو چکا ہے اب یہ دوسری جلد اسی انداز پر دیدہ زیب کتابت وطباعت کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے، اس میں اولیاء کرام کی سیرت وزندگی کے ایمان افروز اور عبرت آموز واقعات سلیس اردو میں پیش کئے گئے ہیں۔

"مشہور عباسی خلیفہ کو سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا عقیدت تھی، ایک مرتبہ ایک شخص رومال میں جوتا لپیٹ کر لایا اور کہا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک ہیں اور آپ کی خدمت میں لایا ہوں مہدی نے اس کو لے کر بوسہ دیا اور آنکھوں سے لگایا اور لانے والے کو انعام سے مالا مال کر دیا اس کے جانے کے بعد حاضرین سے مہدی نے کہا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ اس جوتے پر حضور کی نگاہ بھی نہیں پڑی ہے، پہننا تو درکنار لیکن چونکہ اس نے ذات نبوی کی طرف انتساب کر دیا تھا اس لئے میں نے لے لیا ہے" (ص ۱۴۴)

خلیفہ مہدی کے اس واقعہ کو نقل کرنا نہیں چاہئے تھا! جس طرح کسی غلط حدیث کو صرف "قال رسول اللہ" کی لفظی نسبت کے سبب قبول نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح جانتے ہوئے کہ فلاں چیز (جوتا، پیالہ، جبہ وغیرہ) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غلط طور پر منسوب کیا گیا ہے اس غلط نسبت کا احترام نہیں بلکہ اس کی تردید کرنی ضروری ہے۔

اسلام اور فطرت

از:- مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی، ضخامت ۱۲۴ صفحات، قیمت:- دو روپے پچیس پیسے۔
ملنے کا پتہ:- ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور

اس کتاب میں عقلی اور نقلی دلائل سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام دین فطرت ہے، مندرجہ ذیل عنوانات سے اس کتاب کی علمی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فطرت کیا ہے؟ فاطر کا مطلب، قرآن اور انسان کے فطری رذائل، فطرۃ اللہ، عقل کی فطرت، نیکی اور بدی کے نتائج کا قانون، اخلاق ومعاملات کا باہمی ربط، عائلی زندگی، زن ومرد کا فطری فرق، اخلاق اور فطرت . . . ـ!

اس کتاب کا ایک اقتباس:-

"اسی طرح صفات محمودہ کے غلط استعمال سے وہ صفات غیر محمود ہو جاتی ہیں۔ رحم بڑی اچھی اور فطری صفت ہے، لیکن بچھو اور سانپ یا درندے کے ساتھ یہ سلوک رحم کیا جائے تو محمود نہیں کہا جائے گا، سخاوت بڑی نیک صفت ہے لیکن اگر بے جا عیاشیوں کے لئے یہ سخاوت کی جائے اور دوسرے مستحقین محروم ہو جائیں تو یہی صفت غیر محمود ہو جائے گی، غرض جس طرح صفاتِ محمودہ کے لئے غلط محل استعمال موجود ہیں، اسی طرح صفاتِ رذیلہ کے لئے صحیح محل استعمال بھی موجود ہیں، فنا کسی جذبے کو بھی نہیں کرنا ہے، بلکہ اس کی سمت صحیح کر دینی ہے۔"

پوری کتاب حکمت ودانش سے لبریز ہے، مثالیں دل نشین، استدلال وزنی اور اسلوب نگارش دل میں اتر جانے والا ہے! کیسے کیسے نفسیاتی

طوں کا فاضل مصنف نے ازالہ کیا ہے ! اس کتاب میں اللہ تعالیٰ کے وجود پر بھی جگہ جگہ عقلی دلیلیں ملتی ہیں اور سائنس دانوں کی اِس سطح کو بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ انہیں کائنات میں فطرت تو دکھائی دیتی ہے مگر "فاطر" نظر نہیں آتا۔ اور یہ اصول کس طرح قابل فہم ہو سکتا ہے کہ رحمت ورحیم نہ ہو "۔

"اسلام اور فطرت" اس قابل ہے کہ اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جائے، عصر حاضر کا ذہن جس قسم کے عقلی دلائل سے مطمئن ہوتا ہے وہ دلائل اس کتاب میں موجود ہیں! مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی اس تصنیف پر تبریک وتحسین کے مستحق ہیں! ادارۂ ثقافت اسلامیہ کو بینکوں کے سود کے مسائل کی بجائے اسی قسم کے موضوع پر کتابیں پیش کرنی چاہئیں کہ ایسی کتابوں سے عقیدہ وفکر اور سیرت کی ایک طرف اصلاح ہے اور دوسری طرف اسلام کی حقانیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔

اعلام مرفوعہ

از :- مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، ضخامت ۵۶ صفحات، قیمت ۵۷ نئے پیسے۔
ملنے کا پتہ :- مجلس علمی جامعہ مفتاح العلوم مئو اعظم گڑھ۔ یو۔ پی۔ انڈیا۔

کتاب کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے :-

"ایک مجلس کی تین طلاقیں چاہے بیک لفظ دی جائیں، یا بالفاظ متعددہ وہ واقع ہو جاتی ہیں اور تین طلاقوں کے بعد چاہے وہ جس طرح دی گئی ہوں رجعت کرنا شرعاً ممکن نہیں ہے، شریعت کا یہ وہ مسئلہ ہے جس پر اہل سنت والجماعت کے ہر چہار امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا اتفاق ہے اور نہ صرف یہی ہیں بلکہ دیگر اکابر ائمہ فقہ وحدیث مثلاً امام اوزاعی، وامام شام / امام نخعی، امام ثوری، امام اسحٰق، امام ابوثور، امام بخاری کا بھی یہی قول ہے بلکہ جمہور صحابہ وتابعین وجمہور ائمہ سلف وخلف اسی کے قائل ہیں"۔

یہ کتاب اسی فقہی اصول کی تشریح ہے، فاضل مصنف نے دلائل سے اس مسئلہ کو ثابت کیا ہے! کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں دئے جانے سے ایسی طلاق واقع ہو جاتی ہے جو قابل رجعت نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں احادیث کی نوعیت کیا ہے؟ راوی کس حیثیت کے ہیں؟ اُن پر جو جرح کی گئی ہے اس کی تعدیل کس طرح ممکن ہے؟ یہ تمام علمی اور فنی مباحث اس کتاب میں ملتے ہیں، علامہ ابن قیم پر جگہ جگہ لائق مصنف نے نقد واحتساب کیا ہے!

"مجھے اندیشہ ہے کہ مخالفین زمانہ میرے مواخذات سے گھبرا کر کہیں یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ امضائے ثلث کو سیاسی و تعزیری حکم قرار دینا علامہ ابن القیم کی ذاتی رائے ہے اور ہم کو ان کی رائے سے اتفاق نہیں ہے ــــــ علامہ ابن القیم کی یہ رائے غلط ہے، صحیح بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہی فتویٰ تھا کہ تین یکجائی طلاقیں تین ہی ہیں اور اس کے بعد رجعت جائز نہیں ہے، لیکن حضرت عمرؓ سے اس مسئلہ میں خطائے اجتہادی سرزد ہوئی ہے اس لئے میں پہلے ہی اُن کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ اس بے باکی کا خطرہ بھی اپنے دل میں نہ لائیں اور ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ امضائے ثلث میں حضرت عمرؓ منفرد نہیں تھے۔ بلکہ سارے صحابہ کرام اُن کے ساتھ تھے ـــ"

یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع اور مدلل ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے ہر پہلو سے اس مسئلہ کی تحقیق کی ہے، اس موضوع پر یہ جامع کتاب ہے!

گلدستہ قرآن وحدیث

از :- ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی ، ضخامت ۹۶ صفحات ، قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ :- مکتبہ کلیمیہ بازار نورالامرا حیدرآباد دکن ۲۴ (بھارت)

اس کتاب میں قرآن مجید کی ایسی مختصر اور فرصت آیتیں اور حدیثیں جمع کی گئی ہیں جو بچوں اور بچیوں کی نفسیات اور ماحول کے مطابق ہیں! آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا اردو ترجمہ سادہ اور عام فہم ہے ، دکن میں انگریزی الفاظ کو اس طرح لکھا جاتا ہے ۔۔۔ فیکٹری کو فیاکٹری ، ہیٹ کو ہیاٹ ، اس رسم الخط کے اتباع میں اس کتاب میں بھی "چیلنج" کو "چیالنج" (ص ، ۷) لکھا گیا ہے ۔

زینوا القرآن باصواتکم
تمہاری خوش الحانی سے قرآن شریف کو زینت دو (ص ۶۸)

"تمہاری" کی جگہ "اپنی" لکھنا تھا ! یہ کتاب واقعی قرآن وحدیث کا گلدستہ ہے جس میں جگہ جگہ اخلاق وحکمت کے پھول بہار دے رہے ہیں۔

مسلمانوں کی ایجادیں

از :- محمد حفیظ اللہ پھلواروی ، ضخامت ۴۸ صفحات ، قیمت ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ :- دفتر یونیٹی وانصاف ۸۷ لیاقت بازار ، کراچی

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے کن علوم وفنون اور چیزوں کو ایجاد کرکے تہذیب وتمدن کو ترقی دی اور مدنیت کو فائدہ پہونچایا ــــــ مثلاً "منطق استقراء" کا سہرا اہل یورپ نے لارڈ بیکن کے سر باندھ دیا ہے ، مگر حقیقت میں امام غزالی نے اپنی تصنیفات میں "استقراء" کی بنیاد ڈالی ہے ۔ ـــــ اور دنیا کے سب سے پہلے گزیٹر کا مصنف شہنشاہ اکبر کے زمانہ کی مشہور شخصیت "ابوالفضل" ہے ، کتاب مختصر ہونے کے باوجود جامع اور مفید ہے ، اب سے تقریباً پچاس سال قبل علامہ عمادی مرحوم اس موضوع پر "صنعت العرب" کے نام سے ایک رسالہ لکھ چکے ہیں ۔

یزید ابن معاویہ

از :- ابن تیمیہؒ ۔ ترجمہ :- جمیل احمد ندیم ایم اے ، ضخامت ۲۰ صفحات ، قیمت ۸۰ پیسے
ملنے کا پتہ :- ابن تیمیہ اکیڈمی ایف ون ۱۹/۴ ملیر اکسٹینشن کراچی ۲۷

یہ دور جس سے ہم گذر رہے ہیں سیاسی انتشار اور سماجی فساد کی طرح فساد عقائد واعمال کا بھی زمانہ ہے ، نئے نئے فتنے ابھر رہے ہیں اور پرانے فتنوں کا اعادہ ہو رہا ہے ۔ یزید ابن معاویہؓ جیسے ناپسندیدہ شخص کو آج "ناصبیت" نے صلاح وامت کا مقام عطا کر دیا ہے ! امام ابن تیمیہ رحمتہ اللہ کے زمانہ میں یہ فتنہ ابھرا تھا اور امام موصوف سے فتویٰ پوچھا گیا تھا کہ کیا یزید صحابی تھا ؟ امام ابن تیمیہؒ نے اس کے جواب میں ایک رسالہ لکھا ، جو دمشق کی "المجمع العلمی" نے شائع کیا ہے ! کتاب زیر تنقید میں رسالہ مذکور کا عربی متن اور اس کے ساتھ اردو ترجمہ درج ہے کتاب کے آغاز میں علامہ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ کے سوانح حیات پیش کئے گئے ہیں ، ۔

اس کتاب کے چند اقتباسات :ــــ

- ــــ "یزید بن معاویہ بن ابوسفیان جو اپنے والد معاویہ بن ابوسفیان کے بعد تخت خلافت پر بیٹھا صحابی نہیں تھا" ہاں ! البتہ اس کے چچا یزید بن ابوسفیان صحابی تھے "
- ــــ "اسی یزید کے زمانہ خلافت میں امام حسینؓ شہید ہوئے ، یہی وہ یزید ہے جس کے اور اہل حرہ کے درمیان حادثہ جانگداز پیش آیا تھا ، یہ صحابی نہ تھا ۔ نہ اصفہ خلفاء راشدین ، مہدیین میں اس کا شمار ہوتا ہے ، دیگر اموی اور عباسی خلفاء کی طرح یہ بھی ایک اموی خلیفہ ہے "

- ــــ "اگر کوئی شخص یزید کے بارے میں "امام ابن امام" کہتا ہے، ایسی صورت میں اگر اس کی مراد صرف یہ ہے کہ دیگر اموی اور عباسی خلفاء کی طرح اس نے بھی عنانِ حکومت سنبھالی تھی تب تو ٹھیک ہے ورنہ نہیں، اس میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے مدح وثنا اور تعظیم وتفضیل لازم آتی ہو۔"
- ــــ "ایک بار امام احمد بن حنبل سے یزید کے متعلق پوچھا گیا کہ اس سے حدیث کی روایت کی جائے؟ آپ نے فرمایا نہیں وہ اس قابل نہیں ہے، جس نے اہل حرہ کے ساتھ وہ فعل قبیح کیا، جو کیا۔"
- ــــ ایک روز امام حنبل سے ان کے صاحبزادے نے پوچھا ــــ

"لوگ کہتے ہیں کہ ہم یزید سے محبت کرتے ہیں"

آپ نے جواب دیا، "کیا کوئی شخص جس میں ذرا سی بھی نیکی ہے، وہ یزید سے محبت کرسکتا ہے! اس ـ النکے صاحبزادے بول پڑے "پھر کیوں نہیں آپ اس پر لعنت کرتے! امام حنبل نے مختصر سا جواب دیا ۔۔

کیا تم نے اپنے باپ کو کسی پر لعنت کرتے دیکھا ہے؟

- ــــ اس کے باوجود یزید نے نہ توقتل حسینؓ کا حکم دیا تھا اور نہ اس کے سامنے آپ کا سر مبارک لایا گیا اور نہ آپ کے دندانِ مبارک کو اس نے چھڑی لگائی ۔ ۔ ۔"

حق تو یہ ہے کہ یزید ناپسندیدہ کردار کا حامل ہے اور اس سے ظلم کی نسبت غلط نہیں ہے، یزید کے بیے مرد مومن کے دل میں احترام و بندگی کا جذبہ پیدا نہیں ہونا چاہئے، ہم نہ تو اس پر لعنت بھیجتے ہیں اور نہ اس کی مدح وتوصیف کرتے ہیں۔

از: ـ گنگا پرشاد اپادھیائے، ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت پانچ روپے ـ

ماخذ الاسلام ملنے کا پتہ: ـ ٹریکٹ وبھاگ آریہ سماج چوک الٰہ آباد (بھارت)

یہ بڑی فریب آمیز کتاب ہے جو اسلام کی تکذیب وتنقیص میں لکھی گئی ہے، فریب آمیز اس لئے ہے کہ قرآن، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی تعریف کے پردہ میں اسلام کو جھٹلایا گیا ہے، گنگا پرشاد صاحب اپادھیائے (ایم۔اے) کا یا تو قرآن وحدیث کا خاصہ مطالعہ ہے، غالباً ترجموں کی مدد سے نہیں براہ راست یا پھر کسی ایسے مسلمان کا اس کتاب کی تصنیف میں ہاتھ ہے، جو کتاب وحدیث کا علم رکھتا ہے مگر اس پہ انکار والحاد کا غلبہ ہو گیا ہے ـ

اس کتاب میں لکھا ہے ــــ

"اس لئے باوجود اس کے کہ ہم قرآن شریف کی بہت سی باتوں کے مداح ہیں، دیگر ہم قرآن شریف کو محمد صاحب کا ہی کلام سمجھتے ہیں اور محمد صاحب کو عربی ادب کا ایک مشہور ادیب تصور کرتے ہیں"

حالانکہ جو کوئی عربی زبان وادب کا ذوق رکھتا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور قرآن کریم کے زبان وادب اور اسلوب بیان میں فرق محسوس کرسکتا ہے! ـ

قرآن کریم پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ قرآن میں راون، کنس وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ہے، یہ (معاذ اللہ) اس کا ثبوت ہے کہ اس کا عام انسانی جماعت سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں، معترض کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کریم میں چین، بھارت، جاپان، روس وغیرہ ملکوں کا قدیم

تہذیب و تاریخ کا ذکر آنا چاہئے تھا! یہ اعتراض نتیجہ ہے سطح بینی اور اسلام دشمنی کا، قرآن کریم تاریخ و جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے، وہ تو صحیفۂ ہدایت و موعظت ہے اُس میں چند سرکش و نافرمان قوموں اور چند ظالم اور حق ناشناس شخصیتوں کے ذکر پر کفایت کی گئی ہے کہ عبرت و ہدایت کے لئے اتنا تذکرہ کافی ہے! پھر قرآن کریم کے جو مخاطبین اولین تھے، جن کو قرآنی اخلاق کی بنیاد پر "صالح امت" بنانا تھا۔ جو حاملین قرآن بھی تھے، اُن کے ذہن و فکر اور ماحول کی بھی رعایت ضروری تھی، دنیا کے تمام ظالموں اور خدا کے باغیوں کی قریب قریب ایک سی فطرت ہوتی ہے لہٰذا چند ظالموں اور نافرمانوں کا تذکرہ ہر ملک اور خطہ کے ظالموں کی سیرت و کردار سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

مصنفِ کتاب شری اپادھیائے جی قرآن کریم کو الہامی کتاب نہیں مانتے اس اپنی حق ناشناسی سے یہ وہ مطلب نکالتے ہیں کہ عیسائیوں اور یہودیوں سے حضرت محمد نے فرشتوں کے بارے میں سن لیا تھا، سوال یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر تک آپ ان سُنی ہوئی باتوں کو کیوں چھپائے رہے، اعلان نبوت سے قبل اس قسم کی کوئی بات آپ کی زبان سے نہیں سُنی گئی، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ حضور مہبطِ وحیٔ الٰہی تھے۔ جب آپ پر وحی آئی تو آپ نے ایمان، ملائکہ، آخرت وغیرہ پر اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی آیتیں لوگوں کو سنائیں۔

"اب رہے چوتھے حضرت ابوبکر صدیق، آپ ایک باثروت بااثر بزرگ ہستی تھے، لیکن شاید اُن کی مثال دولت مند اور محترم سیٹھ سے دی جاسکتی ہے جو ضعیف الاعتقادی کے لئے مشہور ہیں اور کسی نئے سادھو کے بآسانی مطیع ہو سکتے ہیں۔"

یہ دنیا کا کیا کوئی مسلّمہ ہے کہ ہر دولت مند آدمی "ضعیف الاعتقاد" ہوتا ہے، حضرت ابوبکر کا تو قریش کے صاحب الرائے لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ پھر ایک دوست کی حیثیت سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جوانی دیکھی تھی، حضور کے حالات سے رتی رتی بھر واقف تھے، حضور کی دعوت پر کسی ردوکد کے بغیر اُن کا ایمان لے آنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے اور انتہائی نیک اور پاکباز ہونے کی دلیل ہے، جب آدمی کی مت ماری جاتی ہے اور ذہن و فکر مسخ ہو جاتے ہیں تو صاف اور سچی بات سے وہ الٹا مطلب نکالتا ہے۔

"جب حضرت محمد صاحب دنیا میں تھے، تو اُن کی تعظیم و تکریم ہمارا عین فرض تھا، لیکن آج مسلمانوں نے اپنے کلمہ کے اندر محمدؐ صاحب کو بھی شامل کر رکھا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا ہمارا کوئی معبود نہیں تو اللہ حاضر و ناظر ہے، وہ ہماری بات سنتا ہے، لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ محمد صاحب ہمارے رسول ہیں اور اس جملہ کو اللہ کے کلمہ کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں تو حضرت محمد صاحب ہماری بات سنتے نہیں، اللہ کے تصور کے ساتھ محمدؐ صاحب کا بھی تصور اسی وقت ہمارے دل کے سامنے آجاتا ہے، پھر توحید کہاں رہی؟" (ص ۲۲۴)

اسے کہتے ہیں مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ! اس اعتراض کی کوئی کل بھی سیدھی ہے! کلمہ میں اس کا اقرار کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اس سے توحید پر کیوں حرف آنے لگا؟ جب کوئی یوں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو بنایا تو یہ کہتے ہی آسمان و زمین کا تصور سامنے آجاتا ہے کیا یہ تصور "توحید" کی نفی کرتا ہے؟

اسی قسم کے لغو اعتراضات اور خرافات سے یہ کتاب بھری پڑی ہے، مگر وہ مسلمان جن کا مذہبی مطالعہ زیادہ نہیں ہے اور دین کی سوجھ بوجھ نہیں رکھتے وہ اس کتاب کے پڑھنے سے شک میں مبتلا ہو سکتے ہیں، ہندوستان کے علماء کو چاہئے کہ وہ اس کی رد میں کتابیں لکھیں!

اس کتاب کے مصنف نے مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت، سر سید احمد خاں اور غلام جیلانی برق کے اقوال سے استدلال ہے، افسوس ہے ہمارے تجدد پسند اہل قلم کی جدت طرازیاں اور گمراہیاں اہل کفر کو کیسے کیسے ہتھیار فراہم کرتی ہیں۔

پکار

از :۔ اسعد گیلانی، ضخامت ۱۰۴ صفحات، قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

ملنے کا پتہ :۔ ادارۂ ادب اسلامی سرگودھا۔

اس کتاب میں جناب اسعد گیلانی کے ۷ مضامین یک جا کئے گئے ہیں، ہر مضمون اپنے اندر ادبیت ہی نہیں دینی افادیت بھی رکھتا ہے یہ مضامین ہلکے پھلکے اور عام فہم ہیں، جن سے معمولی استعداد کے لوگ بھی استفادہ کر سکتے ہیں! خاص طور سے مسلمان گھرانوں اور دینی مدرسوں میں یہ کتاب پہونچنی چاہیے۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے ملک کے علماء سو سے مودبانہ گزارش کروں کہ اے منبر رسول پر قابض بزرگو! اور اے امت مسلمہ کی رہنمائی کے مدعیو! یہ دین کے منبر کو چھوڑ کر دنیا پرستوں کی کاروں کے پیچھے دوڑنے میں تم اتنے اوچھے کیوں ہو گئے ہو، کوئی غرض پرست ایسا نہیں رہا، جس نے اپنے اعمال قبیحہ کے جواز لئے تم میں سے ہی نہ کسی کو دینِ قیم کا استہزاء کرنے کے لئے مامور نہ کر رکھا ہو۔"

میں تم سے کیا کہوں کہ تم نے ہر قدم پر اللہ اور اس کے نبیؐ کے احکام سنائے اور پھر ہر قدم پر انہیں احکام سے چشم پوشی کی، تم نے شاہوں کو للکارا اور انہیں کے ہاتھوں بک گئے، تم نے حق کی پشت پناہی کی اور اس کو پیٹھ دکھا گئے۔"

اس مختصر سے اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "پکار" وقت کی آواز اور دین کی پکار ہے۔

ضربِ آتشیں

از :۔ قمر ساحری، ضخامت ۱۵۲ صفحات، قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ سعدی نیو بلڈنگس اعظم آباد، حیدرآباد ۲۰ (ہندوستان)

جناب قمر ساحری کا مجموعۂ کلام خاصے ظاہری اہتمام سے منظر عام پر آیا ہے، جناب سجاد ظہیر نے اس پر پیش لفظ اور جناب ظ انصاری نے مقدمہ لکھا ہے! قمر ساحری کی نظموں میں جوش و ولولہ اور غزلوں میں سوز پایا جاتا ہے! اس نوجوانی میں بھی بعض مقامات پر وہ رسیدہ پختہ مشق فن کار نظر آتے ہیں۔

منتخب اشعار :۔

کرنیں برسائے گا اس طرح سحر کا پرچم
وقت تاریخ کے ماتھے سے لہو دھوئے گا

بھوک فوجوں سے ڈر نہیں سکتی
بھوک گولی سے مر نہیں سکتی

کوئی دم میں ختم یہ فسطائیت ہونے کو ہے
اہلِ زنداں صبر! صبحِ حریت ہونے کو ہے

کور چشموں میں مانی و بہزاد
جہل زادوں میں حافظ و خیام

جب بھی اٹھا چمن کے لئے خون کا سوال
سو رہ کے بار بار پکارے گئے ہیں ہم

یہ کیسی بزم کہ انصاف ہے یہاں معدوم
شراب ساز ہی خود ہیں شراب سے محروم

وہ زندگی عذابِ مسلسل نہیں تو کیا　　جس زندگی میں کوئی تصورِ حسیں نہیں
یہ فکرِ صبح و شام یہ آزارِ کشمکش　　دنیا بہشت ہو کے بھی دوزخ سے کم نہیں
جانے کیوں ڈرتے ہیں اربابِ حکومت مجھ سے　　میرے ہاتھوں میں قلم ہے ابھی تلوار نہیں
فصلِ بہار ہم تو تہی دست ہی رہے　　وحشت ملی تو چاکِ گریباں نے چھین لی
وہ اک خلش کہ جس سے تھی تسکینِ دل ہمیں[1]　　تیری نگاہِ زود پشیماں نے چھین لی
مے سے غرض نشاط یقیناً تھی ہم نشیں　　وہ بھی نوازشِ غمِ دوراں نے چھین لی
جن کے پیشِ نظر کوئی منزل نہ تھی　　ہر زمانے میں اُن کو بدلنا پڑا
اک وہ کہ ذکرِ تلخیٔ دوراں نہ سُن سکے　　اک ہم کہ مسکراتے ہوئے زہر پی گئے
خیر! بُزدلوں کا ذکر ہی کیا ہے　　اچھے بھی بدنام بہت ہیں

دُوسرا رُخ :

روحِ دہقان کی بیدار نظر آتی ہے　　اب درانتی بھی چمک دار نظر آتی ہے

کسانوں کی درانتیاں جب کند ہو جاتی ہیں تو وہ انہیں لوہار کے یہاں جا کر اس کی دھار کو تیز کراتے رہتے ہیں اور اس طرح درانتیاں چمکدار ہوتی رہتی ہیں! اس واقعیت کو ذہن میں رکھ کر اس شعر کا مصرعہ ثانی پڑھیے اور سوچیے کہ شاعر نے کوئی ٹھکانے کی بات نہیں کہی یعنی روحِ دہقان کے بیداری سے درانتی کے چمکدار ہونے کا کوئی ربط اور واسطہ نہیں ہے۔

مصیبتوں پہ تری حکمرانیاں تسلیم　　مگر پنپ نہ سکے گا یہ احتسابِ عظیم (ص ۲۸)

احتساب اور وہ بھی عظیم، پھر اس کا پنپنا . . . یہ آخر بات کیا ہوئی! اس طرح کون بولتا ہے کہ فلاں شخص کی دارو گیر یا احتساب یا گرفت پنپ رہی ہے، مفہوم شعر میں سلیقہ کے ساتھ ادا ہونا چاہیے۔

ذرا بتائیں تو دار و رسن کے سوداگر　　کہیں مٹی ہے کسی سے عوام کی تنظیم (ص ۲۸)

"دار و رسن کے سوداگر" کوئی شک نہیں نئی ترکیب ہے مگر کتنی نامانوس اور خلافِ واقعہ! مصرعہ ثانی تو مشقوں کے کہنے کا تھا۔

اور صالح سے اونٹنی لے کر　　دشمنوں کو کھلا دیا تو نے
خاک داؤد کو کھلا ڈالی　　خوب دی دادِ آوریا تو نے (ص ۹۰)

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ زبان و روزمرہ کے اعتبار سے غلط ہے، "صالح سے اونٹنی لے کر، دشمنوں کو کھلا دی" یہ ہے صحیح زبان! دوسرا شعر نرا بھرتی کا ہے!

غرور زر کا ابھی تک مٹا نہیں طاعون　　ابھی جہان میں ہے فرقِ حاکم و محکوم (ص ۱۱۰)

غرور زر کا بھی طاعون ہوتا ہے؟ خوب! کس قدر تکلف اور کتنی آورد پائی جاتی ہے اس مصرعہ میں!

---

[1] "ہمیں" کی جگہ "نصیب" کہنا تھا۔

صرف حسرت میں مرگیا کوئی　　　وقت بن کر گزر گیا کوئی　(ص ۱۴۰)

یعنی ؟ ۰۰۰۰۰۰۰ !!؟؟

یہ سکوں زندگی نہ کہا جائے　　　کوئی زخموں کو اور گہرائے　(ص ۱۳۵)

مصرعہ اولیٰ انتہائی پست اور بے لطف ہے !! اور زبان و بیان کے اعتبار سے بہت کمزور !

قمر ساحری نام نہاد "ترقی پسند شاعری اور ادب" سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں اس لئے ان کے یہاں بعض مقامات پر خیال و اظہار میں ربط نظر نہیں آتا اور مفہوم ٹھیک طرح سے ادا نہیں ہو پاتا۔ یہ کوتاہی ترقی پسند شاعری کا طرۂ امتیاز ہے !! انہوں نے اپنی بعض نظموں میں اللہ تعالیٰ پر طنز بھی کی ہے اور "بھوک" کا ذکر بھی اشتراکیت زدہ ادیبوں اور شاعروں کے انداز میں کیا ہے ——

"ضرب آتشیں" پڑھنے کے بعد یہ پیش گوئی کی جاسکتی ہے کہ جناب قمر ساحری کا شاعرانہ مستقبل روشن و تابناک ہے۔

یادگارِ جگر

از:۔ محمد اسلام (ریسرچ اسکالر) ضخامت ۱۲۸ صفحات، قیمت ۵ روپے

ملنے کا پتہ :۔ دانش محل بک سیلرز، امین الدولہ پارک، لکھنؤ

حضرت جگر مراد آبادی مرحوم، جناب محمد اسلام صاحب کے محبوب ترین شاعر ہیں۔ جگر پر اُن کی چار کتابیں زیرِ طبع ہیں اور تین کتابیں زیرِ ترتیب ہیں !! زیرِ تنقید کتاب (یادگارِ جگر) میں انہوں نے جگر مراد آبادی کا غیر مطبوعہ اور تلف کردہ کلام بڑی محنت اور کاوش سے جمع کیا ہے اس کام کے لئے انہوں نے "جلوۂ یار" (میرٹھ) ۱۹۱۰ء سے لے کر "نیا دور" (لکھنؤ) ۱۹۵۹ء تک یعنی نصف صدی کے اردو رسالے کھنگالنے پڑے ہیں !

"یادگارِ جگر" کے منتخب اشعار :۔

یہاں بھی حسرتیں بے تاب ہیں دل سے نکلنے کو　　　اُدھر بھی ایک دن اے نیند پردے ہوگئے ہوتے

اللہ اللہ یہ تاثیر فغان شبِ ہجر　　　خیر مقدم مرے نالوں کا قیامت نے کیا

اشک خونیں ہے کہیں، نالہ رنگیں ہے کہیں　　　ہر قفس میں اُتر آتا ہے گلستاں کوئی

معلوم ہیں سب ایک نظر کے فریب ہیں　　　الجھے نگاہ شوق زمان و مکاں سے کیا

تمہیں گزر گئے دامن بچا کے ورنہ یہاں　　　وہی شباب، وہی دل، وہی زمانہ تھا

دل کو حریف جلوۂ جاناں بنا دیا　　　میں وہ ہوں جس نے حسن کو حیراں بنا دیا

میں عشق بے نیاز ہوں تم حسن بے پناہ　　　میرا جواب ہے نہ تمہارا جواب ہے

آغازِ محبت ہے آنا ہے نہ جانا ہے　　　اشکوں کی حکومت ہے آہوں کا زمانا ہے

جب اس طرف سے کوئی اہل نظر گیا ہے　　　دل کی نزاکتوں پہ عالم گزر گیا ہے

یہ نقوش دہر، یہ ہنگامہ ہائے کائنات　　　ساری تعبیریں ہیں وابستہ مری تعبیر سے

مایوس پھرا بارگہِ خاص سے اُس کی　　　واقف ہونہ تھا مرحلۂ بے خبری سے

ہائے !! اُس عاشق دیوانہ گلشن کی بہار　　　کہ جب آئی ہو بہ اندازِ خزاں آئی ہو

جز ذوقِ طلب جز شوقِ سفر کچھ اور مجھے منظور نہیں
اے عشق بتا اب کیا ہوگا، کہتے ہیں کہ منزل دور نہیں[1]

مدت میں جو اس شوخ کا دیدار ہوا ہے — تا دیر سنبھلنا مجھے دشوار ہوا ہے
کچھ دل کا تقاضا ہی نہ تھا عرضِ محبت — کچھ اُن کی نگاہوں کا بھی اصرار ہوا ہے
ہر چند کہ تکرار نظر بے ادبی ہے — پر کیجئے کیا عشق کی فطرت ہی یہی ہے
خزانے بھر لئے ہیں اہلِ دل نے — ترے مستوں کے دامانِ تہی سے
خبردار! اپنے میخانے سے ساقی — اُٹھے شعلے مرے جامِ تہی سے
ہر انقلاب ایک پیامِ سحر سہی — ہر روشنی دلیلِ طلوعِ سحر نہیں
اس عہد میں کہ جز غمِ دوراں نہیں ہے کچھ — وہ شخص ہے ولی جو محبت سے کام لے
مے کی حاجت ہے نہ اب درکار پیمانہ مجھے — میرے ساقی نے پلا دی روحِ میخانہ مجھے
میرے ہوتے یہ کرم ہو نہ کسی پہ یارب — ہر بلا کے لئے میرا ہی سیہ خانہ سہی

تصورات کی آئینہ بندیاں ہیں جگر
یہی ہے جلوہ گری، اس نگار خانے کی

جناب محمد اسلام کی محنت اور جستجو قابلِ داد ہے کہ اُن کی بدولت کتنے "جگر پارے" جو گمنام تھے یا تلف ہو گئے تھے اس کتاب میں یک جا ہو گئے!

برگِ نوخیز از:- عزیز تمنائی، ضخامت ۱۳۶ صفحات، دبیز چکنا کاغذ، خوش نما ٹائپ، مجلد، رنگین گرد پوش، قیمت ڈھائی روپے
ملنے کا پتہ:- دار التصنیف مدراس -۱۴ (بھارت)

اس کتاب کا نام "برگِ سبز" رکھا گیا تھا مگر کتاب کے چونسٹھ صفحے چھپ چکے تھے، تو شاعر کو اس کا علم ہوا کہ حیدرآباد دکن سے اس نام کا مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے چنانچہ "برگِ سبز" کو "برگِ نوخیز" میں بدل دیا گیا۔ کتاب کے سرورق پر —— اُردو زبان میں سانیٹ کا پہلا مجموعہ —— مرقوم ہے، پیش لفظ جناب احتشام حسین نے لکھا ہے، جس میں یہ جملہ۔

"ڈاکٹر عزیز تمنائی نے مجھے بتایا کہ انہوں نے بہت کم عمری ہی میں شعر و شاعری کی دیوی سے دل لگا لیا"

احتشام حسین جیسے پختہ مشق ادیب و نقاد کو زیب نہیں دیتا، پیش لفظ کے بعد جناب عزیز تمنائی کا مقالہ "سانیٹ کا تعارف" عالمانہ مضمون ہے، انہوں نے سانیٹ کی تاریخ بیان کی ہے —— یہ کہ اس صنف کی اٹلی میں ایجاد کب اور کیسے ہوئی؟ اور پھر اس صنف نے کس طرح ترقی کی اطالیہ کے شاعر پیٹرارک کا زمانہ چودھویں صدی عیسوی کا ہے، انگلستان میں تقریباً تین صدی کے بعد "سانیٹ" نے رواج پایا، ویاٹ (WYAT) انگریزی کا پہلا شاعر تھا جس نے "سانیٹ" کہا، اس کے بعد سرے، ڈرائیڈن اور شکسپیئر نے اس طرزِ سخن میں کمال حاصل

---

[1] مجھے "سلتے میں" یاد تھا (ماہر)

اور یہ صنف" مقبول ہوتی چلی گئی ۔

جناب عزیز تمنائی میں شاعرانہ صلاحیتیں موجود ہیں مگر ان کی صلاحیتیں ایک ایسی صنف (سانیٹ) میں صرف ہوئی ہیں، جو اُردو کے لیے اجنبی ہے، وہ ن م راشد سے متاثر ہیں اور راشد صاحب نے اردو شاعری کے مزاج کو بگاڑنے کے سوا اور کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔

نعتِ رسولؐ میں عزیز تمنائی کے یہ شعر کتنے اچھے ہیں :—

ہستی کو جس پہ ناز ہے وہ ہستیٔ عظیم
جس کا وجود باعثِ تخلیق کائنات
جس سے حریم ذات میں ہے جلوۂ صفات
وہ منتہا وہ منزلِ ہر راہ مستقیم
اس حسن بے مثال کے اوصاف کیا کہوں
خیرالبشر کہوں، اسے خیرالوریٰ کہوں

اسی "سانیٹ" میں یہ مصرعے بھی ہیں :—

روحِ چمن کو نعرۂ حق سے جھنجوڑ کر
اوراقِ گل کو سلکِ اخوت میں جوڑ کر
پیشانیٔ چمن پہ رکھی مہرِ احترام

ان تو روح کا جھنجوڑنا ہی محلِ غور ہے پھر پیشانیٔ چمن پر مہرِ احترام کا رکھنا اس پر مستزاد! تیسرا مصرعہ مبہم بلکہ مہمل ہے۔

منزل کی سمت دیدۂ حیراں لیے ہوئے　　منزل سے دور بادۂ نسیاں پیے ہوئے　(ص ۵)

بادۂ نسیاں" نے شعر کا لطف خاک میں ملا دیا۔

طلوعِ صبح کے آثار ڈھونڈنے والے　　اُجالے رات کے پردوں میں ہیں اُنہیں پالے　(ص ۶)

ان "سانیٹ" کا یہ شعر ہے اُس کا عنوان "اُجالے" ہے! "سانیٹ" کے آخری مصرعے کو کس قدر جاندار ہونا چاہیے، مگر یہ مصرعہ :—

اجالے رات کے پردوں میں ہیں اُنہیں پالے

نا بے جان اور کمزور ہے! "پالے" خاص طور سے وجدان پر گراں گزرتا ہے۔

سوچ کے دام میں جب تک میں گرفتار رہوں
یہ مقدر ہے کہ محرومِ سکوں زار رہوں　(ص ۱۲)

ان مصرعے میں دام اور گرفتار جیسے قافیہ کے الفاظ آئے ہوں اس میں "سوچ" غور و فکر اور اندیشہ کے معنی میں بے جوڑ سا لگتا ہے، اس کے علاوہ "سکوں زار" کی ترکیب کتنی نامانوس ہے۔

تیغ و تبر کو رہنے دو آلودہ زنگ ہے　　کیا کام اس کو رہا آج جنگ سے　(ص ۱۶)

"اسوہ" کی جمع "اسوے" ہے "اسلوب" کتنی غیر شاعرانہ ہے! اور غلط بھی!

"داوا" کا یہ شعر کتنا اچھا ہے:—

ایک دزدیدہ نظر اک التماسِ لب سہی
مانتا ہوں زندگی محرومیٔ جاوید ہے

"زلزلہ" کا ایک شعر ہے:—

شگاف پڑ گئے، ایوانوں، آشیانوں میں
نگار خانۂ ہستی میں ایسا بال آیا

"آشیانوں" میں شگاف پڑ جانے کو گوارا بھی کر لیا جائے مگر نگار خانۂ ہستی میں "بال آنا" ہر اعتبار سے غلط ہے! "بال" چینی یا کانچ کے برتن میں آتا ہے، مکان میں نہیں آتا۔ کوئی مکان پورے کا پورا شیشہ اور کانچ کا بنا ہو، اور اس میں [illegible] پیدا ہو جائے تو اس "درز" کو "بال" نہیں کہتے، اس سانیٹ کا آخری شعر:—

زبانِ حال سناتی ہے یہ علی الاعلان
کوئی سُنے نہ سُنے کل من علیہا فان

خوب نہیں بہت خوب ہے —

شدتِ خوف دباتی رہی میری آواز کھل نہ جائے کہیں سیاحتِ میثاق کا راز (ص ۲۵)

صحیح زبان "دباتے رہی" ہے! پھر مفہوم کے اعتبار سے شعر میں خاصہ ابہام پایا جاتا ہے —

یہ شہنشاہ کا بُت، جارج کا بُت، لاش کا بُت
ایک کھوئی ہوئی ڈوبی ہوئی عظمت کا نشان
ایک تہذیب لطف سوز جگر پاشش کا بُت
بھرے بازار میں استادہ مثالِ کہسار
زنگ آلودہ و بوسیدہ غبار آلودہ
اثرِ وورِ روایاتِ خمار آلودہ (ص ۸۶)

"لاش کا بُت" آخر کیا بات ہوئی! "عظمت کا ڈوب جانا" عام طور پر نہیں بولا جاتا، "دیوار" کہتے تو ایک بات بھی تھی۔ بُت کے لئے یہ کہنا کہ وہ بازار میں "کہسار" کی طرح کھڑا ہے، خیال و اظہار کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟ رہا چھٹا مصرعہ اس میں صرف لفظوں کو جوڑ دیا ہے! "روایاتِ خمار آلودہ" سے شاعر کی آخر کیا مراد ہے!

چاہو تو چراغِ غمِ فردا ہی جلا لو
خاکسترِ ماضی کو نہ رہ رہ کے کریدو (ص ۱۰۸)

مصرعہ ثانی کس قدر بے لطف اور پھس پھسا ہے، حالانکہ "سانیٹ" کا یہ ٹیپ کا شعر ہے —

ایک سانیٹ ہے جس کا عنوان ہے "یہ شہر" فرماتے ہیں :—

اس شہر میں آیا ہوں بہت دور سے چل کے
فاتح نہیں، تاجر نہیں، سیاح نہیں ہیں
کیا کوئی نمائندۂ ارواح نہیں ہیں
رندوں میں چلا آتا ہے جو بھیس بدل کے

ہلی بار اس کا علم ہوا کہ شہروں میں کوئی نمائندۂ ارواح بھی بھیس بدل کے چلا آتا ہے ! آخر یہ کیا "تلمیح" ہے، کوئی تک کی بات ی تو ہو۔

میں عالم ملکوت کا جاسوس نہیں ہوں
چپکے سے جو لوں جائزہ فطرتِ انساں
دیکھوں کہ ہے کس درجہ یہاں عظمتِ انساں
یہ سچ ہے کہ اک پیکر محسوس نہیں ہوں

نمائندۂ ارواح" کے بعد یہ دوسری عجیب بات کہی ہے ! عالم ملکوت کے جاسوس کا فطرت انساں کا جائزہ لینے کے لئے شہروں میں آنا لہاں کی "دیومالا" ہے ! تلمیح، روایت، مسلمہ، مفروضہ، لوگوں کا "توہم" آخر کوئی نہ کوئی پس منظر یا بنیاد تو اس بات کی ہونی چاہیے تھی !

یہ سچ ہے کہ اک پیکر محسوس نہیں ہوں

پھر شاعر جو شہر میں دور سے چل کر یعنی اپنے پیروں کے سہارے آیا ہے، وہ "پیکر محسوس" نہیں ہے تو اور کیا ہے۔
اس سانیٹ کا آخری حصّہ پہلے جزء سے کم مضحکہ انگیز نہیں ہے :—

آیا ہوں کہاں سے مجھے کچھ یاد نہیں ہے
ہر نقشِ کفِ پا کو مٹاتا ہوا آیا
یہ شہر مرے خواب مجسم کی زمیں ہے
آیا ہوں مگر صورتِ تصویر ہوں حیراں
یہ شہر اماں ہے کہ کوئی شہر خموشاں	(ص ۳۰)

نقش کفِ پا" کو مٹاتے ہوئے کیوں آئے ؟ شاید "نقش کفِ پا" سے قدیم روایات مراد ہوں مگر راستہ کی ہر روشنی کو کیوں بجھایا گیا۔ ت کہنے کا کوئی قرینہ ہوتا ہے ! "سانیٹ" کے آخری مصرعہ میں "شہر اماں" نے رہے سہے لطف کو بھی غارت کر دیا۔

آخر یہ کیسی شاعری ہے، کہ نہ فکر و خیال میں کوئی ربط ہے، نہ مصرعوں میں شاعرانہ لطف ہے نہ کہنے والا اپنے مفہوم کو پوری طرح ادا کر سکتا ہے، جو الم غلم جی میں آیا نظم کر دیا۔ "سانیٹ" کی اگر یہی "ٹیکنک" ہے تو غریب اردو شاعری کی جان پر یہ "ظلم" بند ہونا چاہئے۔ ہم اس جورِ ناروا کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔

ایک سانیٹ "دستک" ہے، جناب عزیز تمنائی ارشاد فرماتے ہیں :—

کھول دو بند دریچے کہ سحر آتی ہے
سنو کس شان سے بجتا ہے سویرے کا گجر
دیکھو استادہ ہوا روشنیوں کا لشکر

تیسرے مصرعہ میں "شعریت" بس کچھ یوں ہی سی ہے! ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے!

وہ چلے آئے ہیں ہر سمت سے خوشبو کے سفیر
وہ افق تا بہ افق کھنچ گئی کرنوں کی لکیر
گنگناتی ہوئی نغمات کی لہریں اٹھیں

نہریں جاری اور رواں ہوتی ہیں، اٹھتی نہیں ہیں!

سینۂ ارض میں جذبات کی لہریں اٹھیں
دیدنی چہرۂ آفاق کی رعنائی ہے

اور

جبلۂ تیرہ کوئی گوشۂ آرام نہیں
یہ اندھیرا، یہ گھٹن، اور یہ اٹل سناٹا
آہنی کھڑکیاں، فولاد کے در، بام اونچا
یہی جینا ہے تو جینے سے بُرا کام نہیں
دیر سے سنتے ہو کرنوں کی سریلی دستک
کھڑکیاں کھولو، چلی آئے گی بھرپور چمک (ص ۶۳)

ایک ہی نظم میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ سحر آ رہی ہے، سویرے کا گجر بج رہا ہے، تمام افق کرنوں سے منور ہے اور روشنی اور رعنائی کے سبب دنیا کا چہرہ دیکھنے کے قابل ہے اور سانیٹ کے دوسرے حصہ میں فرماتے ہیں کہ تاریک جبلہ ہے، جس میں سکون اور آرام کا نام نہیں، ہر طرف سناٹا اور اندھیرا چھایا ہوا ہے! اور

آہنی کھڑکیاں، فولاد کے در، بام اونچا

صبح کا ذکر کرتے کرتے آخر یہ "جیل خانہ" کہاں سے آ گیا، پھر "بام اونچا" شعر میں کس قدر اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے!

یہی جینا ہے تو جینے سے برا کام نہیں

یہ شاعری نہیں شاعری کی مکمل رسوائی اور بے آبروئی ہے!

"کرنوں کا دستک دینا، تو ٹھیک تھا مگر "سریلی دستک" نے استعارہ کا لطف بھی غارت کر دیا۔

"برگِ نوخیز" کے زیادہ تر "سانیٹ" یہی رنگ رکھتے ہیں، ابہام، اہمال، الفاظ کا بے محل استعمال "سانیٹ کا آغاز" اختتام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، زیادہ تر لفظوں کی جوڑ جاڑ ہے، شاعر کی جرأت اور سندق کی داد دینی چاہیے کہ اُس نے اس قدر

یقین کے ساتھ اپنے ان "۔۔۔۔۔ ات" کو چھپوایا ہے کہ ناقدانِ سخن اس کی داد دیں گے اور عوام میں اسے مقبولیت حاصل ہوگی !!

سنہرا دیس از :- وفا راشدی ، ضخامت ۲۱۲ صفحات ، متعدد تصاویر کے ساتھ دیدہ زیب رنگین سرورق ، سفید کاغذ کتابت و طباعت خوشنما ، قیمت تین روپے ۵۰ پیسے ، ملنے کا پتہ :- مکتبہ اشاعت اردو کراچی

"جناب وفا راشدی ایک جانے پہچانے ادیب ہیں اور جناب وحشت کلکتوی مرحوم سے مستفیض ہیں انہوں نے کئی مفید کتابیں شائع کی ہیں جن میں "بنگال میں اردو" بڑی اہمیت رکھتی ہے اور داخل نصاب بھی ہے ۔۔۔"

اس عبارت سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے ، یہ "پیش لفظ" ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی کا لکھا ہوا ہے ، اس کے بعد "گنگیر کنارے" میں وفا صاحب لکھتے ہیں :-

"اس حقیقت کا اظہار نامناسب نہ ہوگا کہ میں بنگالی نژاد ہوں ، میری مادری زبان بنگلہ ہے اس لئے میری ابتدائی تعلیم بنگالی زبان اور تربیت بنگالی ماحول میں ہوئی بعد میں اردو سے ایسی وابستگی ہوئی کہ یہ زبان بھی میری اپنی ہوگئی ۔۔۔"

"بیاں اپنا" کو اس کتاب کا دیباچہ سمجھنا چاہئے ، جو رفیق خاور نے لکھا ہے جس میں مشرقی پاکستان کی منظر کشی کی ہے ! اس مضمون میں سادگی کے باوجود جگہ جگہ خاصہ تکلف پیدا ہوگیا ہے ، لکھتے ہیں :-

"۔۔۔۔ باپھر پان ہی پان جن میں سے بعض اتنے کرارے کہ ان کے متعلق کہا جاتا ہے ، سانپ ان کی نوکیں منہ میں داب کر بیٹھیں ، چڑھنے میں تو ان میں عجیب چٹپٹی کڑواہٹ پیدا ہو جاتی ہے ، وہ گھنگھور دھواں دھار گھٹائیں جو ٹھیٹ بنگالہ کا پانی پی پی کر ہراتی ، بل کھاتی ، گھڑ گھڑاتی ہوئی آتی ہیں اور ساون سون کی بے پناہ طاغوتی قوت کے ساتھ ایک دم ٹوٹ پڑتی ہیں ، ان ساری باتوں سے بڑھ کر جادو اور کیا ہوگا " (ص ۱۰)

طاغوتی قوت تو اردو زبان میں "شیطانی قوت" کے لئے استعمال ہوتا ہے جس میں کھلا ہوا ذم پایا جاتا ہے ، بنگال کی موُن سون کو "طاغوتی قوت" کہنے کی آخر کیا تک تھی !

"سنہرا دیس کا مصنف اسی سرزمین میں پیدا ہوا ، اس کا ہر ہر رنگ دیکھا ، اس کے سمے شروع ہی سے اس کے دل میں رسے بسے ہوتے ہیں " (ص ۱۴)

سمے کہہ کر شاید موسم مراد لی گئی ہے مگر اس طرح کون بولتا اور لکھتا ہے !

جناب وفا راشدی نے مشرقی پاکستان کی تاریخ ، تہذیب ، ثقافت ، ادبیات ، جمالیات ، مقامات ، مشاہیر اور صوفیائے کرام پر بڑے معلومات آفریں مضامین لکھے ہیں اور ان کو خاصے سلیقہ سے مرتب کیا ہے ،

"عوامی ادب" جس مقالہ کا عنوان ہے ، اسے پڑھ کر ہماری معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا ۔۔۔

"شمالی ہند میں کبیرؔ کے دوہوں کی جو اہمیت ہے، وہی مشرقی پاکستان میں وہاں کے شاعر "پاول" کو حاصل ہے"

"نذر الاسلام" کی شاعری پر خاصہ مفصل مضمون ہے، جس سے یہ باتیں بھی معلوم ہوئیں :—

"نذرل بنگلہ ادب کا پہلا شاعر ہے، جس نے اردو فارسی کی طرح بنگلہ میں بھی صنفِ غزل گوئی کی بنا ڈالی، اس کی شاعری اُردو فارسی کی حسین و دلکش ترکیبوں، محاوروں، استعاروں اور اصطلاحوں سے مالامال ہے . . . . اس نے کلام غالبؔ کا گہرا مطالعہ کیا ہے، حافظ شیرازی اور عمر خیامؔ کی رباعیات کے بنگلہ میں نہایت دلکش منظوم ترجمے کئے ہیں، پارۂ عمّ کا مکمل ترجمہ بنگلہ زبان میں پہلی بار نذر الاسلام نے پیش کیا"

سلطان بایزید بسطامی جنہوں نے چاٹگام کے قریب پہاڑی پہ چلہ کیا تھا، اُن کے بارے میں بعض لوگوں کا یہ خیال کہ یہ مشہور صوفی بایزید بسطامیؒ ہیں، صحیح نہیں ہے ! (ص ۱۰۰)

اس دیس کی بدلی شوبھا یہ دیس رسیلا پیارا (ص ۱۶۵)

دیس کو "رسیلا" کہنا عجیب سی بات ہے !

جناب وفا راشدی نے بڑی محنت اور تحقیق سے یہ مضامین لکھے ہیں اور ان کو بڑے اہتمام سے چھپوایا ہے "مشرقی پاکستان کے حالات جاننے کے لئے "سنہرا دیس" کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے، یہ بڑے کام کی کتاب منظر عام پہ آئی ہے، جس پہ وفا راشدی کو ہم صمیم قلب سے مبارکباد دیتے ہیں ! یہ اردو زبان کی ہمہ گیری اور جامعیت کی دلیل ہے کہ ایک بنگالی نژاد اہل زبان کی طرح اردو لکھتا ہے ! اور اس کے مضامین میں تنقید و تاریخ کے اچھے نمونے ملتے ہیں ۔

الٹے بانس بریلی کو

از :- رائے محمد احمد خاں، ضخامت ۱۱۸ صفحات، قیمت ۷۵ پیسے
ملنے کا پتہ :- مصبر و زاکیڈمی، پیلز کالونی اے، لائل پور

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ حضرت شاہ محمد اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ ہوں یا مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہما اللہ تعالیٰ ، بریلوی عقائد رکھنے والے علماء نے ان میں سے ہر بزرگ کی "تکفیر" کی ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ پہ "وہابیت" کا فتویٰ لگایا ہے ! یہ شعر اس گروہ کے "مکفرین" پر صادق آتا ہے —

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

کتاب کے آخر میں مصنف نے علماء بریلی سے درد مندانہ گزارش کی ہے وہ "تکفیر بین المسلمین" سے باز آ جائیں !

افسوس ہے اس کتاب کی انشاء بہت کمزور ہے اور اُس کے مصنف تصنیف و تالیف کا تجربہ اور سلیقہ نہیں رکھتے، متعلقہ اقتباسات اور کتابوں کے حوالوں کا ایک جنگل ہے جو یکجا کر دیا گیا ہے ۔

- - - - - - - - - - - - - - - -

اردو املا کا آسان طریقہ

عبدالغفار مدہولی، ضخامت ۴۴ صفحات، قیمت ۵۰ نئے پیسے
ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

اس کتاب کے تین ابواب ہیں

اُردو املا کا آسان طریقہ (۲) اردو رسم خط میں علامتیں اور (۳) آسان اُردو جاننے والوں کا تحریری کام ۔

جناب عبدالغفار مدہولی برسوں سے بچوں کی تعلیم و تدریس اور اس موضوع پر تصنیف و تالیف کا کام کر رہے ہیں، اس فن کے متخصصین میں اُن کا شمار ہوتا ہے انہوں نے اس کتاب میں اُردو کے "فنِ املا" پر عملی تجربے اور غور و فکر کے بعد بڑے کام کی باتیں لکھی ہیں، اُردو ٹائپ کی کیا دشواریاں ہیں، ان دشواریوں کو کس طرح ہلکا بنایا جا سکتا ہے یہ سب باتیں اس کتاب میں ملتی ہیں !

نئی کلیاں

از :- حافظ عبدالرزاق باقوی، ضخامت ۴۴ صفحات (سرورق رنگین) قیمت ۱-۳۵ پیسے
ملنے کا پتہ :- کتاب گھر، جمیل آباد، میل وشارم (ارکاٹ، مدراس)

جناب حافظ باقوی نے بچوں اور بچیوں کے لئے ہلکی پھلکی نظمیں کہی ہیں، ان نظموں میں بچوں کی نفسیات کا لحاظ رکھا گیا ہے، زبان آسان و سادہ اور نظموں کی بحریں رواں اور آسانی سے بچوں کو ازبر ہو جانے والی ہیں، سب سے زیادہ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ بچوں کی دینی اور اخلاقی تربیت شاعر کا مقصود ہے ! اُردو کتنی ہمہ گیر زبان ہے کہ جنوبی ہندوستان میں اس کا ڈنکا پٹ رہا ہے ! لیکن پاکستان میں ابھی تک وہ سرکاری زبان نہیں بن سکی اس درد و غم کو کہیں بھی تو کس سے کہیں، اس کا سننے والا یہاں کون ہے !

(ص ۲۹ کا بقیہ)

بے نمازی بنا دیا اور جو نمازی ہیں اُن کی نماز درست کر دیا اس معصیت زدہ دور میں یہ عظیم الشان کارنامہ تبلیغی جماعت کی کوششوں سے انجام پا رہا ہے۔ اسلام کا جامع تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ جس میں سیاست و حکومت بھی شامل ہے، تبلیغی جماعت سیاست و حکومت کے مسائل سے عملاً کوئی سروکار نہیں رکھتی۔ اس معاملہ میں ان حضرات سے اُلجھنا نہیں چاہئے۔ دنیا کے پردے پر جہاں کہیں اور جب بھی دینی نظام برپا ہوگا، اس کی تشکیل کے لئے اچھے پرزے بے نمازیوں اور فاسقوں اور فاجروں کی ٹولیوں سے نہیں، انہیں مبلغین صلوٰۃ و تقویٰ سے لئے جائیں گے

خانقاہی اصطلاح میں جسے "شیخِ وقت" کہا جاتا ہے، یہ لقب حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو ہر طرح زیب دیتا ہے، اس زمانہ میں ذکر و دعوت کے وہ سب سے بڑے مبلغ تھے۔ کوئی شک نہیں اُن کی ذات سے دین و ملت کو فائدہ پہونچا۔ پاکستان تقریباً ہر سال آتے، رائے ونڈ میں تبلیغی جماعت کا اجتماع قابلِ دید ہوتا۔ مولانا مرحوم جہاں جاتے، روزے نماز کے چرچے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ماحول منور اور معطر ہو جاتا۔ اُن کے وعظ کا خاص انداز تھا، سادہ لب و لہجہ مگر پُرسوز اور اثر انگیز ! لاہور میں تبلیغی دورے پر آئے ہوئے تھے کہ پچاس سال کی عمر میں عالمِ قدس سے بلاوا آ پہونچا۔ موت ہر جان کے لئے مقدر کر دی گئی ہے، اس عالم گیر قانون سے انبیاء تک کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا، اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت برزخ و آخرت کی ہر منزل میں اُن کی رفاقت فرمائے (آمین)

کارمینا

دردِ شکم، بدہضمی، بھوک کی کمی،
اپھارہ، قبض، قے، دست،
ہضم کی خرابی ---

یہ اور معدہ اور جگر کے دوسرے امراض آج کل عام ہیں۔ اوران شکایتوں کی وجہ سے نہ صرف صحت خراب رہتی ہیں بلکہ کاروبار اور زندگی کے دوسرے مشاغل پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اچھا ہاضمہ اور صحیح معدہ اچھی صحت کا ضامن ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ وہی ہیں جو کچھ آپ کھاتے ہیں۔ لیکن جب آپ کا کھایا ہوا جزو بدن ہو کر خون بن کر آپ کو طاقت نہ پہنچائے تو کھانا پینا ہی بےکار نہیں ہوتا بلکہ اٹھنا بیٹھنا ... مشکل ہو جاتا ہے اور جینا دوبھر۔

ہمدرد کی لیباریٹریوں اور ہمدرد مطبوں میں چیدہ جڑی بوٹیوں اوران کے قدرتی نمکیات پر طویل تجربات اور سائنسی تحقیقات کے بعد ایک متوازن اور مفید دوا **کارمینا** تیار کی گئی ہے جو ہضم کی جملہ خرابیوں کو دور کرنے میں خصوصیت رکھتی ہے۔ **کارمینا** معدے پر نہایت خوشگوار اثر کرتی اور اس کے افعال کو درست کرتی ہے۔ ہضم کے فعل کے لیے جو رطوبتیں ضروری ہیں کارمینا ان کو مناسب مقدار میں پیدا کرتی ہے۔ جگر کی اصلاح کرتی اور جگر کی جملہ خرابیوں کو درست کرتی ہے۔

سینے کی جلن، تیزابیت، پیٹ کا بھاری پن، نفخ، بدہضمی، پیٹ کا درد، کھٹی ڈکاریں، دردِ شکم، متلی اور قے، بھوک کی کمی، قبض یا معدہ اور جگر کی دوسری بیماریوں میں **کارمینا** کا استعمال نہایت مفید ہوتا ہے۔

کارمینا نظامِ ہضم کو درست اور قدرتی کرنے کی یقینی دوا ہے۔ ہر موسم اور ہر آب و ہوا میں ہر مزاج کے لوگوں کے لیے مرد، عورت اور بچے ... بلا خطر استعمال کی جا سکتی ہے۔

کارمینا ہر گھر کی ایک ضرورت ہے

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی ڈھاکہ لاہور چاٹگام

ماہنامہ
فاران
کراچی

ایڈیٹر:- ماہرالقادری

جلد ۱۷ جولائی ۱۹۶۵ء شمارہ ۴

ترتیب

قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے
چندہ سالانہ:- سات ۷/- روپیے

مقام اشاعت:- دفتر ماہنامہ فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی ۱؍
پبلشر:- مسرور بیگم
طابع:- ماہرالقادری نیشنل پریس [illegible]

ماہر القادری

اس کائنات میں، اس جہانِ آب و گل میں بلکہ یوں کہیئے اس عالم عرش و فرش میں اللہ تعالیٰ کی شانِ خلّاقیت و ربوبیت اور کمالِ قدرت کی سب سے زیادہ روشن دلیل حضرت سیدنا خاتم النبین محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، انسان بہ حیثیت اپنی نوع کے خلاصہ مخلوقات ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس شخصیت بلاشبہ خلاصہ انسانیت ہے۔ کوئی شک نہیں دنیا میں بڑے بڑے برگزیدہ انسان اور دین و اخلاق کے اعتبار سے بلند سے بلند پاکیزہ شخصیتیں گزری ہیں، جن پر ہم صلوٰۃ وسلام بھیجتے ہیں مگر انسانیت کی پوری تاریخ میں "انسانِ کامل" بس ایک ہی پیدا ہوا، جس کی ذات پر دین کی تکمیل ہوئی اور نبوت کو ختم کر دیا گیا، اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا اور جو کوئی نبوت کا دعویٰ کرے گا چاہے وہ ظلی اور بروزی نبوت ہی کیوں نہ ہو، اُسے جھوٹا، غلط گو، بلکہ کافر سمجھا جائے گا۔ اتمام نعمت اور تکمیل دین کے بعد نبیوں کے بھیجنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی لہٰذا اس منصب جلیل پر محمد عربی کے نام کی آخری مہر لگا دی گئی، نبوت کا عہدہ "مختوم" کر دیا گیا، دنیا کے پردے پر صرف اُسی امت کو مسلمان کہا جاتا ہے اور قیامت تک کہا جائے گا، جو سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آخری نبی ہونے پر ایمان رکھتی ہے اور حضور کے بعد نبوت کے تمام دعویداروں کو جھوٹا سمجھتی ہے! جو کوئی اپنی ذات کی طرف کسی قسم کی نبوت کے نام سے بھی بلاتا ہے وہ کاذب و مفتری ہے، ہر متنبی پر ہم لعنت بھیجتے ہیں اور اس کی تکذیب و تردید کو ایمان کا لازمی تقاضا سمجھتے ہیں! وہ مسلمان بے غیرت اور بےحمیت ہے اور اس کے ایمان میں کھوٹ پائی جاتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی مدعیِ نبوت کو تکفیر سے بچانے کے لئے منطق و کلام کے نکتے پیدا کرتا ہے! "وحدتِ امت" کے نام پر شیطان کے اس فریب سے اللہ تعالیٰ ہر کسی کو محفوظ رکھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس تعلیمات اور حضور کی لائی ہوئی شریعت میں جو شانِ جامعیت پائی جاتی ہے اُس کا وجود اگلی پچھلی تاریخ میں کہیں نہیں ملتا، یہاں فقر و فاقہ کے ساتھ حکومت و سیاست بھی ہے، قرآن کریم کی قرأت کے ساتھ تلوار کی جھنکار اور کمان کی کڑک بھی سنی جا سکتی ہے یہاں صفہ ہی نہیں بدر و احد کے معرکے بھی ہیں اور طائف و ارض حرم کی مظلومیت ہی نہیں مکہ کی فتح اور خیبر کی قلعہ کشائی بھی ہے! یہاں شب بیداری اور احرام و اعتکاف بھی ہے اور ساتھ ہی صبا رفتار گھوڑے بھی دوڑائے جا رہے ہیں، خوشبو اور عورت کی پسندیدگی بھی ہے یہاں پیوند لگے کپڑوں کے ہجوم میں یمن کے حلے اور دھاری دار خوب صورت چادریں بھی نظر آتی ہیں، تلوار کے ذریعہ فتنہ کا استیصال اور کفر و شرک کی بیخ کنی بھی ہے اور اس کے ساتھ قرآن کے سایہ میں بسطِ امن کی مخلصانہ کوششیں بھی ہیں! عورت جسے دنیا کے ہر معاشرے نے ذلیل سمجھا تھا اُس کو عزت کا مقام بھی عطا کیا گیا اور اس کے جائز حقوق بھی متعین کئے گئے، زبان وحی ترجمان سے یہ الفاظ بھی دنیا نے سنے کہ "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے" مگر

ساتھ ہی عورت کی عصمت و عفت کی حفاظت کے لئے چہرے اور بدن پر جلباب و خمار بھی آگئے، حجاب و غیرت اور شرم و حیا کو عورت کی شخصیت کا سب سے زیادہ نمایاں اور اہم امتیاز سمجھا گیا، کسی استعارے اور رمز و کنایہ کے بغیر کھول کر بتایا گیا کہ عورت کی آواز اس کے زیور کی جھنکار اور اس کے ملبوسات کی خوشبو فتنہ ہے، اور آنکھ کا زنا تو آنکھ کا دیکھنا ہی ہے، مردوں کو غض بصر کی ہدایت کی گئی، مرد و زن کے اختلاط پر قدغن لگائی گئی :

شوہر اور بیوی کے تعلقات کی خوش گواری پر اہلی زندگی کے سکون و اطمینان کا بہت کچھ دار و مدار ہے اس لئے زوجین کے حقوق اور نکاح و طلاق کے مسائل کو دوسرے مسائل کے مقابلہ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا، طلاق کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی، اسے "ابغض المباحات" فرمایا گیا، اسی طرح مرد کو چار نکاح کرنے کا حکم نہیں "اجازت" دی گئی ! خاص طور سے طلاق و خلع کی ایسی نزاکتیں ہیں جن کو شوہر اور بیوی ہی اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں، حکومت یا پنچایت کے جبر و دخل اور قانونی اجازت کی پابندی سے ان معاملات کے سنورنے کی بجائے بگڑنے اور خراب تر ہونے کا امکان ہے۔

سود خوری اور ذخیرہ اندوزی کو ایک طرف حرام قرار دیا گیا، دوسری طرف ذاتی ملکیت پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی "زکوٰۃ" کی فرضیت اور خیرات و صدقہ کی ترغیب خود اس کی دلیل ہے کہ مال و دولت کے اکتساب پر حلال ذرائع کے علاوہ اسلام کوئی قانونی روک نہیں لگا، قمار بازی اور شراب نوشی کو عمل شیطان کی گندگی بتایا گیا، تاریخ گواہ ہے کہ عہدِ رسالت میں اس "منکر" کو اس طرح مٹایا گیا کہ مدینہ کی گلیوں میں شراب بہی پھرتی تھی، شراب بنانے اور پینے پلانے کے برتن تک توڑ دئے گئے، سٹہ، گھوڑ دوڑ کی شرط، بت گری، مجسمہ سازی اور رقص و غنا کے لئے اسلامی معاشرے میں کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہنے دی، انسان کی عزت و تکریم اور شرف و بزرگی کا معیار "تقویٰ" قرار پایا، اس معیار نے حسب و نسب کے غرور اور فخر و مال کے غباروں سے ہوا نکال دی !

انسان کے کمائے ہوئے مال و جائداد اور ملکیت پر پابندی لگا کر اس کے ذاتی تشخص کی نفی نہیں کی گئی، کہ اس قسم کی مساوات غیر فطری ہے اور قیدیوں کی طرح انسانوں کے رہنے سہنے اور کھانے کپڑے کا انتظام کر کے انسانوں کے فطری حقوق سلب نہیں کئے گئے، نبی آخر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی لائی ہوئی شریعت نے انسان کو جائز حدود میں معیشت و معاش کا منشور آزادی عطا کیا۔

انسانی اخوت کا اس قدر احترام کیا گیا اور اس کو اس درجہ وسعت دی گئی کہ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کا کنبہ کہا گیا۔ پڑوسی چاہے وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اس کے حقوق کی حفاظت و احترام کی تاکید فرمائی گئی۔ انسان تو انسان جانوروں تک پر رحم کرنے کا حکم دیا گیا، قول و قسم عہد و پیمان اور اقرار و میثاق کے پاس و لحاظ اور انہیں پورا کرنے کی تعلیم دی گئی، سچ کے لئے فرمایا گیا کہ باعث نجات اور جھوٹ سبب ہلاکت ہے، رشوت دینے اور لینے والے دونوں کو وعید سنائی گئی، سود خواروں کے لئے اتنی سخت وعید اور ڈراوا کہ وہ اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں ! اس وعید نے اسلامی معاشرے میں سود خوار مہاجنوں، یہودیوں اور شائیلاکوں کے لئے گنجائش ہی نہیں رہنے دی، پھر فرمایا گیا کہ دولت کو گردش میں رہنا چاہئے :

سرمایہ و محنت کو تصادم سے بچانے کے لئے مالداروں کو سخاوت، جود و کرم کشادہ دستی اور سیر چشمی کے لئے ابھارا گیا، حکم دیا گیا کہ مزدور کے ماتھے کا پسینہ خشک ہو جانے سے پہلے اس کی مزدوری دے دی جائے، دوسری طرف اہل محنت کو صبر و قناعت کی تعلیم دی گئی۔ اہل سرمایہ خود نما نہ ہوں اور اہل محنت خود فروش نہ بننے پائیں، یہ وہ اخلاقی توازن ہے جس سے سرمایہ و محنت کے درمیان رقابت اور حریفانہ

ہ کشی کی نوبت نہ آنی چاہیئے! کسب مال و دولت پر جائز و حلال ذرائع کی قید و پابندی کے بعد سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا بھی نہیں ہو سکتی!
دق مقال اور اکلِ حلال یہ وہ زرین اصول ہیں جن سے شخصی اور اجتماعی طور پر انسانیت کو فوز و فلاح میسر آتی ہے اور معاشرے کو
زگی نصیب ہوتی ہے۔

ہدایت و نصیحت کی گئی کہ مسلمان باہمی مشورت کے ساتھ اپنے امور انجام دیں، اس اصول نے آمریت، ملوکیت اور مطلق العنانی کی
ی کر دی اور حکومت و سیاست کے شورائی نظام کو خیر و فلاح کا صداقت نامہ عطا کر دیا، اچھے حاکموں کی یہ پہچان بتائی گئی کہ جن کے لئے،
م کے دلوں سے دعائیں نکلیں اور لوگ انہیں پسند کریں نہ یہ کہ — انہیں گھیر گھار کے آدمیوں کے استقبال کے لئے بے جایا جائے اور "زندہ باد" کے
رے لگانے کا انہیں الاؤنس دیا جائے!

اسلام نے شادی و غمی کے معاملات میں بھی رہنمائی دی، شادی و مسرت کے موقعہ پر ناچ رنگ، آتشبازی، سوانگ، نقلیں اور اس قسم
، دوسری بازاری باتیں اور دکھاوے کے مظاہرے نہیں ہونے چاہئیں؛ اسلام نے پورے سال میں دو تہواروں کو "عید" قرار دیا ہے، جن کی
سب سے بڑی خصوصیت ذکر و صلوٰۃ اور تکبیر و تہلیل ہے، کوئی ایسی خوش فعلی اور لہو و لعب نہیں جس سے اخلاق تو خلاق سنجیدگی اور متانت پر بھی حرف
آ ہو، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت کتنا مقدس اور مسرت انگیز ہے مگر اس دن کوئی سالگرہ اور یادگار نہیں منائی گئی، نہ چراغاں نہ
وس نہ ڈھول تاشے! اسی طرح رنج و غم کے موقعوں پر سینہ کوبی، ماتم زنی، جزع فزع کرنے، گریبان پھاڑنے، بال نوچنے اور ماتمی لباس پہننے کی
مانعت کی گئی، مسرت و خوشی کے موقعہ پر شکر اور غم پر صبر یہ ہے وہ مظاہرہ جس کی مرد مومن سے اسلام توقع رکھتا ہے، مسلمان ظرف کے اعتبار سے بحرِ
بیکراں اور تحمل کے لحاظ سے کوہِ گراں ہوتا ہے، توکل علی اللہ، عزیمت و استقامت اور راضی برضا رہنا یہ ہے اہلِ ایمان، امتیانِ نبی آخرالزماں اور غلامانِ
محمد عربی کا صحیح موقف اور سیرت و کردار!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور اور آفتاب نبوت کا طلوع کفر و شرک کے لئے گریز و فرار اور غروب و فنا کا پیام تھا، جاء الحق و زہق
الباطل، ان الباطل، کان زہوقا، کی تصویر دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی، وہ تخیل کے بت ہوں یا پتھر کے صنم سب ایک ایک کر کے ٹوٹ کر رہے،
بدعت کو ضلالت ٹھیرایا گیا، اس طرح دین میں "ایجاد و ابداع" کے راستے بند کر دئے گئے! ہاں! "اجتہاد" کی گنجائش رکھی گئی۔

عدل و انصاف کے معاملات میں کافر و مسلم کے درمیان کسی قسم کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا، جس کا جو واجبی حق ہے وہ اُسے ملنا چاہئے
ور جس نے جس پر جو زیادتی کی ہے اس پر تاوان کا احتساب ضروری ہے اور قانون کی نظر میں مسلم و کافر کی حیثیت ایک جیسی ہے!

شعر و ادب کو تقدس و پاکیزگی عطا کی گئی اور تہذیب و تمدن کو نکھارا گیا، زندگی کے ہر شعبہ میں نیکی اور سچائی کو نافذ اور غالب کر دیا گیا اللہ
عالی کی زمین سچ مچ اس کے نور سے جگمگانے لگی، ہر طرف خیر و حکمت کے فانوس روشن ہو گئے اور عدل و صداقت کے ستارے جھم جھم کرنے لگے •
یکی کا چلن، پاکبازی اور تقویٰ کی فراوانی، دیانت و راستبازی کی جلوہ آرائی!

سیرت مقدس کی چند جھلکیاں

اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ حمد کرنے والے یعنی "حامد" بھی، اور زمین و آسمان میں جن کی نعت
و مدح اور توصیف و منقبت کے نغمے گونج رہے ہیں اس لئے احمد، محمد اور محمود بھی۔ (صلی اللہ
علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ نے افضل الانبیاء اور خاتم النبیین کے منصب جلیل کے لئے حضور کو منتخب
فرمایا، اس لئے "مصطفےٰ" بھی، کونین میں سب سے زیادہ عزت و شرف حضور کو عطا کیا گیا، اس لئے "مجتبیٰ" بھی! دین و اخلاق

"نور" اور ہدایت وسعادت کے "سراجِ منیر" بھی! قیامت تک دنیا کو ہدایت کا اجالا اسی "روشن چراغ" سے ملے گا، جو اس چراغ ہدایت سے محروم ہے اس کے لئے اندھیرے ضلالت اور گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں مل سکتا۔

احمد مجتبیٰ (اس نام کے قربان) محمد مصطفےٰ (فداہ روحی، ابی وامی) یہ وہ مقدس نام ہے جو اذان، تکبیر اور نماز میں شامل ہے! عزت وتکریم اور رافت ومحبت کی حد ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضورؐ کو "رؤف ورحیم" فرمایا، جو اللہ کے نام بندے کے نام، کتنا نازک مقام ہے، ناموں کی یہ لفظی اور معنوی مشابہت، ۔ ۔ ۔ ۔ ! سبحان اللہ عما یصفون!

؎ بہ مقامے کہ رسیدی نہ رسید ہیچ نبیؐ

مگر

ان تمام بلندیوں، مرتبوں اور رفعت وعزت کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر عالم میں اپنی "عبدیت" کا اعلان اور اقرار اور زبان مبارک سے کوئی ایسا لفظ نہیں سنا گیا جو ربوبیت اور عبدیت کی حد فاصل پر اثر انداز ہوتا ہو، قطرہ دریا میں حل ہوگیا موج موج میں مل گئی، جلوہ جلوہ میں سما گیا، یہ خطرناک نکتے تو شعر وتصوف کے تراشے ہوگئے ہیں، اُس "عبد کامل" کے یہاں اس کا پیرایہ بیان اور اسلوب کلام ہی سرے سے نہیں ملتا!

کوئی کچی پکی روایت نہیں، قرآن کہتا ہے:۔

وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعلمین

زمین وآسمان، کون ومکاں، فرش وعرش، تحت وفوق، عالم اجسام ہو یا عالم ارواح، دنیا ہو یا عقبیٰ، غرض ہر عالم کے لئے حضرت رحمۃ للعلمین کی ذات رحمت ہے، حضورؐ نذیر وبشیر بھی ہیں، یہ شرف اور کسی کو عطا نہیں ہوا، قیامت کے دن شفاعت کا تاج حضورؐ ہی کے فرقِ مبارک پر ہوگا۔ اُس روز سرکار کو لواء الحمد اور مقامِ محمود عطا کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو شفاعت کی اجازت ملے گی، اور حضورؐ کی شفاعت قبول کی جائے گی!

ان تمام مناقب ومحامد کے ساتھ صاحبِ معراج بھی، انبیاء کرام جس حقیقت کی گواہی دیتے آئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی تصدیق آنکھوں کی رویت اور عینی شہادت کے ذریعہ فرما دی، اور اس طرح شہادتِ حق کا یہ سلسلہ استوار ہوگیا۔ شب معراج کیا دیکھا، کس طرح دیکھا؟ اس کی تفصیل وہ انسان کیا بتا سکتا ہے جس کی آنکھیں پھلجھڑی کی چمک دمک بھی تاب نہ لا سکتیں اور ذرا سی چکا چوند نگاہوں پر بار گزرتی ہے! انوار ربانی اور آیاتِ الٰہی کا اس طرح مشاہدہ کیا کہ حضورؐ کی آنکھوں نے چکا چوند اور حیرانی تک محسوس نہیں کی، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو روحانی اور جسمانی طور پر سر مشاہدہ اور رویت کی قوت بخش دی تھی جبھی تو مکان ولامکاں کی سیر کرائی گئی، کہ جسم اور روح اور دیدہ ودل ہر قسم کے مشاہدات اور واردات کا تحمل کر سکیں

ایک طرف یہ اعزازات ومدارج کہ جن کی کوئی حد ونہایت نہیں، حضورؐ کا ہر وصف بحرِ بے کنار اور ہر صفت نا محدود جس کا لفظ وبیان اور فکر وخیال سے احاطہ نہیں کیا جا سکتا؟ قرآن کیا ہے؟ اس کا جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے ملے گا اور آپؐ کے اخلاق کیا تھے، اس کا جواب قرآن کریم دے گا! (کان خلقہ القراٰن) جوانی کا زمانہ، جسمانی صحت وتوانائی کے ساتھ حسن وجمال کی دلکشی کی بھی کوئی حد ونہایت نہیں، پھر مکہ کا ماحول جہاں قدم قدم پر ہوسناک جذبات کی

...اسباب مہیا تھے، مگر محمد ابن عبداللہ نے اس فسق پرور ماحول اور معصیت زدہ معاشرے میں جوانی کا زمانہ اس قدر عفت و
...گی کے ساتھ گزارا کہ آپؐ کے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہ ہوسکی کہ محمد (روحی فداک) کی نگاہ سے ذرہ برابر بھول
...ک ہوئی تھی، حضورؐ نے زندگی بھر کسی نامحرم عورت کے ہاتھ تک کو نہیں چھوا، نگاہ و خیال، قلب و ضمیر، دست و پا سبھی سب معصوم و
...یزہ! زندگی چاندنی سے بھی زیادہ اُجلی اور صاف ستھری! قوم نے حضور کی امانت و دیانت کو دیکھ کر "الامین" کا خطاب دیا، اسی "الامین"
...جب نبوت کا اعلان فرمایا تو قوم مخالف ہوگئی یہ ظالم یہ نہیں سمجھتے تھے کہ جو شخص دنیا کے معاملات میں دیانت و امانت کا ثبوت دیتا ہے، وہ
...کے بارے میں (معاذاللہ) غلط بیانی نہیں کرسکتا۔

حضور کے کردار کی صداقت و راستبازی کی سب سے نمایاں دلیل یہ ہے کہ سب سے پہلے جو لوگ ایمان لاتے وہ آپؐ کے دوست
...بکرؓ آپؐ کی زوجہ مطہرہ خدیجہؓ، چچازاد بھائی علیؓ اور آپؐ کے غلام زیدؓ تھے، کوئی شخص کتنا ہی محتاط اور لئے دئے کیوں نہ رہے ان
...شخصیتوں (دوست، بھائی، بیوی اور ملازم) سے اپنی زندگی کو پردے میں نہیں رکھ سکتا یہ لوگ اس کی جلوت و خلوت کے راز دار
...رتے ہیں، اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر کوئی معجزہ اور دلیل طلب کئے بغیر ان چار افراد کا ایمان لے آنا، اس کی دلیل ہے کہ حضورؐ کی صداقت
...راستبازی اور سیرت و کردار کی پاکیزگی کا انہیں اچھی طرح تجربہ تھا، حضورؐ کے اعلان نبوت پر انہیں یقین ہوگیا کہ "محمد الامین" کی زبان سے حق
...علاوہ کوئی اور بات نکل ہی نہیں سکتی اور اس صادق الوعد، الامین اور معصوم انسان کے دعوے اور اعلان میں شک کرنے کے یہ معنی ہیں کہ حق
...ئی اور سچائی سے دنیا ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائے۔

کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" دراصل ہر باطل قوت کے خلاف اعلان جنگ اور ہر "غیر اللہ" کی نفی تھی، اس کے بعد مکہ کی
...ین حضور پر تنگ ہوگئی، ایسا محسوس ہوا جیسے مکہ میں آدمی نہیں سانپ، بچھو، بھیڑیے اور ریچھ رہتے ہیں، ایک انسان کو اس کے مقصد سے
...ہٹانے، بددل کرنے اور اس کے مشن کو ناکام بنانے کے لئے جتنی ذلیل ترکیبیں ممکن تھیں وہ سب آزمائی گئیں، عورت، مال و دولت
...امارت و سرداری کا لالچ بھی دیا گیا، سوشل بائیکاٹ بھی کیا گیا، شعب ابی طالب میں یہ زمانہ کتنا صبر آزما اور روح فرسا تھا، راستے
...ں کانٹے بچھائے گئے، اللہ تعالیٰ کے حضور سجدے کی حالت میں سر مبارک پر اونٹ کا اوجھ ڈالا گیا، حضورؐ کے ساتھیوں کو بھی طرح طرح
...ستایا گیا کسی کسی کو تو یہ ظالم مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے تھے اور کسی کے سینہ کو تپتی ہوئی ریت پر پتھروں سے داغا گیا، طائف کے
...زاروں اور گلیوں میں دنیا کے سب سے زیادہ عظیم اور عزت والے انسان پر آوارہ لونڈے اور شہدے پھبتیاں کستے اور پتھر پھینکتے تھے،
...یہاں تک کہ حضورؐ کی جوتیاں خون میں بھر گئیں، زخموں سے چُور اٹھتے تھے اور پھر گر پڑتے تھے! مکہ کی زمین رحمۃ اللعالمین پر اتنی تنگ کردی
...نے کہ حضورؐ کو وطن سے ہجرت کرنی پڑی، وطن کو چھوڑتے اور کعبہ کا آخری دیدار کرتے ہوئے قلب مبارک پر نہ جانے کیا عالم گزر گیا ——
...کوئی سیاسی لیڈر اور دنیوی حاکم اور بادشاہ ہوتا تو ان مظالم اور شدائد سے تنگ آکر ہمت ہار جاتا یا اپنے مقاصد، مشن اور پروگرام
...کاٹ چھانٹ کر زمانہ کی فضا سے ہم آہنگ بنالیتا مگر یہ اللہ کا سچا رسولؐ تھا جس کے مقابلہ میں آسمان کی تمام بجلیاں اور زمین کے سب
...پہاڑ بھی آجاتے، تو بھی وہ اپنی منزل سے بال برابر اِدھر اُدھر نہ ہوتا۔

مدینہ کی مہاجرت، نیا ماحول، اجنبی فضا، یہاں منافقوں کی سازشوں اور یہودیوں کی خطرناک چالوں کا مقابلہ کرنا پڑتا، قریش مکہ
...نے یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا، بدر و احد کے معرکے انہی کی دشمنی کے سبب ظہور میں آئے یہاں تک کہ فتح مکہ نے حالات کا رخ ہی موڑ

دیا، ملک کی فضا ہی بدل گئی، بڑے بڑے کٹے کافر اور خون کے پیاسے دشمنوں کو حق کے روبرو سرِتسلیم خم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ رہا! فتح مکہ میں رحمۃ اللعالمین کے عفو و درگزر نے دشمنوں کے دل جیت لئے، جو تلوار سے زیر نہ ہو سکے تھے، وہ احسان و مروت کے سامنے سپر انداختہ ہو گئے۔

فتح مکہ درحقیقت حق و صداقت، احسان و کرم، عدل و انصاف بلکہ یوں کہئے انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی فتح تھی، ظلم و ستم، کفر و شرک اور جہل و نادانی کو تاریخ کے کسی دور میں ایسی فیصلہ کن شکست کا سامنا نہیں کرنا پڑا! اس فتح نے حق و باطل کا فیصلہ کر دیا، اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہوا اور باطل کو نیچا دیکھنا پڑا! جو اس سرزمین پر ستائے، گھسیٹے اور لہولہان کئے گئے تھے اب قیادت و امارت کی زمام انہی کے ہاتھوں میں تھی، عتبہ، شیبہ اور ابوجہل جیسے گرانڈیل سردارانِ قریش کا دور ختم ہو چکا تھا، اب بلالؓ و زیدؓ کا زمانہ تھا، آن غلامانِ محمد کا جن کی غلامی پر ہزار ہا ہزار آزادیاں قربان!

مکہ کی زندگی شدید آزمائش و ابتلا کی زندگی تھی، آزمائش کی یہ وہ بھٹی تھی جس میں سیرت و کردار تپ کر کندن بنتے جا رہے تھے، اسلام کی تاریخ میں یہ دور عظیم الشان اہمیت رکھتا ہے، یہ نمونہ کا دور ہے یعنی یہ کہ جب اہلِ حق کو مظلومیت کی زندگی سے سابقہ پڑے تو ان کے صبر و استقامت کا یہ انداز ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ کی رضا یوں ہی حاصل نہیں ہو جاتی اس کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دینا پڑتا ہے! اور پھر مظلومیت کے اس افق سے فتح و نصرت کا ستارہ طلوع ہوتا ہے!

مدنی زندگی اللہ تعالیٰ کی خلافت کے عمل و تجربہ کی زندگی ہے، اللہ تعالیٰ کے کلمہ اور دینِ حق کی سربلندی کا دور ایسے معاشرے کا وجود جس کی بنیاد عدل و انصاف اور خیر و تقویٰ پر قائم کی گئی تھی! ایک ایسی حکومت کا نمونہ جس پر خلافتِ الٰہی کی معنویت صادق آتی ہے جہاں صرف کتاب و سنت کا قانون چلتا تھا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہر طرف عملداری تھی۔ عرب کی سرزمین اور اسلامی حکومت کی خاک سے نیکیاں سبزے کی طرح اُگتی تھیں اور وہاں کی آب و ہوا میں پرہیزگاری اور خشیت و تقویٰ گھل مل گئے تھے مرزا غالب نے تو یوں بھی شاعری کی ترنگ میں کہہ دیا تھا۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

مگر خطہ عرب کی ہوا میں واقعی تقویٰ اور نیکوکاری کی تاثیر پیدا ہو گئی تھی اور وہاں کی ہوا میں سانس لینا نیکی اور عبادت تھا۔

مکہ کی مظلومیت کو بھی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل تھی اور مدینہ میں دینِ حق کو جو اختیار و اقتدار کی ہیئت و صورت میں غلبہ میسر تھا۔ اس کا مقصود بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول تھا۔ کتاب و سنت کے احکام کا تشریعی حیثیت سے نفاذ اور حکومت و اقتدار کے ذریعہ حدود اللہ کو جاری کرنا، یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس اسوہ اور مبارک سیرت کا نمایاں ورق ہے!

اسوۂ حسنہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسّی خدا کے شرف اتفاق کرنے والے اور احکام خداوندی کے خبر دینے والے ہی نہیں تھے بلکہ جو حکم اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو پہنچایا اس پر خود عمل کر کے دکھایا مثلاً "اقیموا الصلوٰۃ" کی تعمیل اس انداز میں کی کہ رات رات بھر نماز میں حضورؐ کھڑے رہتے تھے، جس کے اثر سے پائے مبارک متورم ہو جاتے تھے، امت پانچ وقت کی نمازیں پڑھتی تھی اور حضورؐ صلوٰۃ پنجگانہ کے علاوہ اور کئی وقت کی نمازیں ادا فرماتے تھے، ہر نیک عمل میں سب سے پیش پیش خیر و تقویٰ کی کمیت و

کیفیت میں سب سے بڑھ چڑھ کر ۔ سادہ زندگی کا امت کو درس دیا تو اپنی ذات سے فقر و سادگی کی مثال قائم کردی، قمیص، قبا اور تہمد میں پیوند لگے ہوتے ایک وقت میں دو سالن مشکل ہی کبھی ہو پاتے تھے، زندگی زیادہ تر نانِ جویں اور کھجوروں کے سہارے گزرتی تھی، اپنا کام کاج خود اپنے ہاتھ سے کرتے، بکریوں کا دودھ دوہتے، اپنی جوتیاں اپنے ہاتھ سے گانٹھتے، مسجد نبوی کی تعمیر اور غزوۂ خندق میں زمین کھودتے وقت حضور کے دستِ مبارک میں کدال تھی اور پتھر ڈھو رہے تھے! محتاجوں، ضرورت مندوں اور ناداروں کی امداد کے لئے لوگوں کو ابھارا اور ایثار و صلہ رحمی کا سبق دیا تو خود فاقے کر کے بھوکوں کو کھانا کھلایا، ایثار کا یہ عالم کہ دوسروں کو مال غنیمت بانٹ رہے تھے مگر جگر گوشۂ نبوی ـــــ سیدہ فاطمۃ الزہرا ـــــ کے سر پہ اوڑھنی بھی ثابت نہ تھی، اپنی آل پر صدقہ کو حرام کر دیا! دریا دلی اور جود و سخاوت کا یہ عالم کہ ایک بار ایک سائل آیا، کاشانۂ نبوت میں اللہ کے نام کے سوا اور کچھ نہ تھا، سائل سے فرمایا کہ تم کسی سے میرے نام پر قرض لے لینا۔ شجاعت کی وہ وہ کیفیت کہ جب زور کا رن پڑتا تو اشجع الناس سیدنا علی کرم اللہ وجہٗ کا بیان ہے کہ ہم اُس وقت حضور کی پناہ ڈھونڈتے تھے۔

محمد عربی ـــــ رحمۃ اللعالمین ـــــ یتیموں کے والی، غریبوں کے مولا، مظلوموں کے فریادرس، انسانیت کے دردمند اور مظلوموں کے غمخوار!

جس طرف اُٹھ گئی دم میں دم آگیا
اس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سلام

گھروں پر تشریف لے جا کر مریضوں کی عیادت فرماتے، کوئی مر جاتا تو اُس کے جنازے اور کفن دفن میں شریک رہتے، یتیموں کے سروں پر دستِ شفقت پھیرتے، بیواؤں کی ڈھارس بندھاتے! بے سہاروں کو سہارا دیتے! اپنے ذاتی معاملہ میں انتہائی نرم اور عفو و درگزر کرنے والے مگر حدود اللہ کے معاملات میں بے لچک آپ کے محبوب صحابی حضرت اسامہ نے ایک سارقہ کے مقدمہ میں سفارش کی، تو چہرۂ مبارک فرطِ غضب سے سرخ ہو گیا جیسے کسی نے انار نچوڑ دیا ہے، مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جاتا۔

محفلِ نبوی کے وقار و ادب کا یہ عالم جیسے حاضرین کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں اس وقار و سنجیدگی کے ساتھ صحابہ کرام سے کبھی کبھار مزاح بھی فرما لیتے، اشعار بھی سنتے! وقار و جلال کے باوجود چہرہ اقدس گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ رہتا، عام طور پر کھلکھلا کر نہ ہنستے، زیادہ تر تبسم زیرِ لب! کوئی بات کرتا ہوتا تو جب تک وہ بات پوری نہ کر لیتا اُس کی بات نہ کاٹتے، گفتگو اس قدر دل نشین انداز میں سکون اور ٹھیراؤ کے ساتھ فرماتے کہ کوئی چاہے تو ایک ایک لفظ کو گن سکتا تھا، یاد کر سکتا تھا اور لکھ سکتا تھا اللہ تعالیٰ نے جوامع الکلم سے نوازا تھا، طویل مفہوم اور لمبی بات کو مختصر سے الفاظ میں اس حسن و خوبی کے ساتھ ادا فرماتے کہ فصاحت و بلاغت نطقِ مبارک کی بلائیں لینے لگتیں! کسی کو نصیحت کرنی ہوتی تو مجمع میں اس کا نام نہ لیتے بلکہ یوں فرماتے۔۔۔۔ لوگ ایسا کرتے ہیں۔ بعض آدمیوں کی یہ عادت ہو گئی ہے ۔۔۔۔۔۔!

عصمت و پاکبازی کا وہ عالم کہ کروبیانِ عرش اور قدسیانِ ملاءِ اعلیٰ ایسی معصوم زندگی کی تمنا کریں مگر خشیتِ الٰہی سے اکثر آنکھیں بھیگ جاتیں، رات کو سجدے میں اپنے معبود کے حضور گریہ و زاری فرماتے، تیز ہوائیں چلتیں تو خوفِ خدا سے سہم جاتے اور استغفار

کرتے، عرفات کے میدان میں بھکاری کی طرح ہاتھ پھیلا کر دعا مانگتے: شافع یوم الحساب مگر نطق وحی ترجمان سے یہ الفاظ بھی سُنے گئے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی سے میری مغفرت ہوگی!

رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین، امام المرسلین، خیر البشر اور افضل الخلق مگر "بشر" جو کوئی حضورؐ کی "بشریت" سے انکار کرتا ہے وہ قرآن کو جھٹلاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے محبوب مگر ساتھ ہی اللہ کے اتنے فرمانبردار بندے کہ جیسا خضوع وخشوع، تضرع اور تذلل بندگی آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا ہے اور کسی نے پیش نہیں کیا، زندگی بھر اسی کی عملاً تعلیم دی کہ جو کچھ مانگو اللہ تعالیٰ سے مانگو وہی عالم الغیب والشہادہ ہے وہی مشکل کشا، اور دلوں کا حال جاننے والا ہے وہی ہر کسی کی فریاد و دعا کو سنتا اور مشکلوں کو کھولتا ہے عام مخلوقات ہی نہیں نبی اور رسول بھی اُسی کے کرم کے محتاج ہیں، اللہ تعالیٰ پر کسی کا زور نہیں چلتا، بادشاہوں کی طرح اللہ تعالیٰ کا کوئی مصاحب، درباری اور ہم نشین نہیں، اللہ کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اُس کا سب سے بڑھ کر فرمانبردار ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحرا نشینوں کو جہانبانی کے آداب سکھائے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت اُن کی ٹھوکروں سے لگے ہوئے تھے اور روم ومدائن کا شکوہ اُن کو سلامی دیتا تھا، صلح وجنگ کے کیا حدود ہیں؟ سفارت و حلیفی کے کیا طریقے ہیں؟ تجارت کے کیا اصول ہیں! نماز کس طرح پڑھنی چاہئے، دعا کس انداز میں مانگنی چاہئے، اللہ کے حقوق کے ساتھ بندوں کے کیا حقوق ہیں؟ محفل میں نشست و برخاست، سونے، کھانے، پینے اور بولنے چالنے کے کیا آداب ہیں! غرض زندگی کے ہر گوشہ کے لئے ہدایت دی!

صاحب وحی والہام اور مہبط وحی قرآن: اللہ کی کتاب کے صرف تلاوت کرنے والے ہی نہیں اُس کے معلم بھی اور مزکّی نفوس بھی، اللہ غنی: تزکیہ نفس کی یہ شان کہ کفر وشرک سے جو قلوب غبار آلود تھے انہیں توحید کے آب حیات سے دھوکر آئینہ کی طرح مجلّا اور مصفّا بنا دیا۔ جن کے شب و روز فسق و فجور میں بسر ہوتے تھے، وہ حضورؐ کی تربیت کی بدولت نیک، متقی اور خدا رسیدہ بن گئے، رہزنوں کو دنیا کی رہبری کے قابل بنا دیا فحاشی وعریانی کے علمبرداروں میں غیرت وحمیت اور پاکبازی کی بجلیاں دوڑا دیں ایک فرد یا دس بیس نفوس کا نہیں پورے معاشرے کا تزکیہ کیا اور سوسائٹی کے مزاج کو بدل کر رکھ دیا، بتوں کے پجاریوں ہی سے خود اُن کے جھوٹے خداؤں کو تڑوا دیا! جہاں اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا، وہاں چاروں طرف نور ہی نور پھیل گیا! لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے والے عورت کے غمخوار و قدر شناس اور اُس کی عصمت وعفت کے محافظ بن گئے۔ جہل کو علم سے، ظلم کو عدل سے، شقاوت کو نرم دلی سے، برائی کو نیکی سے، بے حیائی کو حیا سے اور انتشار و پراگندگی کو ضبط و نظم سے بدلا! انسانیت کو معراج نصیب ہوئی اور بشریت کو سعادت ابدی میسر آئی، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی اطاعت کو فرض ٹھیرایا اور کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول یہ دونوں دین کی اصل، ماخذ اور مرجع ومنبع قرار پائے۔ جس کسی نے قرآن کی آڑ میں سنت رسول کا انکار کیا اس نے دین کے ایک ستون کو ڈھا دیا، قرآن ز . . . (اطیعوا الرسول) کے جھٹلانے والے کو قرآن کریم سے گمراہی کے سوا اور مل ہی کیا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف قرآن کے لفظ و معنیٰ کے شارح و مفسر اور معلم ہی نہ تھے بلکہ حضورؐ قرآنی احکام کو نافذ اور حدود اللہ کے جاری کرنے والے بھی تھے، زنا کاروں، شراب خواروں، چوروں اور قاتلوں کو حضورؐ نے سزائیں دیں اور حکومت

کی قوت سے منکرات کو مٹایا اور معروف کو قائم کیا ۔

اُسوۂ رسول اور سیرتِ نبوی کا یہ وہ آئینہ ہے جس میں اصاغر و اکابر، خواص و عوام، حاکم و محکوم، غریب اور دولتمند عالم اور جاہل، اہلِ سیاست اور اہلِ تجارت سب اپنی زندگیوں کو دیکھیں اور سوچیں کہ کہاں کتنا بگاڑ پایا جاتا ہے اور پھر ہم سب اصلاح کی جدوجہد کریں ! بگڑے ہوئے سنبھل سکتے ہیں، بگاڑ دور ہو سکتا ہے، گمراہی ہدایت سے بدل سکتی ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے پارس سے مسِ خام آج بھی زرِ خالص بن سکتا ہے ، کلب گھر اور ہوٹل ہی نہیں مدرسے اور خانقاہیں بھی اصلاح و انقلاب کی محتاج ہیں اور کوٹ پتلون ہی نہیں عمامے اور قبائیں بھی نیکی اور تقویٰ کے شوب کی آرزومند ہیں ، (یہ سطریں تلمیذ کرتے ہوئے خود راقم الحروف کتنی ندامت محسوس کر رہا ہے ، اللہم اصلح احوالی)

خانقاہوں اور مدرسوں میں قرآن و حدیث کی تعلیم دی جا رہی ہو اور مسجدوں میں قرآن کریم کی تلاوت جاری ہو مگر معاشرے میں کتاب و سنت کے احکام کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہو رہی ہو ، ایسی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیواؤں اور حضور کی غلامی کا دم بھرنے والوں کا کیا فریضہ ہے ؟ اللہ کا دین غالب ہونے کے لئے آیا تھا یا مظلوم و مجبور بننے کے لئے !

— ۲۳ جون ۱۹۶۵ء

سید عبدالسلام زینی

تصویر کے دو رخ

ہم مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ دعویٰ رہا ہے اور آج بھی ہے کہ ہم دنیا کی واحد اور منفرد قوم ہیں جس کے پاس خدا کی ہدایت اپنی خالص اور مکمل شکل میں جوں کی توں بالکل اُسی طرح موجود ہے جس طرح وہ خدا کے رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر نازل ہوئی تھی اور سچ یہ ہے کہ ہمارا یہ دعویٰ ایک ایسی صداقت ہے کہ جس کو نہ کبھی جھٹلایا جا سکا ہے اور نہ کبھی جھٹلایا جا سکتا ہے۔ ہمیں اپنی اس خوش بختی پر جس قدر بھی ناز ہو کم ہے۔

لیکن تصویر کا یہ رخ جتنا دلآویز اور تابناک ہے دوسرا رخ اُسی قدر قبیح اور کریہہ المنظر ہے جس کو دیکھ کر کوئی بھی مسلمان ندامت محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ دوسرا رُخ ہمارے اخلاق و سیرت کا رخ ہے ہمارے اعمال و افعال کا رخ ہے جو نہ صرف اُس ہدایت کے منافی ہے جس کے امین ہونے کے ہم دعوے دار ہیں بلکہ الٹا اُسے رسوا اور بدنام کرنے کا موجب ہے۔

یہ ہدایت کتاب اللہ اور سنّت رسولؐ ہے اس کے امانت دار بلکہ اجارہ دار ہونے کا ہمیں بے حد غرہ ہے لیکن آج ہم جو سلوک اس کے ساتھ روا رکھ رہے ہیں وہ بڑا ہی شرمناک اور حقارت آمیز ہے ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض تو یہ تھا کہ ہم اپنی پوری زندگی کا نقشہ اس ہدایت کی روشنی اور رہنمائی میں ترتیب دیتے لیکن ایمان کے بلند بانگ دعووں کے باوجود ہماری عملی زندگی اس ہدایت کی پیروی سے بالکلیہ آزاد ہے اس ہدایت کے ایک ایک جزو کی خلاف ورزی ہمارا روزمرہ کا معمول بن چکا ہے، چنانچہ جس کام سے یہ ہدایت ہمیں روکتی ہے وہ ہمارا سب سے زیادہ محبوب شغل ہے اور جس کام کے کرنے کا یہ حکم دیتی ہے اُس کے لئے ہمارا نفس کسی طرح آمادہ نہیں ہوتا اس کے باوجود نہ ہمارے اسلام میں کوئی فرق آتا ہے اور نہ ہمارے ایمان ہی میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں سب سے زیادہ زور توحید اختیار کرنے اور شرک سے بچنے پر دیا گیا ہے، لیکن آج شرک ہماری زندگیوں میں بری طرح رچ بس گیا ہے، قبر پرستی میں ہمیں کوئی قباحت نظر نہیں آتی حقیقی حاجت روا اگرچہ خدا ہی ہے لیکن مشکلیں پیر اور فقیر بھی آسان کر سکتے ہیں خدا بھی حاضر و ناظر اور عالم الغیب ہے اور (نعوذ باللہ) حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی اوصاف رکھتے ہیں، حضورؐ نے ہر بدعت کو گمراہی قرار دیا تھا مگر یہاں اب بدعات ہی اصل دین ٹھہری ہیں "قربانی کی فرضیت" "گیارہویں شریف" کی اہمیت کے سامنے ہیچ ہے، سود کو اسلام میں حرام ٹھہرایا گیا تھا لیکن اُسے ہم نے اپنے اقتصادی نظام کے محور کی حیثیت دے رکھی ہے۔ مزید برآں اسلام میں اس کے جواز کی گنجائشیں نکالی جا رہی ہیں شراب کی حرمت، حلّت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے، فحاشی اور بے حیائی کو مہذب اور روشن خیال ہونے کا لازمہ تصور کیا جاتا ہے اور جو لوگ دین پر چلنا چاہتے ہیں نیکی اور پارسائی کی راہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُنہیں بلکہ کر تمسخر و استہزاء کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہماری زندگی کا کوئی بھی شعبہ اب ایسا باقی نہیں رہا ہے جس میں فساد اور بگاڑ

رونما نہ ہو چکا ہو ایوانِ حکومت وسیاست سے لے کر مدرسہ و خانقاہ تک اور تاجروں اور صنعت کاروں سے لے کر مزدوروں اور کسانوں تک جدھر بھی نظر ڈالیے صلاح و فلاح کے آثار معدوم ہیں مگر ان تمام گمراہیوں کے باوجود ہماری "حمیّت دینی" اور "غیرت ایمانی" یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی ہمارے مسلمان ہونے میں شبہ کرے۔

ایک بزرگ کے بقول اس دور میں سانپ کی قسموں کو گننا آسان ہے لیکن مسلمانوں کی اقسام کا شمار مشکل ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ حالت یہ ہے کہ جو پانچ وقت کی نماز پڑھے اور روزے رکھے وہ بھی مسلمان ہے اور جو ان سب کا مذاق اڑائے وہ بھی مومن ہے اور جو یہ کہے کہ اسلام ہی کو ہمارے ملک کا نظام اور ہماری زندگی کا ضابطہ قرار پانا چاہیے وہ بھی مسلمان ہے اور جو یہ کہے کہ اسلام چودہ سو سال پرانا ہو چکا ہے وہ اب اس دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتا اُسے" دائرہ اسلام کے اندر ہی تصور کیا جائے، مسلمان ہونے کے لئے توحید و رسالت و آخرت پر ایمان ہونا ضروری بھی ہے مگر ملتِ مسلمہ کا فرد ہونے کا شرف اُس دہریے کو بھی حاصل رہتا ہے جو ان سب کا منکر ہو لیکن مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہوا ہو قرآن کہتا ہے کہ مشرک آزاد کے مقابلے میں تمہارے لئے مومن غلام بہتر ہے مگر یہاں خدا کے منکروں اور نعوذ باللہ کارل مارکس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بڑا انسان ماننے والوں کو بھی بڑے بڑے دیندار اور پارسا گھرانوں کی لڑکیاں بیاہ دی جاتی ہیں۔ دین و ملت کے ساتھ ہر چند کہ یہ ایک دردناک ستم ظریفی ہے مگر اب یہ ستم ظریفی گوارا کی جارہی ہے۔

اس صورت حال کے پیدا کرنے میں اگرچہ معاشرے کے تمام طبقے شریک ہیں اور اس کا ذمہ دار تنہا کسی ایک طبقے کو نہیں ٹھہرایا جاسکتا مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کا سب سے زیادہ وبال اُن نام نہاد علمائے دین پر ہے جنہوں نے اگرچہ علمائے یہود کی طرح کتاب اللہ میں لفظی تحریف تو نہیں کی لیکن جنہوں نے نئی نئی باتیں شامل کر کے اور آیات قرآنی کی من مانی اور عجیب وغریب تاویلات کے ذریعے مسلمانوں کے اندر بے شمار فرقے پیدا کر دیے ہیں اور جن کے ان کارناموں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ مسلمان جو حق کے محاذ پر جمع ہو کر باطل قوتوں کو شکست دے سکتے تھے وہ آج خود آپس میں دست و گریباں ہیں۔

ایک دردمند اور صاحب نظر آدمی جب ان حالات کو دیکھتا ہے تو وہ گہرے سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کیا علماء کا کام یہی ہے کہ وہ فرقہ وارانہ تعصبات کو ہوا دیں عام مسلمانوں کے دلوں میں نفرت و عداوت کے بیج بوئیں اور اپنا سارا زور خطابت لاطائل اور بے مقصد فقہی اور کلامی بحثوں پر صرف کرتے رہیں چاہے دین کو کتنا ہی ضعف پہونچتا رہے اور حق کا محاذ کمزور ہوتا رہے۔

بہرحال علماء اور مذہبی طبقوں کا یہ طرز عمل معاشرے کے عام افراد میں اور بالخصوص جدید تعلیم یافتہ اور نوجوان طبقے میں مذہب سے مایوسی اور ذہنی پراگندگی پیدا کرنے کا موجب ہو رہا ہے اُن کی اس ذہنی کیفیت کا اندازہ اسی آدمی کو ہوسکتا ہے جسے معاشرے کے ان مختلف طبقات کے لوگوں کے خیالات معلوم کرنے کا موقع ملا ہو۔ ہمارے ان علماء کرام کو لوگوں کے خیالات سے آگہی نہیں وہ نماز با جماعت کے علاوہ نہ کبھی عام لوگوں سے ملتے ہیں اور نہ اُن کے خیالات سے واقف ہونے کی کوشش کرتے ہیں معاشرے سے کٹ جانے کی وجہ سے انہیں یہ بھی خبر نہیں کہ۔ ع

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

ہم سمجھتے ہیں کہ عوام اور علماء کرام کے درمیان یہ بُعد خرابی کی اصل جڑ ہے اصلاح احوال کی کوئی تدبیر اس وقت تک کارگر نہیں ہوسکتی جب تک عوام میں گھل مل کر اُن کے خیالات اور اُن کی ذہنی کیفیات کو بخوبی سمجھا نہ جائے۔ یہاں ہم لوگوں کی نجی محفلوں میں ظاہر کیے جانے

والے چند خیالات مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کرتے ہیں ذرا اندازہ کیجئے کہ قرآن نے جس دین کو "دینِ مبین" قرار دیا تھا آج عام آدمی کے لئے اُس کا کوئی حقیقی تصور قائم کرنا کتنا مشکل ہو رہا ہے۔

حق کی شناخت مشکل ہے

"اسلام میں بھی بہتر فرقے ہیں کس کو مانیں اور کس کو چھوڑیں شیعہ کچھ کہتے ہیں سنی کچھ۔ بریلویوں کا مذہب اور ہے وہابیوں کا مذہب اور اپنی تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہر ایک دوسرے کو کافر و مشرک ٹھہراتا ہے خدا ہی جانے کون سچا ہے کون جھوٹا ہے، قرآن و سنّت سے اپنے برحق ہونے کے دلائل بھی دیتے ہیں۔"

سیدھے سادھے مسلمان

"دین میں تفرقے کیوں نہ پڑیں حضورؐ نے جو ارشاد فرمایا تھا کہ چودھویں صدی میں میری اُمت بہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ یہ فرقہ بندی تو ہونا ہی تھی ہم تو سرے سے ان جھگڑوں میں پڑنا ہی پسند نہیں کرتے سیدھے سادھے مسلمان ہیں نماز روزہ فرض ہے سو خدا کے فضل سے کر لیتے ہیں۔"

اہلِ سنّت والجماعت

"اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو تو سبھی مانتے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ اولیا اللہ اور بزرگوں کا منکر تو نہیں ہے۔ نیاز فاتحہ اور حضورؐ کے علمِ غیب کا بھی قائل ہے۔ محض عالم ہونا تو کافی نہیں عالم تو وہابی بھی ہو سکتا ہے جو گیارہویں کو مانتے ہیں نہ حضورؐ کے حاضر و ناظر ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ ہماری نماز تو اُسی کے پیچھے ہو سکتی ہے جو خالص اہلِ سنت والجماعت ہو۔"

خطرۂ ایمان

"ٹھیک ہے قرآن پر ہمارا ایمان ہے اس کا پڑھنا خیر و برکت کا موجب ہے لیکن ترجمے کا کیا بھروسہ ہمارے حضرت نے تو ہمیں ہدایت کی ہے کہ ایمان کی سلامتی اسی میں ہے کہ ترجمے والا قرآن نہ پڑھو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی غلط عقیدے کے مولوی کا ترجمہ شدہ ہو اور تمہارا ایمان خراب ہو جائے۔"

شریعت و طریقت

"شریعت و طریقت میں زمین و آسمان کا فرق ہے شریعت ظاہر سے تعلق رکھتی ہے اور طریقت باطن سے۔ ایک چیز جو بظاہر شریعت کی رُو سے ناجائز معلوم دیتی ہے صوفیاء اسے بالکل جائز سمجھتے ہیں مثلاً سماع۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ کسی پیر کو خلافِ شریعت اور بری بات میں مبتلا دیکھو تو بھی اُس سے بدعقیدہ نہ ہو، ترجمانِ حقیقت حضرت حافظ شیرازی رحمت اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

به مے سجاده رنگین کن اگر پیرِ مغاں گوید
که عارف بے خبر نبود ز راه و رسمِ منزلہا

دین و دنیا کی علیحدگی کا تصوّر

"مولوی صاحبان کو آخر سیاست سے کیا واسطہ؟ اقتدار کی ہوس ہے جو کچھ دنیا پرست مولویوں کو سیاست میں کھینچ لائی ہے کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ یہ لوگ اپنا کام دین کی تبلیغ تک محدود رکھتے سیاست اور حکومت کے معاملات میں دخل دینے سے باز رہتے۔"

اسلام ہے کہاں؟

"بے شک ہم مسلمان ہیں۔ مسلمان ماں باپ کی اولاد ہیں مگر آپ ہی بتایئے کہ اسلام ہے کہاں؟ ایک مولوی کچھ دوسرا مولوی کچھ کہتا ہے۔ جتنے مولوی اُتنی باتیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اسلام آدمی کی زندگی کا ایک نجی مسئلہ ہے اس کا دنیا کی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ آپ خواہ مخواہ ہر معاملے میں اسلام کی ٹانگ اڑاتے رہتے ہیں۔"

. . . .

اختلافات سے محفوظ رہنے کا نسخہ

"اصولی طور پر ہم اسلامی قانون کے مخالف نہیں ہیں ہم بھی مسلمان ہیں ہم بھی یہی چا
ہیں کہ ملک میں اسلامی قانون رائج ہو مگر فی الحال ایسا ممکن نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے
پاکستان میں سب مسلمان ہی بستے ہیں۔ مگر عقائد مختلف ہیں کئی فرقے ہیں اور ہر فرقے کی شریعت جدا ہے اگر ایک کی شریعت کو ملک کا قانون بنا
تو دوسرا اعتراض کرے گا۔ دوسرے کی شریعت کو اختیار کیا جائے تو تیسرا فرقہ ناراض ہوگا۔ ایسی صورت میں کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم حکومت وسیا
کے معاملے میں دین کو بیچ میں لائیں ہی نہیں "

قرآن کی ماڈرن تفسیر

"ملّا نے قرآن کو سمجھا ہی نہیں اُس نے ہمیشہ اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھا۔ جزوی اور فروعی اختلا
کے چیستاں میں خود بھی الجھتا رہا اور دوسروں کو بھی الجھائے رکھا۔ دین کی روح کی اُسے خبر تک نہ
اب اسی پردے ہی کو لے لیجئے۔ ملّا عورتوں کو برقعے میں لپیٹ کر چلنے پر زور دیتا ہے حالانکہ قرآن میں حجاب کا لفظ آیا ہے جس کے معنی "شرم
حیا" کے ہیں۔ سو پردے کے قرآنی احکام پر عمل کرنے کے لئے آنکھوں کی شرم کافی ہے۔ مغرب نے قرآن کی انہی حقیقتوں کو سمجھا اور ان سے فـ
اٹھایا وہاں عورتوں نے مردوں کے شانہ بشانہ کام کرکے سوسائٹی میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے "

یہ بھی کلمہ گو ہیں

".. ذرا مجھے نماز پڑھنا تھی یہاں آس پاس کوئی مسجد بھی ہے ؟"
".. نہیں ! یہاں قریب میں تو کوئی مسجد نہیں ہے "
" اچھا ! ذرا جانماز منگوا دیجئے میں یہیں نماز ادا کرلیتا ہوں "
" جانماز ! وہ جسے بچھا کر لوگ نماز پڑھتے ہیں "
" جی ہاں ! وہی کپڑا یا چٹائی "
" معاف کیجئے گا وہ تو ہمارے گھر میں نہیں ہے "
" اچھا ! یہ تو بتائیے قبلہ کدھر ہے میں نماز یہیں گھاس پر پڑھ لیتا ہوں۔"
" قبلہ ! یعنی آپ کا مطلب ہے ڈیڈی کہاں ہیں ؟"
" جی نہیں میری مراد یہ ہے کہ کدھر منہ کرکے نماز پڑھی جائے "
" اچھا ٹھہریئے ! میں ڈیڈی سے دریافت کرتا ہوں "

ملّا ٹائپ

" یار تم نے پتلون ٹیڈی طرز کی کیوں نہیں سلوائی "
" کیا کروں۔ ڈیڈی سلوا کر ہی نہیں دیتے "
" ارے یار ! تمہیں نہیں معلوم اِن کے ڈیڈی ملّا ٹائپ ہیں۔ اُن کے ڈاڑھی ہے ڈاڑھی "

یہ خیالات جو ہماری قوم کے مختلف طبقات کی گوناگوں ذہنی کیفیات اور فکری سطح کی عکاسی کرتے ہیں، درحقیقت علاما
ہیں۔ جن پر غور و فکر کرکے ہی مسلمانوں کے اصل امراض کی تشخیص اور اُن کا علاج تجویز کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے درمیان ایسے افراد
موجود ہیں جو اپنی اپنی بساط کے مطابق مسلمانوں کے عقیدہ و ایمان کی بیماریوں کا علاج کرنے کی سعی کررہے ہیں لیکن اُن میں سے بہت کم
ہیں جنہیں طبیب کا درجہ حاصل ہو۔ بڑی تعداد عطائیوں پر ہی مشتمل ہے یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے کہنہ و پیچیدہ امراض کا پورا پورا ف

رکھتے ہیں اور ان کے علاج کی نزاکتوں سے واقف ہیں۔ یہ نیم ملا و نیم حکیم دو ایسے مریضوں کو جن میں سے ایک دین و شریعت سے غفلت کا مریض ہے اور دوسرا شرک و بدعت کا ایک ہی نسخہ تجویز کرتے ہیں اور ان کے امراض کی نوعیت کے فرق کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں جوں جوں دوا ہوتی ہے مرض بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ مریض کا اعتقاد پہلے طبیب سے اور پھر بڑھتے بڑھتے علاج ہی سے اٹھ جاتا ہے۔ ادھر طبیب یعنی مولوی صاحبان خود مریض کو لا علاج یعنی بدعقیدہ اور کافر و مشرک قرار دے کر مطمئن ہو بیٹھتے ہیں

عقیدے اور نظریئے کی خرابیوں میں ملوث لوگوں کا اگر ہم دقت نظر سے جائزہ لیں تو انہیں بڑی آسانی سے دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک گروہ تو وہ ہے جو بنیادی طور پر مذہب کی ضرورت ہی کا قائل نہیں رہا ہے اور توحید و رسالت اور قرآن و آخرت ہر چیز کا منکر ہے اور اپنی زندگی کے مسائل کا حل اشتراکیت یا مغربی طرز کی لادینیت میں تلاش کرتا ہے دوسرا گروہ وہ ہے جو بنیادی طور پر مذہب کی ضرورت کا قائل تو ہے اور اسلام سے گہری وابستگی بھی رکھتا ہے لیکن لاعلمی اور جہالت کی بنا پر شرک و بدعت جیسی مہلک خرابیوں میں مبتلا ہو چکا ہے اور اب دنیا پرست مولویوں کے بہکانے میں آکر اوہام و خرافات ہی کو اسلامی تعلیمات تصور کر بیٹھا ہے۔ تعصب اور فرقہ پرستی نے آنکھوں پر پٹیاں باندھ رکھی ہیں۔ لیکن اس بات کا امکان ہر وقت موجود ہے کہ اگر اسے کسی طرح یہ باور کیا جائے کہ جسے تم دین و شریعت تصور کئے بیٹھے ہو یہ دین نہیں بلکہ بے دینی ہے تو اسی وقت ان خرابیوں سے کنارہ کش ہو جائے

ان دونوں گروہوں کے درمیان جو واضح فرق پایا جاتا ہے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ ان کے ساتھ داعی اور مبلغ کے سلوک اور برتاؤ میں بھی واضح فرق موجود ہو اور ان کا علاج تجویز کرتے وقت پوری حکمت اور احساس ذمہ داری سے کام لیا جائے جو لوگ اول الذکر گروہ کی اصلاح و تبلیغ کا فریضہ انجام دیں انہیں قرآن و سنت کے علوم پر عبور کے ساتھ ساتھ فلسفہ اشتراکیت اور مغربی مادی تہذیب کے سرچشموں کا بھی بخوبی علم ہونا چاہئے اور جو لوگ ثانی الذکر گروہ میں کام کریں انہیں محض دین کا عالم اور شرک و بدعات کے صرف نام ہی سے واقف نہیں ہونا چاہئے بلکہ مسلمانوں میں مروّج بدعات اور مشرکانہ عقائد کی ماہیت، ماخذ، تاریخ اور اسباب سے بھی کما حقہٗ باخبر ہونا چاہئے کیونکہ دعوت و تبلیغ کے اس ضروری تقاضے کو پورا کئے بغیر نہ احقاق حق ہی کیا جا سکتا ہے نہ ابطال باطل ہی ممکن ہے وہ منہ پھٹ جاہل اور کج بحث مبلغین جو افہام و تفہیم کی راہ ترک کر کے مناظرہ و مجادلہ کی راہ اختیار کرتے ہیں دراصل اس گروہ کے امراض کو بڑھانے کا سبب بنتے ہیں۔

بدعات و مشرکانہ عقائد جو بدقسمتی سے آج مسلمانوں کی اکثریت کا مذہب بن گئے ہیں اور جن کی وجہ سے ان کے اخلاق و اعمال میں ہزارہا رخنے پیدا ہو رہے ہیں ان کے متعلق کوئی سطحی رائے نہیں قائم کر لینی چاہئے جن لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ان کا استیصال محض زور خطابت سے کیا جا سکتا ہے وہ سخت خود فریبی میں مبتلا ہیں کیونکہ ان مشرکانہ عقائد و بدعات کی جڑیں ہمارے عام اندازوں سے کہیں زیادہ مضبوطی سے جمی ہوئی ہیں۔ ان کی ایک تاریخ اور ایک فکری اور تہذیبی پس منظر ہے۔ جن لوگوں نے برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ کا ذرا بھی غور سے مطالعہ کیا ہے وہ گواہی دیں گے کہ یہ خرابیاں شروع سے ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں، ہم نے اسلام تو قبول کر لیا مگر ہمیں مسلمان بننے کے لئے ضروری تربیت میسر نہیں آئی جس کی وجہ سے زمانۂ جاہلیہ کی بے شمار خرابیوں کو ہم آج تک سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

ملبوسات کی اسلامی بنیادیں

(اظہر علی فاروقی - ایم - اے - ایم - او - ایل - ایف - آر - اے - ایس)

ایک خوبصورت ہزار خوبیاں ، یا ملبوسات انسانی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں ، یقیناً بعد والی چیزیں ہیں ، بنی نوع انسان نے فضاؤں کی برودت ، تیز و تند دھوپ کی تمازت اور مرمری ہواؤں کی جھلسا دینے والی لپٹوں سے محفوظ رہنے سے زیادہ شرم و حیا کی تن ڈھانکنا ضروری سمجھا ۔ وہ شرم و حیا ہی تھی جس نے حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اپنے بدن پتوں سے ڈھانکیں ۔

فلما ذاقا الشجرۃ بدت لھما سوأتھما و	جب ان دونوں (آدمؑ و حواؑ) نے درخت کا پھل چکھا
طفقا یخصفن علیھما من ورق الجنۃ ...	تو انہیں ان کا ننگا بدن دکھائی دینے لگا اور انہوں نے
	پتوں سے اپنا اپنا بدن ڈھانکا ۔

اس بدن ڈھانکنے ہی کو عربی میں ' ستر عورۃ ' کہتے ہیں اور عورۃ بدن کا وہ حصہ کہلایا جس کا ڈھانکنا ضروری سمجھا گیا ۔

اسلام کے علاوہ غالباً دنیا کا کوئی دوسرا مذہب ایسا نہیں ہے جس نے اس کی حدبندی کی ہو اور ستر عورۃ کا تعین کیا ہو ۔ اس عدم تعین کا نتیجہ ہے کہ ہمیں کہیں صرف آگا پیچھا چھپائے لوگ نظر آئیں گے اور کہیں کھلی پنڈلیاں اور بغلیں سر بازار نظر آتی ہیں ۔

اسلام نے مردوں کے لئے ناف سے گھٹنوں تک بدن چھپانا اور عورتوں کے لئے پورا بدن چھپانا ضروری قرار دیا ۔ محرموں کے سامنے ہاتھ اور چہرہ کھلا رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور اس طرح ستر عورۃ کی حدیں مقرر کر دیں اور یہی سب سے پہلا اور بنیادی اصول ہے ۔

اسی بنیادی اصول کے تحت ثقہ مسلمان شارٹ ، ہاف پینٹ یا نیکر پہننے سے احتراز کرتے ہیں اور اسی بنیادی قانون کی رو سے جانگیا اور انڈر ویر پہن کر سب کے سامنے نکلنے اور کام کاج کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا ۔ مسلمان پہلوانوں کا صرف لنگوٹ چڈھی پہن کر دنگلوں میں کشتی لڑنا ۔ کھیل کود کے میدانوں میں جانگیا پہن کر شرکت کرنا اپنے اپنے اکھاڑوں میں ڈنڈ بیٹھک کرنا کرنا سب کچھ اسی تحت میں آجاتا ہے میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ اس سلسلے میں اس بنیادی اصول میں عموم بلوی اور عوامی سہولت اور عام کے لئے کچھ لچک پیدا کر دی جائے تو بہتر ہے پولیس اور فوجی افراد کی یونیفارم کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا اگرچہ اب دونوں محکموں میں شارٹ کی جگہ سلیک (پینٹ) ہو گئے ہیں ۔

ستر عورۃ کی تعین اور حدبندی پر عمل درآمد کرنا دو موقعوں پر بہت ضروری سمجھا گیا (۱) عبادۃ اور (۲) خلوۃ سے جلوۃ میں آتے وقت ۔ گویا مردوں کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ عبادت اور گھر سے باہر نکلتے وقت بدن کا اتنا حصہ ضرور چھپائیں اور صرف انڈر ویر میں سڑکوں پر نہ گھومیں ۔

عورتوں کے کپڑوں میں لہنگا ، ساری ، لکھنوی کلی دار پاجامے اور موجودہ غرارے کے بارے میں اب آپ خود سوچ سکتے

اس حدبندی نے کم سواد عوام میں ایک غلط فہمی پیدا کر دی ہے کہ گھٹنا کھل جانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں۔ بلکہ دوسروں کے سامنے گھٹنا کھولنا ناپسندیدہ ہے محض گھٹنا کھل جانے سے وضو نہیں ٹوٹتا

ستر عورت کی حدبندی سے وابستہ ایک ضمیمہ دوسرا بنیادی قانون بن جاتا ہے:—

ما اسفل من الکعبین من الازار فی النار　　تہ بند کا ٹخنوں سے نیچے لٹکتا ہوا حصہ آگ (دوزخ) میں ہے

تہ بند اور پاجامے ٹخنوں سے نیچے لٹکتے ہوئے ہوں اور اگر ہم فی النار کو تادیبی تہدید ہی سمجھ لیں پھر بھی ٹخنوں سے نیچے پاجامے اس بنیادی اصول کی رو سے غیر مشروع قرار دیا ہیں۔

اس سلسلے میں حضرت ابن عباس[1] اور حضرت عمرو بن شعیب[2] سے مروی دو حدیثیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ کل ما شئت وَ ماشئت (جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو) اور کلوا، واشربوا وتصدقوا والبسوا (کھاؤ، پیو، صدقہ کرو اور پہنو (جو چ اب اس تعمیم میں ایک تخصیص ملاحظہ فرمائیے اور مستثنیات پر غور فرمائیے پہلی حدیث کے ساتھ ما اخطاتک اثنتان۔ سرف و مخیلۃ دوسری کے ساتھ ما لم یخالطہ اسراف و مخیلۃ دونوں میں اسراف اور نمود بے جا جس پر تکبر کا شبہ ہو قابل غور ہیں یعنی جو چاہو پہنو میں اسراف اور بے جا نام و نمود اور تکبر نہ پایا جائے گویا اس سلسلے کا یہ تیسرا بنیادی اصول ٹھہرا۔ یہ اصول بھی یوں ہی محض مبہم نہیں چھوڑ دیا گیا ہے، بلکہ ان دونوں کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔ مخیلہ اور خیلاء کے لفظوں کا بار بار آنا اور اس سے ممانعت میں جو راز ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہودیوں اور مجوسیوں کے علاوہ دوسری قوموں میں ڈھیلے ڈھالے فرش پر لٹکتے ہوئے اور چلنے میں گھسٹتے کپڑوں کو شان اور عظمت اور دولت و ثروت کی ایک نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے اس بے جا نام و نمود اور متکبرانہ شان کو ممنوع قرار دیا البتہ جہاں تکبر اور نمود بے جا کا شائبہ نہ ہو وہاں اس سے اغماض بھی برتا جاسکتا ہے۔

من جرّ ثوبہ خیلاءً لم ینظر اللہ الیہ یوم القیامۃ　　جس شخص نے اپنے کپڑے متکبرانہ انداز میں لٹکائے اس کی طرف خداوند کریم قیامت کے دن نگاہ تک نہ کرے گا۔

اس پر حضرت ابوبکر نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! (روحی فداک) میرا تہ بند لٹکتا رہتا ہے اگر میں اس کا خاص خیال نہ رکھوں رسول اللہ نے جواباً فرمایا انک لست من یفعلہ خیلاءً (ان لوگوں میں نہیں جو محض متکبرانہ ایسا کرتے ہیں)۔

اس سلسلے میں ایک بات اور واضح کر دی گئی ہے کہ اپنی حیثیت سے گرے ہوئے اور میلے اور گندے کپڑے بھی نہ پہننا چاہئے۔ ملبوسات کی نوعیت کا یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی بھی تصریح موجود ہے کہ سوتی، ریشمی اور اونی کپڑوں میں سے کون سے کپڑے پہنے جاسکتے ہیں چنانچہ حضرت ابوموسی الاشعری سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا حرّم لباس الحریر والذھب علی ذکور امتی و احل لاناثھم (ریشمی کپڑے اور سونا میری امت کے مردوں پر حرام اور عورتوں کے لئے حلال و جائز کیا گیا ہے) حضرت علی سے مروی یہ روایت بھی اس بات پر روشنی ڈالتی ہے کہ رسول اللہ نے انہیں سونے کی انگوٹھی قسی کپڑا پہننے اور میاثر استعمال کرنے سے منع فرمایا تھا۔ قسی ایک قسم کا مصری کپڑا جو بہت باریک ہوتا تھا اور کتان اور حریر سے بنا جاتا تھا۔ میاثر میثرہ کی جمع ہے اور ریشمی گدوں سے مراد ہے۔ گوڑ

---

(۱) حضرت ابوہریرہؓ ترمذی شریف (۲) اور (۳) ترمذی شریف اور بخاری شریف (۴) بخاری شریف

کپڑا پہننے سے منع فرمایا جس کا تانا اور بانا دونوں ریشم ہوں۔ اس ممانعت میں جو جذبہ مخفی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے مردوں کی زندگیوں کو سپاہیانہ زندگی بخشی ہے اور اسی لئے رسولؐ اللہ نے ہر ایسے فعل سے ممانعت فرمائی ہے جو اُن کی دلیری اور شجاعت کو ٹھیس لگائے اور مردوں میں سہل پسندی اور تعیش پیدا کر کے ان کی جرأت اور ہمت کو مفلوج بنا کر رکھ دے اور عورتوں میں جو چیزیں بے حیائی پیدا کریں ممنوع قرار دی گئیں ابن مسعودؓ سے مروی حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے ابوموسیٰ الاشعریؓ کو اونی جبہ اونی کمّہ (ٹوپی) اونی کساء (چادر) کے استعمال کی اجازت دی اس سے ظاہر ہے تمام قسم کے سوتی اور اونی کپڑے مرد پہن سکتے ہیں۔ ایما اِھاب دبغ فقد طھر (ہر چمڑا جب دباغت کیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے) اس کلیہ سے اُن جانوروں کی کھالیں مستثنیٰ ہیں جن کا گوشت کھانا حرام ہے یا جن کے بدن نجس قرار دیئے گئے ہیں، جیسے سور، کتا وغیرہ۔ ایسا ریشمی کپڑا پہننا جائز ہے جس کے تانے یا بانے میں ایک سوت اور ایک ریشم ہو۔

ملبوسات کی ان قدروں میں انسؓ سے مروی ایک حدیث ایک ضمیمے کا کام کرتی ہے اور ہمیں بآسانی یہ نتیجہ نکالنے کی سہولت بہم پہونچاتی ہے ریشم صرف اس لئے ممنوع ہے جس کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں۔ واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت زبیر بن عوامؓ نے رسول اللہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ان کے پاس ریشمی قمیصیں ہیں جن میں جوں نہیں ہیں۔ رسولؐ اللہ نے انہیں ریشمی قمیصیں پہننے کی اجازت دے دی۔

نسوانی ملبوسات کے سلسلے میں حضرت دحیہ بن خلیفہؓ سے مروی یہ حدیث ایک بنیادی قدر کا کام کرتی ہے کہ ایک بار رسولؐ اللہ نے انہیں ایک قسم کا مصری کپڑا دیا جسے قباطی کہتے تھے اور فرمایا کہ اس کے دو ٹکڑے کر دو۔ ایک سے اپنا کرتہ بنا لو اور دوسرا ٹکڑا اپنی بیوی کو دے دینا کہ وہ اس کی اوڑھنی بنا لے یا مقنع (برقعہ) جب وہ اندر جانے کے لئے مڑے تو رسولؐ اللہ نے فرمایا" دیکھو اپنی بیوی سے کہہ دینا کہ اس کے نیچے کوئی دوسرا کپڑا لگائے تاکہ جسم دکھائی نہ دے"۔ ایک حدیث کو ایک بنیادی قدر سمجھنا چاہئے، جو حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے اور دوپٹہ اوڑھنے کا ڈھنگ بتاتی ہے۔

ان النبیؐ دخل علیہما وھی تختمر فامرھا بان تجعل الخمار علی راسھا وتحت حنکھا۔	رسولؐ اللہ حضرت ام سلمہؓ کے پاس تشریف لائے جب وہ (کسی طرح) دوپٹہ اوڑھ رہی تھیں پس رسولؐ اللہ نے ان کو حکم دیا کہ وہ اپنا دوپٹہ سر پر لے جا کر گردن کے نیچے سے نکال کر پھر سر پر ڈالیں (گویا دو پھیرے، اگلے ہوئے)

اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایک پھیرا (لَیَّۃ) ڈالا جس پر رسولؐ اللہ (روحی فداہٗ) نے فرمایا نہیں، دو پھیرے (لا لیّۃ بل لیتین)۔ اب اُن دوپٹوں کے بارے میں آپ خود سمجھتے ہیں جو محض گردن کی زینت کے لئے ہیں۔

ملبوسات کے رنگوں کے سلسلے میں آپ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت رسولؐ اللہ کو سفید رنگ سب سے زیادہ مرغوب اور پسند تھا، جبہ اور قبا میں سفید کے بعد سیاہ اور سبز۔ دھاریدار کپڑے پہننے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے ایسی چیزیں عورتوں کے لئے مخصوص ہیں۔

ـــــ ہادی برحق رسولؐ خدا (روحی فداہٗ) نے جزئی جزئی چیزوں کی طرف بھی صریح اشارے فرمائے ہیں۔ چنانچہ جب

لہ ترمذی شریف ٹہ ٹہ ترمذی اور بخاری شریف ٹہ ترمذی شریف

کپڑا پہننے اور اوڑھنے کی طرف سے اور اتارنے اور لوڑھنے کی طرف سے۔ پاجامہ - کرتہ - قمیص، جوتا اور موزہ سب کے لئے یہ حکم ہے جس کے تحت ایک طرح کا ضبط اور عادتوں میں ڈسپلن پیدا کرنا مقصود ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:—

من تشبہ بقوم فہو منہم — جس نے جس قوم سے مشابہت کی وہ اسی میں سے ہے۔

یہ ایک ایسی بنیادی قدر ہے جس میں اپنی انفرادیت کا وقار اور اپنی یونیفارم کا اعزاز شامل ہے جو ہمیں اپنی چیزوں سے محبت کرنا اور ان کا احترام کرنا سکھاتی ہے۔

یہ ہیں ہمارے ملبوسات کی بنیادی قدریں اور اس میں شک نہیں کہ امتدادِ زمانہ نے ہمارے ملبوسات کی صورتیں بدل دی ہیں لیکن ہمیں ان بنیادی قدروں کو ملحوظ رکھنا اشد ضروری ہے۔ ویسے تو وقت کے تقاضوں اور زمانے کی بدلتی ہوئی قدروں کے لحاظ سے ان کلیوں میں لچک پیدا کی جاسکتی ہے اور پیدا کی بھی گئی ہے جیسا آپ نے خود ملاحظہ کرلیا ہے اور سب سے آخر میں جس بنیادی قدر پر زور دیا گیا ہے اُسے بھی نہ بھولنا چاہیے۔

یا بنی آدم انزلنا علیکم لباسا یواری سوأتکم وریشا ولباس التقوی ذالک خیر۔ . . .

اے بنی آدم ہم نے تمہارے لئے کپڑے اتارے اور ریشم جس سے تم اپنے بدن چھپاتے ہو مگر یہ نہ بھولو کہ تقویٰ کا لباس زیادہ بہتر ہے۔

یعنی لباس اور زینت و آرائش میں اصل چیز جو قابلِ لحاظ اور لائقِ غور و فکر ہے وہ "تقویٰ" ہے، جہاں "تقویٰ" ہوگا، وہاں بدعنوانیاں نہ ہوں گی! اسلامی معاشرہ جس محور پر گھومتا ہے وہ "تقویٰ" ہے! یہی دین و دنیا میں مسلمانوں کے فوز و فلاح کا ضامن ہے (اللہم اجعلنا من المتقین)

ماہنامہ تاج اور بدعت!؟

میں تقریباً اٹھارہ برس تک ڈھاکے میں رہ کر ۲۱ر دسمبر ۶۹ء کو ڈھاکے سے مستقل طور سے منتقل ہو کر چاٹگام چلا آیا جو شعبان کی ۱۱ر یا ۱۲ر تاریخ تھی اور سنیچر کا دن تھا مگر ڈھاکے سے چلا تھا جمعے کا دن گزار کر ۱۲ بجے شب کو۔ جمعے کی نماز جس مسجد میں برابر پڑھتا تھا اور ہر اتوار کو جس میں تفسیر بیان کرتا تھا اسی مسجد میں رمضان شریف کے اخیر عشرے میں معتکف بھی ہر سال ہوا کرتا تھا، چلنے کے وقت مسجد کے نمازیوں کا اصرار ہوا کہ امسال بھی اعتکاف بھی اسی مسجد میں کیجئے۔ چنانچہ میں چاٹگام سے ۱۷ر رمضان شریف ہی کو ڈھاکے پہونچ گیا۔ تین دن بعض مخلص احباب کے یہاں رہا۔ ۲۰ر رمضان شریف کو اسی مسجد میں معتکف ہو گیا۔ پھر جمعرات کو اسی مسجد میں عید کی نماز پڑھی پھر جمعہ بھی وہیں پڑھا اور رات کی گاڑی سے چلا سنیچر کی صبح کو چاٹگام پہونچ گیا یہاں خطوط و اخبارات و رسائل جو ۱۷ر رمضان سے ۳ر شوال تک آئے تھے ان کا ایک ذخیرہ جمع تھا، رسالوں میں ایک نیا رسالہ "تاج" کراچی[1] بھی نظر سے گذرا تو پہلے اسی کو دیکھنے لگا، کیونکہ یہ رسالہ پہلے پہل نظر کے سامنے آیا تھا۔

پہلا ہی مضمون "توحید خالص کی رٹ" کے عنوان سے جناب بابا ذہین شاہ صاحب کا لکھا ہوا تھا۔ آغاز مضمون ہی اس جملے سے ہے —

"معاصر فاران بار بار دینِ خالص، ایمان خالص، توحید خالص کی طرف نشان دہی کر رہا ہے .... الخ" پورا مضمون پڑھ گیا تو دل کو سخت اذیت محسوس ہوئی۔ مولانا ماہر القادری سلمہ اللہ تعالیٰ یا فاران یا مولانا مودودی سلمہ اللہ تعالیٰ کی وجہ سے نہیں۔ اگرچہ مولانا ماہر القادری سے مجھ کو بہت محبت ہے اور اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ میں مولانا مودودی سے بھی محبت رکھتا ہوں باوجود اس کے کہ متعدد مسائل میں مجھ کو ان دونوں سے اختلاف ہے مگر وہ اختلاف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ ان دونوں کے اخلاص اور حسن نیت کے متعلق مجھ کو ہرگز سوء ظن نہیں پھر بھی میں اپنا یہ فرض نہیں سمجھتا کہ میں جن لوگوں سے محبت رکھتا ہوں ان کی طرف سے ہر موقع پر مدافعت بھی کرتا رہوں۔

مگر جناب بابا ذہین شاہ صاحب نے اپنے اس مضمون میں بدعت و سنت کے مفہوم کو کچھ اس طرح پیش فرمایا ہے جس سے طرح طرح کی غلط فہمی پھیل سکتی ہے اس لئے ایسے مضمون کے دیکھ لینے کے بعد میرا خموش رہنا شیطان اخرس بننے کے مرادف ہوگا۔ اس لئے اپنے محسن یاد فرما جناب بابا ذہین شاہ صاحب کی خدمت میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

اگر مجھ کو اس کا گمان غالب بھی ہوتا کہ میری گذارش کو جناب شاہ صاحب اپنے رسالہ "تاج" میں من وعن شائع فرما دیں گے تو میں اس مضمون کو انہیں کی خدمت میں بھیجتا مگر بڑے بڑے اہل تقویٰ و ورع مدیران رسائل کا جن سے دیرینہ مخلصانہ تعلقات ہیں یہ تجربہ رہا ہے کہ اپنے خلاف مضمون کو جس کا وہ جواب نہیں دے سکتے کبھی شائع نہیں کرتے اور بابا ذہین شاہ سے تو میری پہلی ملاقات ہے اس سے پہلے میں ان کے اسم گرامی سے بھی واقف نہ تھا۔ کیوں کر امید کر سکتا کہ وہ اپنے مضمون کا جواب من وعن شائع فرما دیں گے؟ تو جب قطعہ سرزمین پر سرزمین کی کوئی امید نہ تھی تو پھر تاج کے بعد فاران میں اس کا حقدار نظر آیا کہ فاران کی طرف سے جواب فاران ہی میں چھپے۔

اتنی ہی طوالت تمہید مجھ کو ناگوار طبع ہو رہی ہے اب اس کو کیوں طول کھینچوں، اس لئے گویا تمہید کو نا تمام چھوڑ کر اصل موضوع پر آتا ہوں۔

---

[1] یہ رسالہ نومبر ۱۹۶۹ء کا ہے۔ تعجب ہے کہ ماہ جنوری ۷۰ء میں نومبر ۶۹ء کا پرچہ کیوں آیا۔ دسمبر یا جنوری کا پرچہ کیوں نہیں آیا۔

جناب بابا ذہین شاہ صاحب نے اپنی تمہید ختم کرنے کے بعد ارشاد فرمایا ہے کہ ... کی بنا پر ...
بات کو منوانے کے لئے ضد اور تعصب کے غلبے میں علم و تحقیق سے اعراض کرنا تنگدلی بلکہ سنگدلی ہے۔
شاہ صاحب نے بہت صحیح فرمایا ہے اور مجھ کو امید رکھنی چاہیے کہ جناب شاہ صاحب خود بھی اپنے فرمودہ کے مطابق ضد اور تعصب سے احتراز فرماتے
ہوئے علم و تحقیق کی روشنی میں اپنے معتقدات اور دینی مشاغل کا جائزہ لیں گے۔

جناب شاہ صاحب اس کے بعد فرماتے ہیں :—

"ماہر صاحب بار بار کل بدعۃ ضلالۃ کو دہراتے ہیں اور ان کے نزدیک اس حدیث مبارکہ کا یہ مطلب ہے کہ بدعت کی کوئی قسم حسنہ ہو ہی نہیں سکتی ہر بدعت بلا استثناء سیئہ ہے گمراہی ہے۔ فرض کیجئے ہم ان کے کہنے سے حدیث شریف کا یہی مطلب مان لیں تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہوگا من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا من عمل بہا۔ ومن سن سنۃ سیئۃ فلہ وزرھا ووزر من عمل بہا (ترجمہ کو میں چھوڑتا ہوں اس کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں) اگر ہر بدعت گمراہی مانی جائے گی تو پھر سنت حسنہ اور سنت سیئہ کی تقسیم باطل ہو جائے گی۔ اور دونوں حدیثوں میں تعارض لازم آئے گا۔ کسی ایک حدیث کو ماننا اور دوسری کو قبول نہ کرنا بھی انکار حدیث ہے۔ پس دونوں حدیثوں میں توافق پیدا کرنا چاہیے اور اصل میں توافق موجود ہے تعارض پہلی حدیث میں بدعت کے معنی نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ دوسری حدیث میں بدعۃ کے معنی متعین ہو گئے کہ کل بدعۃ ضلالۃ میں بدعت سے سنۃ سیئۃ مراد ہے۔ بدعت حسنہ جس کو علمائے امت نے سنۃ الہدیٰ قرار دیا ہے وہ اس بدعت سیئہ کی ضد ہے جس کو سنۃ الضلالہ کہنا چاہیے ...... الخ"

بعض حکماء کا قول ہے ہر کارے و ہر مردے۔ بابا ذہین شاہ صاحب صوفی ہیں ان کو ذکر و شغل و مراقبہ و مکاشفہ سے اتنی فرصت کہاں ہوگی کہ وہ قرآن و حدیث میں فکر و تدبر فرمائیں یہ کام ان لوگوں کا ہے جن لوگوں نے اپنی پوری زندگی قرآن و حدیث کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے۔ بہرحال اب میں شاہ صاحب کی خدمت میں دونوں حدیثوں کا صحیح مفہوم عرض کرتا ہوں علم و تحقیق ہی کی روشنی میں ہمیں امید ہے کہ شاہ صاحب اپنے قول کے مطابق ضد، غلو اور تعصب سے کام نہ لیں گے اور ٹھنڈے دل سے میرے معروضے پر غور فرمائیں گے

کل بدعۃ ضلالۃ بلا استثناء حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کسی کو حق نہیں ہے کہ اس کلیّہ کے عموم کی تخصیص اور اس کے اطلاق کی تقلید کرے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک مجلس میں یہ حدیث پڑھی تو ایک شخص نے پوچھا کہ وان رآھا الناس حسنۃ؟ اور اگر لوگ اس کو حسنۃ سمجھیں؟ تو انہوں نے فرمایا وان رآھا الناس حسنۃ اگرچہ لوگ اس کو حسنہ سمجھیں۔[1]

باقی رہ گئی یہ روایت کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو تراویح کی نماز باجماعت پڑھتے دیکھا تو فرمایا کہ نعمت البدعۃ ہٰذہ۔ تو یہ روایت مرسل ہے ابن شہاب زہری عروہ بن الزبیر سے اس کی روایت کرتے ہیں اور ان کے سوا کوئی بھی اس کی روایت نہیں کرتا تو اب

---

[1] غالباً حدیث ہی فعلیہ و ... ہے ضعف بصارت کی وجہ سے مراجعت سے معذور ہوں۔ [2] فاران کے ترجمہ نمبر میں "نعمت البدعۃ" کی اطمینان بخش شرح کی گئی ہے کہ یہاں نعمت البدعۃ سے کیا مراد ہے! اور جو لوگ حضرت عمرؓ کے اس قول سے "بدعت" کی سیئہ اور حسنہ کی تقسیم پر دلیل لاتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ (م۔ق)

آحاد مرسل روایت سے ایک مشہور متفق علیہ حدیث کے عموم کی تخصیص کس طرح صحیح سمجھی جاسکتی ہے اور اگر واقعی حضرت فاروق اعظم نے ایسا فرمایا ہوتا تو انہیں کے صاحبزادے حضرت عبداللہ یہ نہ فرماتے کہ کل بدعۃ ضلالۃ وان رآها الناس حسنۃ۔ اس لئے بدعت کی یہ تقسیم بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ بعض اہل بدعت کا اختراع ہے ورنہ کوئی بدعۃ بھی حسنہ نہیں ہوسکتی۔ کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار۔

باقی رہی سنۃ حسنہ اور سنۃ سیئہ والی حدیث تو وہ بھی اپنی جگہ پر بہت صحیح ہے۔ آپ سنۃ اور بدعۃ کو خواہ مخواہ ایک قرار دے رہے ہیں۔ بدعۃ ایسے کام کو کہتے ہیں جو کام ہی نو ایجاد ہو۔ پہلے کبھی وہ کام نہ کیا گیا ہو اور سنۃ نام طریق کار کا ہے۔ دستور عمل کو بھی سنۃ کہتے ہیں۔ سنۃ اللہ التی قد خلت من قبل۔ کیا آپ اس کی تفسیر میں بدعۃ اللہ کہہ سکتے ہیں ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا وغیرہ آیات کو دیکھئے من سن سنۃ حسنۃ کے معنی یہ ہیں کہ کسی دینی کام کے انجام دینے کا جس نے کوئی نیا طریقہ نکالا۔ تو طریق کار کی تقسیم کو نفس کار کی تقسیم قرار دینا ایسی صریح غلطی ہے۔ کل بدعۃ ضلالۃ والی حدیث کہتی ہے کہ دین میں کوئی نیا کام نہ نکالو اور من سن سنۃ والی حدیث بتاتی ہے کہ جس نے کسی دینی کام کی انجام دہی کا کوئی نیا طریقہ نکالا۔ یہ طریقہ اچھا بھی ہوسکتا ہے اور برا بھی۔ اچھا اس طرح کہ حدود شرعیہ کے اندر رہتے ہوئے وہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے اور مفید بھی ہو اور برا دو حیثیتوں سے ہوگا۔ حدود شرعیہ اس طریق کو اختیار کرنے سے ٹوٹتے ہوں یا حدود تو نہ ٹوٹتے ہوں مگر مضر ہو۔ نقصان رساں ہو۔ تیسری صورت مباح کی بھی نکل سکتی ہے کہ نہ اس طریق کے اختیار کرنے سے حدود شرعیہ ٹوٹتے ہوں اور نہ وہ مضر اور نقصان رساں ہو اور نہ مفید ہو تو وہ مباح تو ہوگا مگر اس کا ترک ہی بہتر ہوگا اس لئے سابق طریق بھی اس کام کی انجام دہی کا کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ وہ ضرور تعامل اسلاف کی وجہ سے مسنون و ماثور ہوگا اور یہ نیا طریق غیر مسنون و غیر ماثور تو پھر جب اس سے کوئی فائدہ ونفع ہی حاصل نہیں ہوتا تو پھر مسنون و ماثور طریق کو چھوڑ کر بے فائدہ ایک غیر مسنون و غیر ماثور طریق کو اختیار کرنا مرجوح کو راجح بنانا ہوگا اس لئے غلط ہوگا۔

حدیث رسول کے عموم کی بلا دلیل واضح تخصیص یا اس کے اطلاق کی تقیید درحقیقت حدیث رسول کو حدیث رسول مان کر اس کا انکار ہے اور یہ عام منکرین حدیث کے انکار سے بدترین انکار حدیث ہے اس لئے کہ عام منکرین حدیث، مجموعہ احادیث کو حدیث رسول تسلیم نہیں کرتے ہیں ان کے حدیث رسول ہونے کے وہ منکر ہیں بخلاف اس کے جو کسی قول کو حدیث رسول تسلیم کر لینے کے بعد اس کے ماننے سے گریز کا راہ نکالے اس کے عموم کی بلا دلیل تخصیص کرکے اس کلیے کے بعض افراد سے اس عام حکم ساقط کر دینے کی سعی غیر محمود کرے۔

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک فعل مسنون کا جو ہر شخص اپنے گھر میں انجام دے رہا ہے اور کہیں کہیں چند آدمی باجماعت بھی متفرق طور سے ادا کر رہے تھے ایک طریق کار نکالا تھا۔ صوفیوں کی طرح سے صلوٰۃ العاشقین اور صلوٰۃ معکوس اور صلوٰۃ الرغائب نئی نئی نمازیں اور سب سے بڑھ کر صلوٰۃ غوثیہ کی قسم سے کوئی نئی نماز نہیں ایجاد کی تھی۔

اذان کوئی مستقل بالذات عبادت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس کو نداء الصلوٰۃ قرار دیا گیا ہے اس کے پکارنے کا جو طریق عہد نبوی میں تھا اس کو ادل بدل نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ وہ طریقہ مسنون و ماثور ہے۔ حضرت عمر یا حضرت عثمان خلفائے راشدین میں سے ہیں علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین کے رو سے انہوں نے اگر ندائے صلوٰۃ میں مناسب وقت کوئی اضافہ کیا تو وہ لوگ

متبوعین میں سے تھے تابعین میں سے نہ تھے، قرآن مجید میں سابقون الاولون کے ذکر کے بعد والذین اتبعوھم باحسان فرما کر یہ ثابت کر دیا کہ انہیں کے اتباع پر رضائے الٰہی موقوف ہے اور ان سابقون اولون میں درجۂ خصوصیت خلفائے راشدین کو حاصل ہے، مہاجرین والانصار رضی اللہ عنہم کے بعد کسی کو متبوعیت کا یہ شرف حاصل نہیں ہو سکتا چاہے وہ کوئی غوث الاغواث ہو یا قطب الاقطاب سب کے سب مجبور ہیں مہاجرین والانصار کے اتباع پر۔ اس لئے جس کا جی چاہے دین میں نئے نئے اختراع کرے۔ اس کی اجازت نہ قرآن مجید نے دی ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

افسوس یہ ہے کہ جب سے فرقہ بندیاں اسلام میں پیدا ہوئیں اور پھر عجمی تصوف نے اپنا دام پھیلانا شروع کیا اس وقت سے ہر فرقہ کسی نہ کسی بدعت میں ضرور مبتلا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی نے بھی بدعۃ کی جامع و مانع تعریف ایسی نہیں کی جس سے ہر شخص سمجھ لے کہ فلاں چیز بدعت ہے اور فلاں نہیں۔

میری ایک کتاب البدعۃ مدت سے مسودے کی شکل میں رکھی ہے جس میں قرآن و حدیث دونوں سے بدعت پر مکمل بحث کی گئی ہے بدعت کے متعلق حقیقی حدیثیں ہیں سب کو قرآنی آیات کے مطابق کر کے دکھایا ہے اور صحیح جامع و مانع تعریف بدعت کی قرآن و حدیث کی روشنی میں پیش کر دی ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ کب اس کی اشاعت کا سامان کر دیتا ہے۔

مجھ کو افسوس ہے کہ بابا ذہین شاہ صاحب سے آغاز تعارف ہی میں مجھ کو اختلاف کرنا پڑا انہوں نے اپنا پرچہ میرے پاس بھیجا جس کا میں ممنون ہوں مگر میں مجبور تھا کہ ان کے قول کے مطابق "علم تحقیق" کی روشنی میں بدعت و سنت کا فرق وضاحت سے پیش کر دوں امید ہے کہ وہ اس پر ٹھنڈے دل سے دیانت دارانہ غور فرمائیں گے اور تعصب و غلو سے کام نہ لیں گے۔

ادبی
اور
مذہبی
کتابیں

ماہرؔ کی کہانی ماہرؔ کی زبانی

مدیر "چراغِ راہ" نے میرے پاس ایک سوالنامہ بھیجا تھا، جس کے جوابات[1]، خاکسار نے جو کچھ لکھا تھا، وہ درج ذیل کیا جاتا ہے!

ماہرؔ القادری

● — پ شعر کیوں کہتے ہیں دوسرے لفظوں میں آپ کا نظریۂ شعر کیا ہے؟

ا — میں شعر کیوں کہتا ہوں؟ اس کا جواب میری غزل کے مقطع میں آپ کو مل سکتا ہے!

ماہرؔ! مرے شعروں کے خاکے اس طرح مرتب ہوتے ہیں
کچھ دل بھی تقاضا کرتا ہے کچھ اُن کا اشارا ہوتا ہے

اس "اُن" کا مرجع اور مشارٌالیہ —— حقیقت اور مجاز دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔

شعر کے متعلق میرا وہی نظریہ ہے جو تمام شاعروں، اہلِ نقد و نظر اور اربابِ ذوق کا ہے۔ یہ کہ شعر شاعر کے واردات، محسوسات اور مشاہدات کی ترجمانی کرتا ہے۔ جو کیفیت شاعر کے دل پر گذرتی ہے وہ شعر کے قالب میں ڈھل جاتی ہے "آپ بیتی" کے علاوہ شاعر "جگ بیتی" بھی بیان کرتا ہے اور اس کو اپنے آرٹ کی قوت سے "سحرِ حلال" بنا دیتا ہے، مثلاً فردوسی کا شاہنامہ اس کی "آپ بیتی" نہیں ہے۔ لیکن یہ شاعر کا کمالِ فن ہے جس کی بدولت شاہنامہ شعر و سخن کا معجزہ بن گیا ہے۔

شاعری کا بہت کچھ تعلق جذبات سے ہے اور جذبات بھی طرح کے ہوتے ہیں پاکیزہ بھی اور ایسے بھی جن میں ہوا وہوس کا امتزاج ہوتا ہے۔ تھوڑی بہت آوارہ مزاجی اور آوارہ خیالی سے شاید ہی کوئی شاعر محفوظ رہا ہو۔ محتاط لفظوں میں آپ اسے رنگین مزاجی کہہ لیجئے۔ اسی لئے شاعری کو نبی کے تقدس اور اعلیٰ منصب کے شایانِ شان نہیں سمجھا گیا۔ مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ کتنے اونچے درجے کے صوفی شاعر ہیں ان تک کی غزلوں میں یہ رنگ ملتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

یک دست زلفِ ساقی و یک دست جامِ مے —— رقصے چنیں میانہ میدانم آرزو است

---

[1] "چراغِ راہ" (مئی و جون ۱۹۶۰ء) میں جس شاندار تعارف کے ساتھ یہ مضمون شائع ہوا ہے، اُس "تعارف" کو اپنے رسالہ میں نقل کرنے کی ہمت نہ کر سکا! (م۔ق)

میں اپنی شاعری کے چند نمونے ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

بے حجابانہ توجہ، بے تکلف التفات
اس نے رسمِ ناز و تمکیں توڑ دی میرے لئے

وہ ستاروں کا دوپٹہ وہ لباسِ زرق برق
سر سے پا تک کہکشاں ہی کہکشاں میرے لئے

وہ اس کا تغافل کہ مجھے تم سے سروکار
میری یہ گذارش کہ مجھے بھول نہ جانا

ماہر تمہارے شعر کی تاثیر الاماں
اس شوخ کے لبوں پہ بھی ہلکی سی آہ تھی

وہ بھی تڑپ جائیں تو اس عاشقی پہ خاک
مجھ سے فقط نگاہ ملانے کی دیر ہے

میرے ان شعروں سے اگر کوئی "تصوف کے مقامات" منسوب کرتا ہے اور ان ہوس آمیز جذبات کو تقدیس کا رنگ دینا چاہتا ہے۔ تو ایسا ناقد اور میرے شعروں کا شارح حقیقتِ واقعہ کا غلط ترجمان ہے۔

میری ایک نظم کا ایک شعر ہے جس میں رنگینی کے ساتھ ساتھ فکر و جذبہ کی تقدیس بھی پائی جاتی ہے۔

عارض کی سرخیوں میں جھلکتی ہوئی حیا
لوگوں کے دیکھنے کی شکایت لئے ہوئے

ہر ادبِ ہوس کی رنگین ترجمانی ہی کا نام شاعری نہیں ہے۔ "مقصدیت" اور پیام بھی شعر کا موضوع ہے۔ مگر دنیا میں ایسے شعرا جنہوں نے انسانیت کو "پیغام" دیا ہے۔ بہت کم گذرے ہیں شاعروں کی غالب تعداد جبین و رخسار کی دھوپ اور زلف وگیسو — کی چھاؤں میں جذبات کھیلتی رہی ہے، میری شاعری کا ایک تو وہ رنگ ہے جس کی چند جھلکیاں میں ابھی ابھی پیش کر چکا ہوں اور دوسرا رنگ "مقصدیت پیام" کا رنگ ہے۔

میں ہر افق سے طلوع ہو کر جہاں میں ظاہر ہوا ہوں ماہر
کہیں مرا رنگ عاشقانہ، کہیں مرا طرز ناصحانہ

میرے ایسے چند اشعار جن میں "مقصدیت" کی ترجمانی کی گئی ہے:-

خیال و فکر کی شیشہ گری میں کچھ بھی نہیں
یقیں نہ ہو تو فقط آگہی میں کچھ بھی نہیں

سر سے آنچل ڈھلک گئے بھی تو کیا
تو مگر دامنِ نظر کو سنبھال

میری دنیا میں ہے رمِ آہو
تیری دنیا ہے صرف چشمِ غزال

نظریں بلند ہوں تو زمیں بھی ہے آسماں
سعیِ قبول ہو تو خموشی پیام ہے

قبروں پہ مسلمان خواتین کا جھرمٹ
اور اس پہ مجاور کی وہ دزدیدہ نگاہی

ہو نہ جائے بہاروں سے نفرت
احترامِ خزاں کرتے کرتے

مظلوم نہ دیں عدل و مروت کی دُہائی
شاہوں کی طبیعت پہ یہ لفظ گراں ہیں

چلی چمن سے یہ کہتی ہوئی نسیمِ سحر
کہ نا و راہ ضروری نہیں سفر کے لئے

قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے
وہ سجدہ جس کو ترے آستاں کی نسبت ہے

● — آپ نے شعر کہنا کب سے شروع کیا اور شعر کہنے کی تحریک کس سے ہوئی ؟

۲ : ۔ میں نے غالباً گیارہ بارہ سال کی عمر میں پہلا شعر موزوں کیا ۔۔۔ کیوں کیا ۔ ؟ اس کا محرک کیا تھا ؟ اس کا نہ اس وقت ہوش تھا اور نہ اب کچھ یاد آتا ہے ۔

● — کیا آپ نے شروع میں کسی سے اصلاح بھی لی ؟

۳ : ۔ میں نے شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی ! جب میں نے شاعری شروع کی تھی اس وقت ہی سے میرا یہ خیال اور نظریہ تھا کہ کسی استاد کو غزل لکھ کر بھیج دی ۔ اس نے غزل دیکھ کر واپس کر دی ۔ اس سے مبتدی شاعر کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہونچ سکتا ۔ استاد کی خدمت میں دو چار سال گذارے جائیں ۔ اس کی صحبت ، ہم نشینی اور تکلم و گفتگو کا مسلسل موقع ملتا رہے تو اس سے شاگرد کے ذہن و فکر کی تربیت ہوتی ہے اور اس کا مجھے موقع نہ مل سکا اس لئے کسی استاد کے روبرو زانوئے تلمذ تہ نہ کر سکا ۔

میری نشو و نما گاؤں میں ہوئی ہے ، میرے والد شعر کہتے تھے مگر میں ان سے اپنے کلام پر اصلاح کیا لیتا جب کہ انہیں اپنے شعر سنانے کی جرأت ہی نہ کر سکا ۔ عاشقانہ اشعار اپنے باپ کو اپنی زبان سے سناؤں اس گستاخی اور بے باکی کا میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا ۔ ۱۹۲۵ء میں علامہ اقبال کو میں نے اپنے گاؤں سے جوابی کارڈ لکھا کہ آپ کی خدمت میں اپنا کلام اصلاح کے لئے بھیجنا چاہتا ہوں اس کی اجازت مرحمت فرمائی جائے ۔ علامہ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ شاعری کے لئے کسی تلمذ کی ضرورت نہیں ہے ہاں زبان کی درستی کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے تو آپ[1] خود یوپی کے رہنے والے ہیں ۔ ! علامہ اقبال کا یہ خط میں نے بائیس سال تک سنبھال کر رکھا مگر ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں ضائع ہو گیا ۔

جب تلمیذ و تلمذ کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی عرض کر دوں کہ راقم الحروف نے دس بیس نہیں سینکڑوں اصحاب کے کلام پر اصلاح دی ہے مگر میں نے کسی کو نہ اپنا شاگرد کہا اور نہ شاگرد سمجھا میری حیثیت استاد کی نہیں "مشیر" کی رہی ہے اور مشورہ کو قبول ہی نہیں رد بھی کیا جا سکتا ہے مشہور شاعروں میں نظر حیدرآبادی مرحوم ان میں شامل ہیں جنہوں نے مجھ سے مشورہ سخن کیا ہے ۔ ۔ کم مشہور شعراء میں کھنڈوہ کے شوق ہیں جو اپنے نام کے ساتھ ماہری لکھتے ہیں ان کا یہ شعر کتنا اثر انگیز ہے ؎

وہ کیا کیا کر گئے دشوار منزل — ہمارے ساتھ دو اک گام چل کے

ہم شما کا تو کیا ذکر ہے ۔ رئیس المتغزلین جگر مرادآبادی نے یہ شعر سنا تو تڑپ کر رہ گئے ۔

● — اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں آپ کن شخصیات و نظریات سے متاثر رہے ؟

۴ : ۔ میں بدو شعور ہی سے دینی معتقدات اور اخلاقی نظریوں سے متاثر رہا ہوں میرا پہلا مضمون جسے قابل ذکر کہا جا سکتا ہے ۔ اس کا عنوان تھا ۔۔۔ صاحب القرآن فی القرآن ۔۔۔ دہلی کے مشہور رسالہ "پیشوا" کے رسول نمبر میں شائع ہوا تھا یہ اب سے ۴۵ سال پہلے کی بات ہے مجھ پر شروع ہی سے غالب ، حالی ، شبلی ، اکبر ، اقبال کے افکار اور شاعری کا بہت زیادہ اثر رہا ہے ۔ خاص طور پہ شبلی نعمانی میرے سب سے بڑے معنوی استاد ہیں ۔

حضرت شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کی محبت اور عقیدت اور ان کی شخصیت کا تاثر تو یوں کہیئے میری گھٹی میں پڑا ہے ۔ والد مرحوم نے دس سال کی عمر میں گلستاں مجھے سبقاً سبقاً پڑھائی تھی ۔ یہ فیض آج تک جاری ہے ۔ ۱۹۳۲ء کے بعد سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں سے میں متاثر ہوا ہوں اور دینی افکار کے علاوہ ان کی انشا پردازی کا دل و جان سے معترف اور مداح ہوں ۔

---

[1] یہ جملہ پوری طرح ذہن میں محفوظ نہیں رہا یا غالباً یوں لکھا تھا کہ زبان کی درستی کے لئے اسی طرح میں آپ کو بتانے والے مل جائیں گے ۔

● ــــــ اب تک آپ کے متعدد شعری مجموعے چھپ چکے ہیں آپ کی اپنی نظر میں سب سے اچھا مجموعہ کون سا ہے ؟

۵ :۔ اس کا فیصلہ کرنا میرے لئے بہت دشوار ہے غالباً میرے مجموعہ کلام "فردوس" میں نسبتاً زیادہ پختگی اور بلوغ فکر پایا جاتا ہے ــــــ

● ــــــ ایک اچھے شعر، یا ایک اچھی نظم کے لئے آپ کیا خصوصیات مقرر کرتے ہیں ؟

۶ :۔ میرے خیال میں اچھی نظم اور اچھا شعر وہ ہے جس میں تخئیل کی نزاکت، رعنائی اور جدت کے ساتھ اس کا اظہار بھی موزوں انداز میں ہوا ہو۔ میں اس معاملے میں شبلی نعمانی کا مقلد اور ہم نوا ہوں جو تخیل پر اسلوب بیان اور پیرایہ و اظہار و بیان اور آہنگ الفاظ کو ترجیح دیتے ہیں۔

علامہ شبلی کی مشہور نظم ہے جس کی بنیاد پر شہرہ آفاق فلم "پکار" تیار ہوئی تھی۔ اس میں شبلی اس خیال کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ جہانگیر کے عہد حکومت میں نور جہاں کا بہت کچھ عمل دخل تھا اس خیال کو انہوں نے کس اچھوتے انداز میں ادا کیا ہے۔

اس کی پیشانئ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن

میں شاعری میں اسی پیرایہ، انداز بیان اور تخیل کا شیدائی ہوں۔

اپنی پسند کے چند اشعار مختلف شعرا کے یہاں نقل کرتا ہوں تاکہ پڑھنے والوں کو میرے ذوقِ شاعرانہ کا اندازہ ہو سکے۔

اے تماشاگاہِ عالم روئے تو ۔۔۔ تو کجا بہر تماشا می روی
ہر غنچہ کہ گل گشت دگر غنچہ نہ گردد ۔۔۔ قربان لب یار کہ غنچہ کہ گل
اے ہم لغانِ محفلِ ما ۔۔۔ رفتید ولے نہ از دلِ ما
پڑے ہیں صورتِ نقشِ قدم نہ چھیڑ ہمیں ۔۔۔ ہم اور خاک میں مل جائیں گے اٹھانے سے
گرتے گرتے ان کا دامن تھام لے ۔۔۔ گرنے والے لغزشوں سے کام لے
ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں ۔۔۔ مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے ۔۔۔ تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی
جوشِ جنوں کے ہاتھ سے فصلِ بہار میں ۔۔۔ گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط
دونوں جہان آئینہ دکھلا کے رہ گئے ۔۔۔ لانا پڑا تمہیں کو تمہاری مثال میں
جب سے کھو یا گیا ہے دل اپنا ۔۔۔ چیز رکھتا ہوں بھول جاتا ہوں
یہ کہہ کے چھیڑتے ہیں جوانانِ میکدہ ۔۔۔ مائل ! تمہیں سلام کیا ہے بہانے
سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے ۔۔۔ کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

ایک تو نیناں مدھ بھرے دوجے انجن سار
ارے ہادرے دیت ہیں ! متوارے ہتھیار

مسکراہٹ لبوں پہ مچلتی ہوئی　　　جیسے اک برق کی رو اُدھر سے ادھر
دلبری کے ہنر دلربائی کے فن　　　ایسی باتوں سے بیگانہ و بے خبر
عصمت پاک بازی سے روشن جبیں　　　حسن غیرت سے رخسار تابندہ تر
سر جھکائے ہوئے وہ گذرتی گئی　　　• زخم جس کے لئے ہر ہوس کی نظر

کوئی شک نہیں میرے دوسرے دور کی شاعری میں "فکرونظر" کا زاویہ ایک حد تک ضرور بدلا ہے مگر جن اجزاء سے شعر ترکیب نا ہے ان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ وہ تو اور بھی نکھر گئے ہیں ۔

حال ہی میں ایک غزل میں نے کہی ہے جس کا ایک شعر ہے ۔

تذکرہ جب وفا کا ہوتا ہے　　　میں تمہاری مثال دیتا ہوں

جو حضرات شعر کا صحیح ذوق رکھتے ہیں اور غزل کے مزاج کو پہچانتے ہیں ۔ وہی میرے اس شعر کی کیفیت کو محسوس کر سکتے ہیں ۔ میں خود پنی زبان سے کیا کہوں ۔

● —— آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کے لئے آپ کو غزل کا پیرایہ زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے یا نظم کا ؟

۱۰ ۔ غزل ہو یا نظم ! میں دونوں اصناف سخن میں کسی دشواری کے بغیر شعر کہتا ہوں اصل چیز شعر کے کہنے والے کی مشاقی پختگی اور قادر الکلامی ہے ۔ ہاں ! میری طبیعت کا رجحان " تغزل " کی جانب زیادہ ہے ۔ میری رائے میں تو جو نظم تغزل سے عاری ہو ۔ وہ پرشکوہ ہو سکتی ہے مگر دلکش اور اثر انگیز نہیں ہو سکتی ۔

● —— کیا آپ اردو شاعری کی موجودہ رفتار ترقی اور اس کے رجحانات سے مطمئن ہیں ؟

۱۱ ۔ موجودہ اردو شاعری جس پر نام نہاد " ترقی پسندی " کا سایہ پڑا ہے اس نے لوگوں کے مزاج کو بگاڑ دیا ہے ، شعر و ادب کی اس تباہی پر ما جاتا ہے میرا دل شدید کرب محسوس کرتا ہے ۔ نئی نسل کی شاعری لطافت ، توازن خیال و اظہار ، لطفِ بیان اور صحت و زبان سے عاری ہوتی چلی ارہی ہے ۔ ابہام ، اشاریت اور رمزیت کی وہ شدت کہ " اہمال " کی رو چل پڑی ہے ! مہمل گووں اور غلط نگاروں کی شہرت کے پل بٹے پڑ رہے ہیں ۔ توبہ !

● —— ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری میں جو تجربے کئے ہیں آپ کی نظر میں اُردو شاعری کی روایت میں ان کی حیثیت کیا ہے ؟

۱۲ ۔ ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری میں جو تجربے کئے ہیں وہ شاعری کے ساتھ مذاق ہیں ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کا " آہنگ " جدان کو چونکا دینے والا ہے ۔ اس نئے آہنگ کو جہاں موزوں الفاظ مل جاتے ہیں وہاں " سحر حلال " بن جاتا ہے ۔ نہیں ملتے تو " بے سُرا " لے بن کر رہ جاتا ہے ۔ عام طور پر یہ " جدید آہنگ " پھٹے ہوئے بانس سے نکلی ہوئی آواز کا مزاج رکھتا ہے ۔

● —— مشاعروں کی افادیت کیا ہے ؟ کیا ان کی حیثیت وہی ہے جو ہماری دیگر ثقافتی سرگرمیوں کی ہے ؟

۱۳ ۔ اردو زبان کی ترویج کے لئے مشاعرے بڑی اہمیت اور افادیت رکھتے ہیں ۔ ہماری ادبی ثقافت کا یہ جزو لاینفک ہیں ۔ س دور کی مضمون کا یہ نعم البدل بلکہ یوں کہئے " خیر البدل " ہیں ۔ مشاعروں میں اچھے شعر سن کر ذہن و فکر پر فنی اعتبار سے بھی نئی راہیں کھلتی ہیں شعر کہنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے ۔

● ——— کچھ عرصہ پہلے "اسلامی ادب" کی تحریک بڑے زور شور سے چلی تھی۔ اب یہ تحریک بعض کے نزدیک جمود کا شکار ہے اور بعض کے نزدیک اس سے بھی آگے ——— تنزل کی طرف جا رہی ہے آپ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اگر آپ اس کے جمود یا تنزل کے قائل ہیں تو کیا آپ اس کے احیاء کے لئے کچھ تدابیر بتا سکیں گے ——— ؟

۱۴:۔ شعر و ادب میں جہاں بھی اخلاق و نیکی کی جھلک ملتی ہے وہ اسلامی ادب نہیں تو اور کیا ہے۔ "خیر و حکمت" تو مسلمان ہی کی متاع ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ پاکستان میں اسلامی ادب کے فروغ کے لئے جو تنظیم قائم ہوئی تھی وہ باقی نہیں رہی مگر اس کے اثرات باقی ہیں اس تنظیمی جمود کو توڑنے اور حرکت پیدا کرنے کے لئے اسلام پسند ادیب اور شاعر کمر ہمت باندھیں تو یہ کارواں پھر جادہ پیما ہو سکتا ہے۔

آپ کے سوالات کے جوابات دینے میں زیادہ تفصیل سے کام لیتا تو پوری کتاب تیار ہو سکتی تھی۔ مگر اس کے لئے میرے پاس وقت اور فرصت نہیں ہے جو کچھ عرض کر دیا ہے اس کو ان حالات میں غنیمت سمجھئے کہیں بات پوری طرح کھل نہ ہو تو اس کا سبب میری کوتاہی قلم ہے۔

؎ لختے ز حال خویش بہ کاغذ نوشتہ ام

ماہر القادری ۱۷ رمئی ۱۹۶۵ء

"دُرِ یتیم"

ماہر القادری کی سب سے زیادہ کامیاب تصنیف ———
نبی آخر محسنِ انسانیت کی سیرتِ طیبہ ناول کے انداز میں۔
قیمت :۔ ۵ روپے (علاوہ محصول)

توحید نمبر "فاران"

شائقین کے بیحد اصرار پر تیسری بار شائع ہوا ہے اور جواب ختم ہونے والا ہے۔
قیمت :۔ فی کاپی چار روپے، ۵ پیسے (علاوہ محصول)

ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱
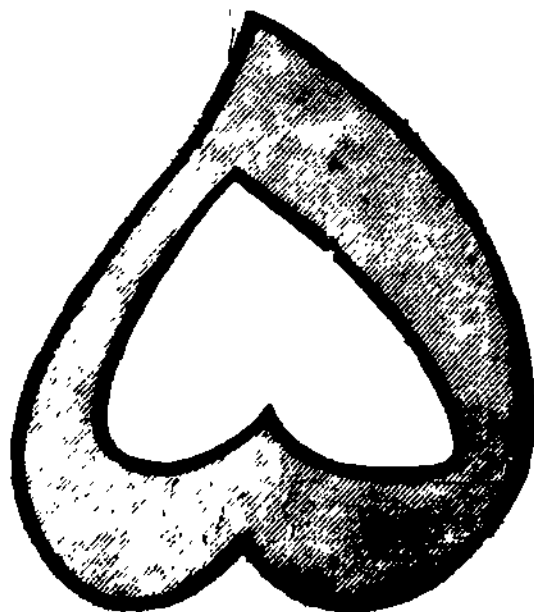
۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انلجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
Spotlit

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

پی، آئی، اے کا خونیں حادثہ

آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں

مئی ۶۵ء کو قاہرہ کے ہوائی اڈے سے چند میل کے فاصلہ پر پاکستان انٹرنیشنل ایرلائن (P.I.A) کے ہوائی جہاز کو جو المناک خونیں حادثہ پیش آیا اور اُس میں جتنی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں، ان پر خون کے آنسو رو کر بھی تعزیت کا تھوڑا سا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس روح فرسا خبر نے پورے پاکستان کو ماتم کدہ بنا دیا تھا، ملک گیر المیہ کئی دن تک افق پر رنج والم کی دھند چھائی رہی! پائیلٹ سے لے کر ایر ہوسٹیس تک پی، آئی، اے کا بہترین تجربہ کار اسٹاف اس خاص فلائٹ اور نئے خطِ پرواز کے لئے منتخب کیا گیا تھا، اس جہاز میں بعض ایسے صحافی بھی تھے جن کا بیرونِ ملک کے لئے یہ پہلا سفر تھا، کس چاؤ اور ارمانوں کے ساتھ انہوں نے کراچی سے پرواز کی تھی، سیر و سیاحت کی کیسی کیسی امنگیں اُن کے دلوں میں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ قاہرہ کے شاندار ہوٹلوں میں ان کے لئے کمرے پہلے سے محفوظ کرا دئے گئے تھے۔ مگر اس پرواز پر کارکنانِ قضا و قدر نے "آخری سفر" کی مہر لگا دی تھی، یہ لوگ قاہرہ کے راستے دراصل ملکِ عدم کی طرف جا رہے تھے یہ اُن کا سفرِ آخرت تھا!

پی، آئی، اے کا شاندار، برق رفتار اور آرام دہ طیارہ ہواؤں سے اٹھکھیلیاں کرتا ہوا قاہرہ ایرپورٹ پر چند منٹ میں اترنے والا تھا، مسافر قاہرہ کے جگمگاتے ہوئے برقی قمقمے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کہ اتنے میں شدید دھماکہ ہوا اور جہاز میں آگ لگ گئی! اب پھر آگ، لہو، چیخیں۔ ہڈیاں چٹخنے کی آوازیں، جلے ہوئے چہرے، جھلسے ہوئے بدن، موت کے فرشتے کو خدا معلوم کتنی بہت سی روحیں بہ یک وقت قبض کرنی پڑیں! ہوائی جہاز کے دھماکے نے نہ جانے کس مسافر کے جسم اور ہڈی پسلیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا اور آگ کے خوفناک شعلوں میں کس کی جان کس طرح نکلی، یا اللہ تیری پناہ! اور تیری شانِ بے نیازی کو سجدے! اے حیات و موت کے مالک، تیرے نام کی تکبیر! بے شک ہر جاندار کی چوٹی تیرے دستِ قدرت میں ہے! جس کے لئے جو وقت اور جس طرح کی بھی موت لکھ دی گئی ہے اُس سے بال برابر تجاوز نہیں ہو سکتا

کیا بھروسا ہے زندگانی کا

آدمی بلبلہ ہے پانی کا ہے

مگر یہ بلبلہ "کتنا سرکش اور خود نگر واقع ہوا ہے، موت کو بھولا ہوا، آخرت سے غافل سر سے پاؤں تک اور دل سے نگاہ تک دنیا کے مکروہات میں غرق و مدہوش!۔

جن خبر رساں ایجنسیوں نے اس المناک حادثہ کی اطلاع دی تھی وہی اس المیہ بلکہ "خونخوار المیہ" کے بھی ذمہ دار ہیں کہ ایک طرف

مائی جہاز کے شعلوں میں لوگ جل رہے تھے، کچھ سسک رہے تھے اور دم توڑ رہے تھے اور لوگوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں کہ اتنے میں مصر کے باشندوں کی ایک ٹولی نے وہاں آکر لوٹ مار شروع کر دی! یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کی سنگدلی، خونخواری، کمینگی اور دناءت کے آگے شیطان بھی کان پکڑتا ہے!

مجھے ۲۰ مئی کو دن کے گیارہ بجے میرے ایک عزیز نے ٹیلی فون کے ذریعہ اس حادثہ کی اطلاع دی، خبر سنتے ہی میں نے گھبرا کر کہا خالد تو ان دنوں چین کی فلائٹ پر مامور ہے جواب ملا "ہاں! میرا بھی یہی خیال ہے"! تین بجے کے قریب دل میں کھٹک سی پیدا ہوئی میں نے پی. آئی. اے کے مرکزی دفتر سے دریافت کیا کہ اس ہوائی جہاز پر نیویگیٹر کون تھا! قدرے توقف کے بعد جواب میں کہا گیا — "لودی" اس نام کو سن کر دھچکا لگا۔ میں سوچ میں پڑ گیا، دل ہی دل میں کہا ایک محکمہ میں "لودی" نام کے ایک سے زاید آدمی بھی ہو سکتے ہیں، اس تاویل میں زیادہ دیر تک مطمئن اور قانع نہیں رہ سکا، تیزی کے ساتھ ٹیلی فون کا ڈائل گھمایا، گھنٹی بجنے لگی، اُدھر سے ایک خاتون نے "P. I. A" پوری طرح کہا بھی نہ تھا کہ میں جلدی سے بول پڑا، نیوی گیٹر کا پورا نام بتائیے، آپ کے یہاں خالد ضیا لودی بھی تو ہیں، خاتون نے قدرے توقف کے بعد غمگین لہجہ میں کہا، جی ہاں! کے، زیڈ لودی ہی اس فلائٹ پر گئے تھے! میں نے بیوی کو یہ غمناک خبر سنائی ان کے حقیقی بھانجے کے حادثہ کی خبر تھی، وہ برسوں سے بیمار بلکہ صاحب فراش ہیں، اس خبر کو سن کر ان کے چہرے کا رنگ سفید ہو گیا جیسے کسی نے ناگہاں ان کے بدن سے لہو کھینچ لیا! خبر انتہائی وحشت ناک اور جاں گداز تھی مگر ابھی آس باقی تھی۔ ہوائی حادثہ میں لوگ بچ بھی تو جاتے ہیں؟ بیوی وضو کر کے دعا کے لئے سجدے میں گر پڑیں! میں تیزی کے ساتھ اپنے فلیٹ سے —— اتر کر نیچے گلی میں آیا، سواری کی اور اپنے ہم زلف کے یہاں پہونچا ان کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا، خالد مرحوم کی ماں کا برا حال تھا، ان کی دلدوز چیخیں سن کر دل ہلے جاتے تھے وہ جو ایک کمزور سی آس لگی ہوئی تھی، تھوڑی دیر بعد وہ بھی تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹ گئی، یعنی اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ وہ جو چار پانچ آدمی زندہ بچے ہیں ان میں خالد ضیا لودی نہیں ہیں۔

خالد وجیہہ و تندرست خوبرو نوجوان، عمر ۲۸ سال سے بھی کچھ مہینے کم تھی، ماں باپ کا فرمانبردار بیٹا، پی، آئی، اے کا آزمودہ کار نیویگیٹر، ماہانہ تنخواہ الاؤنس کے ساتھ تین ہزار سے بھی زیادہ تھی، نیا بنگلہ، نئی موٹر، بیاہ رچائے ہوئے گیارہ مہینے ہوئے تھے! گھر پہ یہ یکایک غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، راحت و آسودگی کی وہ بچی بچھائی بساط ہی الٹ گئی، گھرانے کا روشن مستقبل ہی دھندلا گیا، نوجوان بیوی کا سہاگ لٹ گیا، بھائیوں کا قوت بازو جاتا رہا اور ماں باپ کے جگر کا ٹکڑا آگ کے شعلوں کی نذر ہو گیا، نہ میت کا آخری دیدار ہوا نہ جنازہ اٹھا نہ قبر بنی!

جاننے اور ملنے والوں میں حضرت مولانا امین احسن اصلاحی کے بڑے صاحبزادے ابو صالح اصلاحی بھی اس حادثہ کا شکار ہوئے وہ کئی سال روزنامہ کوہستان کی ادارت سے وابستہ رہے اور اپنی صحافتی قابلیت کے نقش قائم کر دئے۔ تقریباً تین سال سے روزنامہ "مشرق" کے مدیر اعلیٰ تھے، پریس ٹرسٹ سے تعلق کے سبب اُن کی صحافتی حیثیت تو آزاد نہ رہی تھی مگر تنخواہ ڈیڑھ ہزار سے کچھ زیادہ ہی ہوگی، موٹر نشین تھے، بنگلہ میں رہتے تھے، گھریلو زندگی بہت زیادہ خوش گوار تھی مجھ سے آخری ملاقات پنڈی میں ہوئی تھی، پشاور تک ہوائی جہاز میں ساتھ رہا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی شریک سفر تھے یہ اب سے تقریباً چار سال پہلے کی بات ہے، مولانا امین احسن اصلاحی نے اس کوہ الم کو مومنانہ شان

جون کے "فاران" میں جو اداریہ (نقش اول) شائع ہوا ہے وہ اس حادثہ سے قبل لکھا جا چکا تھا، مولانا موصوف کی خدمت میں راقم الحروف نے تعزیت نامہ بھیجا تھا اسنا ہے مولانا مودودی نے مولانا اصلاحی صاحب کے گھر سے پر جا کر تعزیت کی تھی۔

استقامت کیساتھ برداشت کیا مولانا موصوف پر مرحوم بیٹے کی یتیم اولاد کی ذمہ داری آن پڑی ہے ، اللہ تعالیٰ اُن کی رفاقت فرمائے (آمین)

حلقۂ ادب اسلامی جب کراچی میں قائم تھا ، تو سبط فاروق فریدی اُس میں شریک ہوا کرتے تھے ، اُن کا تعلق انگریزی صحافت اُردو میں اُن کے مقالے بڑے جاندار ہوتے ! مذاکرہ میں کوئی ان پر سخت سے سخت لفظوں میں تنقید کرتا ، تو بھی برا نہ مانتے ، اُن کا دین سنجیدگی کے ساتھ دین کی اسپرٹ نمایاں طور پر محسوس ہوتی تھی ۔

سبط فاروق مرحوم کا روزنامہ "ڈان" سے برسوں تعلق رہا اس کے بعد وہ مارننگ نیوز سے متعلق ہو گئے اور اپنی صحافتی قابلیت ملت نیوز ایڈیٹر بن گئے ! ان کے چھوٹے بھائی کا ایک حادثہ میں دو سال پہلے انتقال ہوا تھا ، اُن کے چھ بچوں کے وہ کفیل اور سر ، تھے ، سبط فاروق مرحوم نے بھی چھ بچے چھوڑے ہیں ، اتنا بڑا کنبہ اور مہنگائی کی کشکری تنگ کا بہ ظاہر سہارا اور بندوبست نہیں ! مگر تعالیٰ کی شان رزاقی کا اعجاز ایسے ہی نازک موقعوں پر ظاہر ہوتا ہے ، واللہ خیر الرازقین !

پروفیسر خورشید احمد کے چھوٹے بھائی ممتاز طارق بہت سے بہت تیس سال کے ہوں گے ، نہایت ذہین ، بار سوخ اور سمجھ بوجھ والے ! دس گیارہ سال سے انگریزی صحافت سے منسلک تھے ، اپنی ذہانت اور حسن تدبیر کی بدولت کویتی سفارت خانہ کے پریس ہو گئے ، دو تین سال سے ان کے معاشی حالات میں بڑی آسودگی پیدا ہو گئی تھی اور مستقبل اور دنیا وہ روشن امکانات سے تابناک ہو آتا تھا ، مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا دانہ پانی اُٹھ چکا تھا ، دودھ پیتا بچہ ، جوان بیوہ اور سوگوار بھائیوں کو چھوڑ کر وہاں چلے گئے سے پھر کوئی اس دنیا میں لوٹ کر نہیں آتا ۔

معجز منصوری روزنامہ "حریت" کے "قطعہ نگار شاعر" اور اس کے حلقۂ ادارت سے وابستہ تھے بعض مشاعروں میں اُن کی زبان سے نظمیں بھی ، راقم الحروف سے جب بھی کسی مشاعرے یا دعوت میں ملاقات ہوتی نیاز مندانہ انداز میں ملتے ، ان کی شاعری میں جمہوریت اور دین واخلاق کی پائی جاتی تھی آمریت اور مطلق العنانی پر انہوں نے بڑی بڑی چوٹیں کی ہیں ۔ ان کی شاعری اور شخصیت کی طرف کا اب وقت آیا تھا کہ قاہرہ کا ہوائی ، اُن کی زندگی کا آخری سفر ثابت ہوا ۔

پی آئی اے کا ہوائی جہاز کسی ٹیلہ سے ٹکرا گیا ؟ انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ؟ مشین کے کسی کل پرزے پر کام کرنے والوں کا غلط ہاتھ ؟ یا کسی سازش کا اس کی تباہی میں ہاتھ تھا ؟ ——— بس اب عقل تیر تکے ہی لڑاتے رہے ، جو ہونا تھا وہ ہو چکا ،

بہار آئی ہے اور آتی رہے گی
مگر وہ پھول جو مرجھا گئے ہیں

اس حادثہ کے بعد سے دل کا یہ عالم ہے کہ ہوائی جہاز کی آواز سن کر طبیعت کو عجیب سی وحشت ہونے لگتی ہے گو وقت کی رفتار کے یہ تاثر دھیما پڑتا جا رہا ہے ! آدمی حادثوں اور سانحوں ہی کے فکر و غم میں ڈوب کر رہ جائے تو دنیا کے کاروبار چوپٹ ہو جائیں ، جہاں سے ہیں ملتی ہیں وہیں سے مرہم بھی تو ملتا ہے ۔

ہم موت اور اس کے تصور سے کتنا ہی گریز کریں مگر موت ایک نہ ایک دن آ کر ہی رہے گی ! یہ دن تو ہر کسی کو دیکھنا ہے ! اللہ تعالیٰ اس میں جاں بحق ہونے والوں کی مغفرت بخش فرمائے ۔ (آمین)

مسلم متوفین کو جن میں قادیانی بھی شامل ہیں ۔ اہل ایمان "مرحوم" "جنت آنجہانی" لکھتے ہیں ! اور مغفرت کی دعا مسلمان ہی کیلئے کی جاتی ہے ۔

محمد منصور علی

انسان کے سامنے عہد قدیم میں سب سے بڑا لمحۂ فکر جو تھا وہ یہ کہ اس کائنات کے وجود کا مقصد کیا ہے ؟ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے ؟ خود
ن کیا ہے اور اس کا خالق کون ہے ؟ اور زندگی کے بعد صرف موت ہے یا موت کے آگے بھی کچھ ہے ؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ کام یونانی
راور فلسفیوں نے کیا اس کے بعد ہندوں کے مفکرین نے بھی دوسرے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کو اہمیت دی ۔

دو فلسفوں کی بنیاد پڑ چکی تھی جو دونوں ایک دوسرے سے مختلف تھے ۔

(۱) پہلا فلسفہ یونانی فلسفہ یا (GREEK MYTHOLOGY) کے نام سے موسوم ہے۔ فنی اعتبار سے (THEORY OF ABIOGENESIS)
ہتے ہیں۔ نظریہ یہ تھا کہ دنیا کی تمام تر اشیاء ایک دوسری سے بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور اس طرح کوئی وجود تباہ نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسری شکل اختیار کر لیتا ہے
آدمی پتھر بن سکتا ہے ۔ پتھر کیڑے مکوڑوں کا روپ دھار سکتے ہیں ، جانور درخت بن سکتے ہیں اور درخت انسان بن سکتے ہیں ۔ اس طرح زندگی ایک دائرہ
گھومتی ہے ۔ ذیل کا نقشہ ان تبدیلیوں کی واضح تصویر پیش کرسکتا ہے ۔
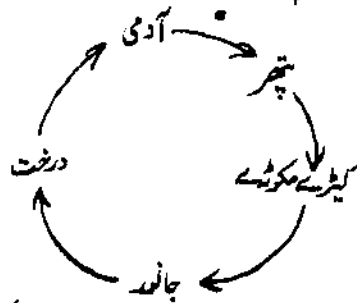
(۲) دوسرا فلسفہ ہندو فلسفہ یا (HINDU MYTHOLOGY) کہلاتا ہے ۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کا صرف جسم فانی ہے روح لافانی ہے
کے علاوہ روح ایک جسم سے دوسرے جسم میں داخل ہو سکتی ہے ۔ یعنی اگر کوئی آدمی مر جاتا ہے تو اس کی روح کسی جانور کے جسم میں داخل ہو کر زندہ رہ سکتی ہے ۔ اسی
ح ایک جانور کی روح کسی آدمی کے مردہ جسم کو اپنی پناہ گاہ بنا سکتی ہے ۔

یہ دونوں فلسفے درحقیقت صرف خیالی پلاؤ کے سوا کچھ نہیں ، واقعہ یہ ہے کہ انسان اس وقت سائنس سے ناواقف تھا اور اس منزل پر اس کی تربیت
ب اتنی ہی تھی کہ اس سے آگے وہ کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتا تھا ۔ سائنس سے روشناس ہو جانے کے بعد سب سے پہلے ۳۸۴-۳۲۲ ق م میں یونانی فلسفی
طو نے اپنا نظریہ لاحیات پیش کیا اس میں اس نے بتایا کہ دنیا کے تمام جاندار مثلاً درخت ، مکھیاں ، جھینگے ، بچھو ، کھٹمل ، گھونگے وغیرہ خود تخلیق

شدہ ہیں انسان کے لئے والدین کا ہونا ضروری نہیں ۔ اس امر کے لئے اس نے تجربات سے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی ۔ مثلاً اس نے بتایا کہ اگر سبزیوں کی یخنی بنا کر انہیں ڈھک کر رکھ دیا جائے تو اس میں چھوٹے چھوٹے جاندار خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں ۔ اسی طرح بعض گندی جگہوں پر مثلاً گھوڑے کی لید پر کیڑوں کا نمودار ہو جانا اس دعویٰ کی دلیل ہے کہ یہ خود بخود پیدا ہو گئے ۔ لیکن تنقید پسند سائنس دانوں کے مسلسل تجربات نے اس نظریہ کو بہت جلد رد کر دیا وہ یہ کہ انہوں نے پکی ہوئی یخنی کو ڈھکنے سے قبل اندر کی ہوا کو گرم کر کے ہوائی جراثیم ختم کر دئے اس کے بعد دیکھا گیا کہ تخلیق عمل میں نہیں آئی اس کے بعد بھی نظریہ لاحیات پر تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا ۔ ایڈی (۱۶۹۶ - ۱۶۲۶) ۔ اسپلنزنی (۱۷۹۹ - ۱۷۲۹) اور لوئی پاسچر نے (۱۸۹۵ - ۱۸۲۲) اس پر مسلسل تجربات کئے اور سب کے نچوڑ میں متفقہ طور پر یہ ثابت کر دیا گیا کہ ہر جاندار کے لئے والدین کا ہونا ضروری ہے یا یہ کہ کسی جاندار میں خود تخلیق ہونے کی صلاحیتیں نہیں ہوتیں بلکہ شمع حیات کسی دوسری شمع سے ہی روشن کی جا سکتی ہے

یہاں آکر چارلس ڈارون کے ان نظریوں نے بھی دم توڑ دیا جو اس نے انسان کی تخلیق کے متعلق بنائے تھے جس میں اس نے انسانی تخلیق کو چند مادی عناصر کی کیمیائی ترکیب کا نتیجہ بتایا تھا ۔ لیکن اس نظریہ کو جاننے کے بعد سائنس دانوں کے لئے ایک نیا سوال ابھر آیا وہ یہ کہ آخر وہ پہلی اور آخری شمع کون سی ہے جس نے تمام کائنات کو جلا بخشی ۔ تصوراتی اعتبار سے یقیناً وہ خدا تھا لیکن سائنس کی تحقیق اس وجہ کو جاننے کے لئے بے چین تھی اب بھی بے چین ہے اور نہ جانے کب تک رہے گی ۔

تحقیق کے اس نئے میدان میں صرف سائنس دانوں نے ہی نہیں بلکہ فلسفیوں حتیٰ کہ علماء کرام نے بھی بہت کاوشیں کیں اور حتی الامکان سائنس اور فلسفہ کے ذریعہ خدا کو ثابت کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن انسان کی ذہنی پیچیدگی اس قدر تھی کہ اگر ایک ذہن کوئی دلیل تلاش کرتا ہے تو دوسرا اسے رد کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے ۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی کے متعلق ایک مشہور روایت ہے کہ انہوں نے اپنی تمام زندگی وجود باری تعالیٰ کے لئے دلائل تلاش کرنے میں وقف کر دی لیکن اس کے بعد بھی انہوں نے بہت سی دلیلیں ایسی بنا لیں جنہیں انسانی ذہن رد نہ کر سکا ۔ راوی کہتا ہے کہ جس وقت وہ بستر مرگ پر تھے شیطان ایک انسان کی شکل میں ان کے پاس آیا اور دریافت کیا کہ امام صاحب کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس وقت آپ جس زندگی سے ہمکنار ہو رہے ہیں اس میں رہ کر آپ نے دین کے لئے کیا کیا ۔ امام صاحب نے جواب میں خداوند تعالیٰ کے وجود کو ثابت کرنے والی ان دلیلوں کا تذکرہ کیا ۔ جب آپ ایک دلیل پیش کرتے شیطان اسے فوراً رد کر دیتا یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا حتیٰ کہ شیطان نے آپ کی تمام دلیلیں رد کر دیں ۔ اپنی زندگی بھر کی کمائی کو یوں برباد ہوتے دیکھ کر امام صاحب کے جسم پر پسینہ اور آنکھوں میں آنسو آگئے ، لیکن اسی وقت آپ کے کانوں میں ایک غیب کی آواز آئی جس کو سن کر آپ مسکرا اٹھے اور صرف اتنا کہا کہ " میں نے خدا کو بے دلیل مانا ہے "

یہ واقعہ صرف روحانیت سے تعلق رکھتا ہے اور سائنس دانوں کی نظر میں ایک مذاق سے زیادہ نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام فخر الدین رازی کی آخری دلیل کو تاریخ میں جو مستقل حیثیت حاصل ہے وہ سائنس کے کسی نظریہ کو حاصل نہیں ۔

سائنس ـــــ یعنی وہ علم جس کی بدولت ہم نے آس پاس کی چیزوں کا مطالعہ کر کے انہیں فلاحی کاموں کا ذریعہ بنایا ، وہ علم جس نے کائنات کے سربستہ رازوں پر سے پردہ اٹھایا ۔ وہ علم جس نے ایٹم کی بیش بہا طاقتوں کا راز فاش کیا جس کی بدولت انسان لاتعداد کارآمد اور بے شمار خطرناک ایجادات کا مالک بن بیٹھا ۔ وہ علم جس کی بدولت انسان کائنات کی تسخیر کر کے ، خلا کی سیر کر کے فضا میں بھی اپنی حکمرانی قائم کر چکا ہے اور وہ علم جس کی مدد سے ـــــ آج انسان خالق کائنات کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے آخر اس علم کی اپنی کیا حقیقت ہے اور یہ حقیقت کی تلاش میں کس حد تک کامیاب ہے ۔

سائنس دراصل اس علم کا نام ہے جس کے نظریات تجرباتی نتائج کی بنیاد پر رکھے جاتے ہیں۔ یعنی پہلے تجربات کئے جاتے ہیں اور مسلسل
ات سے جو یکساں نتائج ظاہر ہوتے ہیں انہیں کو ایک نظریہ کی شکل دے دی جاتی ہے مثال کے طور پر سائنسدانوں نے علم توالد و تناسل میں نظریہ
کیا ہے کہ اگر شادی کے وقت لڑکے اور لڑکی کی عمر ۲ سال سے کم ہو گی تو پہلا بچہ لڑکا ہو گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلا بچہ ہر صورت میں لڑکا ہی ہوگا
چونکہ مسلسل مشاہدہ میں یہ بات آچکی ہے کہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے لہٰذا اسے ایک نظریہ کی شکل دے دی گئی ہے جو کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا اور کی
ت بھی رد کیا جا سکتا ہے معلوم یہ ہوا کہ سائنس کے تمام تر نظریات مشاہدوں کے محتاج ہوتے ہیں اگر کوئی چیز ہمارے مشاہدے میں نہیں تو ہم ہرگز اس
تعلق کوئی نظریہ نہیں قائم کر سکتے۔ مشاہدات دو طریقوں سے ممکن ہیں۔

(۱) DEDUCTIVE METHOD :- اس طریقہ میں پہلے سے کوئی چیز مان لی جاتی ہے اور اس کے بعد تحقیق کا کام شروع ہوتا ہے
ل کے طور پر یہ کہا جائے کہ ہر پولیس مین کے سر پر سرخ ٹوپی ہوتی ہے۔ یعنی پہلی چیز پولیس مین کا وجود ہوتا ہے اس کے بعد اگر اس کے سر پر
، ٹوپی ہے تو ہم اسے پولیس مین کہیں گے۔ برخلاف اس کے اگر ہر شخص لال ٹوپی لگالے تو سب کو پولیس مین صرف لال ٹوپی کی بناء پر نہیں کہا جا
تا۔ اس طریقہ میں غلطی کا امکان بالکل نہیں ہوتا کیونکہ اصل چیز بلا کسی تحقیق کے پہلے ہی فرض کر لی جاتی ہے۔

(۲) INDUCTIVE METHOD :- اس میں مشاہدات کے بعد کسی چیز کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل سائنسی طریقہ ہے جس کی تحقیق صرف
ہداتی وسائل یعنی احساس خمسہ تک محدود ہوتی ہے۔ مثلاً ہم نے یہ مشاہدہ کیا کہ مچھر سے ملیریا ہوتا ہے۔ اب اگر ملیریا کسی اور سبب سے ہو جائے تو بھی ہم
کہیں گے کہ یہ مچھر سے ہوا ہے اس طرح اگر کہہ دیا جائے کہ پولیس مین کے سر پر لال ٹوپی ہوتی ہے تو ہم جس شخص کے سر پر لال ٹوپی دیکھیں گے اس کو
یس مین سمجھ بیٹھیں گے۔

اب دیکھیں کہ سائنس کس طرح حقیقت کی تلاش کرتی ہے جیسا کہ اوپر بھی ذکر ہو چکا کہ سائنس چونکہ صرف مشاہدات کا نام ہے اس بنا پر اس
تمام نظریات احساس خمسہ تک محدود ہوتے ہیں اور جس جگہ احساس خمسہ جواب دے دیتے ہیں وہاں اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے جہاں تک کسی چیز
حقیقت معلوم کرنے کا تعلق ہے اس کا انحصار تین چیزوں پر ہوتا ہے۔

۱:- احساس خمسہ
۲:- روشنی یا ماحول
۳:- چیز کی ماہیت

فرض کرو میں جس قلم سے لکھ رہا ہوں اس کا رنگ ہرا ہے لیکن کیا یہ واقعی ہرا ہے یا صرف مجھے نظر آرہا ہے یہی قلم جب میں ایک ایسے
ی کو دکھاتا ہوں جس کی آنکھیں COLOUR BLIND ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو سفید ہے پھر اسی قلم کو جب میں بنفشی (ULTRA VIOLET)
اعوں کے نیچے رکھ کر دیکھتا ہوں تو یہ بنفشی نظر آتا ہے پھر اس قلم کو ایک کیمیا دان کے پاس لے جا کر اس سے اس کا رنگ دریافت کرتا ہوں تو وہ کہتے
، کہ دنیا میں کسی چیز کا کوئی رنگ نہیں یہ تو دراصل اس شے کی ماہیت ہوتی ہے جس میں خاص قسم کے سالمات اپنی مخصوص خصوصیات کی بنا پر ایک
ت جذب کرتے ہیں اور باقی منعکس کر دیتے ہیں۔ لہٰذا صرف اس قسم کا ہوا نہیں دنیا میں کسی چیز کا اپنا کوئی رنگ نہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر حقیقی معنوں میں قلم کس رنگ کا ہے۔ کیا COLOUR BLIND آنکھوں والے آدمی کی آنکھ خراب
، اس لئے وہ دھوکہ کھا رہا ہے؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ میری آنکھیں خود دھوکہ کھا رہی ہوں۔ یہ آدمی اقلیت کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور میں

صرف اکثریت میں ہونے کی وجہ سے اپنا نظریہ منوالوں۔ اگر وہ اکثریت میں ہوتا تو یقینا ہماری آنکھوں کو خراب کہنا۔ کیمیا دان کے قول کو بھی نہیں جھٹلایا جاسکتا کیونکہ وہ اپنے مشاہدہ کے مطابق بالکل صحیح کہہ رہا ہے۔ اندازہ کیجئے کہ احساس خمسہ، روشنی اور ماہیت کے فرق نے انسان [illegible]

دوسری مثال لیجئے۔ یہ میز جس پر میں لکھ رہا ہوں شیشم کی بنی ہوئی ہے۔ چاروں طرف سے برابر۔ سطح مستوی اور چمکدار ہے اور میں یہی سمجھتا ہوں کہ ایک سادہ وجود کی طرح ہر جگہ سے برابر ہے اور اس کی پالش میں چمک ہے۔ میں ایک آرٹسٹ سے اس میز کی تصویر بنانے کو کہتا ہوں وہ اس کو ایک خاص زاویہ سے دیکھتا ہے اس طرح کہ وہ جو تصویر بناتا ہے وہ ٹیڑھی ہوتی ہے۔ میں نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ اس کی سطح ہر جگہ سے برابر ہے۔ ایک سائنسدان اس کی سطح کو جب خوردبین سے دیکھتا ہے تو اس کی سطح ایک پہاڑی بنجر علاقہ کی سی نظر آتی ہے جس میں بے شمار نشیب و فراز ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں میز کی کیا پوزیشن ہے اس کا کسی کو کچھ علم نہیں۔

احساس خمسہ کی تفریق میں کس قدر تضاد ہے باوجود یکہ ہر انسان ہر جگہ اپنے مشاہدہ کے مطابق صحیح خیال ظاہر کر رہا ہے لیکن بات صرف یہ ہے کہ اسے خود بھی حقیقت کا علم نہیں۔ وہ جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے APPEARANCE ہوتا ہے اور اس کو وہ حقیقت مانتا ہے ورنہ کسی شئے کے پس پردہ جو حقیقت پوشیدہ ہوتی اس کا علم کسی کو بھی نہیں۔

یہ ہے وہ ناقص مشاہدہ جس کی بنیاد پر ہم حقیقت کو تلاش کرنے اور خدا کو ثابت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جب کہ ہمارے کسی مشاہدہ میں ذرہ برابر بھی (STABILITY) نہیں ہوتی۔

سائنس کے نظریات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دائرہ ہے جس کے مرکز میں سچائی ہے اس کے آس پاس مختلف مورچوں پر بے شمار تیر انداز جن کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں تیر پھینک رہے ہیں ہر تیر انداز کا خیال ہے کہ اس کا تیر نشانہ پر جا رہا ہے لیکن کسی کو علم نہیں ہوتا کہ کس کا تیر نشانہ پر ہے اس کا علم ہو بھی نہیں سکتا اس وقت تک کہ جب کہ ان کی آنکھوں سے پٹی کھل نہ جائے۔

مرکزی سچائی
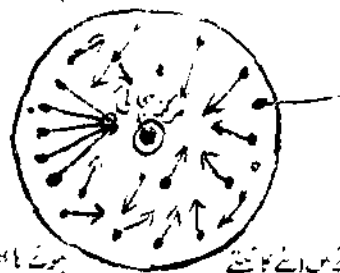
تیر اندازوں کا مورچہ

ایسی صورت میں تمام تیر انداز آگے بڑھتے ہیں اپنے ناپتے ہوئے ہاتھوں سے ٹٹولتے ہیں بالآخر ایک ایسی جگہ پاتے ہیں جہاں ان کا تیر پڑا ہوا ہے بس کہ وہ اسی کو وہ سچائی مان لیتے ہیں اور اس طرح سچائی سے کچھ قریب تر ہو جاتے ہیں۔ لیکن کوئی شخص حقیقت تک پہونچ کر بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں نے سچائی کو پالیا کیوں کہ اس کے پاس بظاہر اس کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

سچائی کو تلاش کرنے میں پیش پیش ایک طبقہ ماہرین حیاتیات کا بھی آتا ہے یہ بے چارے بھی اپنی عقل، سائنس اور مشاہدات کی بنا پر خدا کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ کسی بھی طبقہ کے جاندار کے جسم میں لاتعداد اکائی خلیات ہوتے ہیں اور ہر خلیہ میں ایک مخصوص تعداد میں (CHROMOSOMES) پائے جاتے ہیں ان کی تعداد ہر جاندار میں مخصوص ہوتی ہے اور جاندار میں مختلف اعمال کی جو صلاحیتیں پائی جاتی ہیں اور جو کچھ تبدیلیاں عمل میں آتی ہیں وہ دراصل کروموسوم کی تعداد کی تبدیلی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر انسانی جسم کے خلیہ میں ۴۶ کروموسوم ہوتے ہیں جب کہ بندر کے خلیہ میں اس کی تعداد ۴۸ ہوتی ہے۔ کروموسوم کی تعداد میں زیادہ فرق نہ ہونے کی وجہ سے آدمی اور بندر کئی اعتبار سے ایک دوسرے

سے مماثلت رکھتے ہیں۔ بہت سی بیماریاں جو صرف آدمیوں کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ بندروں میں بھی انہیں علامات کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ بندر چائے اور کافی انسان ہی کی طرح پیتے ہیں، سگریٹ بھی اتنی ہی شوق سے پیتے ہیں۔ بندروں میں جب EVOLUTION بڑھتا جائے گا کروموسوم کی تعداد کم ہوتی جائیگی اسی بنا پر جب اس کے کروموسوم REDUCE ہو کر ۴۶ ہو جاتے ہیں تو وہ انسان کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے لیکن یہ معمولی تبدیلی نہیں بلکہ اس کے لئے لاکھوں اور کروڑوں سال کا عرصہ درکار ہوگا یہ تو ان ماہرین کا نظریہ ہے جو ایک ایسی چیز کے مشاہدہ پر کمربستہ ہیں جس کے مشاہدہ کے لئے کسی ایک نسل کی تمام عمر بھی کافی نہیں۔ پھر بھی ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس میں کہاں تک حقیقت ہے۔

وہ ماہرین جنہوں نے بندر میں ۴۸ کروموسوم معلوم کئے ہیں اور ان کے کہنے کے مطابق اس کی کمی یا زیادتی سے جنس میں تبدیلی واقع ہو جائے گی۔ انہیں کے مشاہدہ کے مطابق یہ حوالہ دے رہا ہوں کہ صرف بندر میں ہی ۴۸ کروموسوم نہیں ہوتے بلکہ

PLATY FISH	میں بھی	۴۸ کروموسوم ہوتے ہیں
PLUM	میں بھی	۴۸ کروموسوم ہوتے ہیں
تمباکو کا پودا	میں بھی	۴۸ کروموسوم ہوتے ہیں
آلو کے پودے	میں بھی	۴۸ کروموسوم ہوتے ہیں

یعنی کروموسوم کی تعداد برابر ہونے کی صورت میں بھی ان میں کتنا فرق ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام تعداد برابر ہے تو یہ تمباکو اور آلو کے پودے بندر ہی کیوں نہ ہوگئے یا تمام بندر PLATYFISH اور PLUM ہی کیوں نہ بن گئے یہاں آکر ان کی اپنی تحقیق ہی اس نظریہ کا گلا گھونٹ دیتی ہے اور خدا کو ثابت کرنے کا کام ناتمام حالت میں رہ جاتا ہے۔

اس طرح خدا کے وجود کو سائنس سے ثابت کرنے کے لئے سائنس والوں اور مفکرین نے بہت کچھ کاوشیں کیں لیکن ان کے نظریات کوئی مستقل وجود برقرار نہ رکھ سکے بالآخر اس تحقیق پر کام کرنے والے زیادہ تر سائنس دانوں نے یہ نظریہ دے دیا کہ سائنس میں خود سچائی نہیں ہے اور مشاہدات میں تضاد کے سبب یہ حقیقت کو معلوم کرنے میں ناکام ہے اور چونکہ انسان کے اندر وہ تمام عناصر جو کسی چیز کی حقیقت دریافت کرنے کے لئے ضروری ہیں مستقل طور پر موجود نہیں ہیں اس بنا پر سائنس نہ تو خدا کو تلاش کر سکتی ہے اور نہ اسے ثابت کر سکتی ہے۔ افلاطون نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ انسان کا مقام قدرت کے اس بحر ذخار میں اس قدر حقیر ہے کہ وہ سچائی تو کجا اپنے مقام کو بھی پہچاننے میں ناکام ہے دراصل انسان ایک غار میں پرورش پا رہا ہے غار کا دروازہ بند ہے اور روشنی غار کے باہر سے آرہی ہے جب انسان اس غار میں رہ کر اپنی حقیقت کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے صرف دیواروں پر ایک دوسرے کے سائے نظر آتے ہیں جب وہ حقیقت کی تلاش میں آگے بڑھتا ہے تو اپنے غار کے دروازے بند پاتا ہے پھر قیاس آرائیاں شروع ہوتی ہیں کہ یہ روشنی غار سے باہر کسی منبع نور سے آرہی ہیں کوئی کہتا ہے کہ باہر کچھ نہیں بلکہ غار کے منہ پر کچھ چمکتے ہوئے ذرات جو لوہے کی شعاعیں خارج کر رہے ہیں۔ غرضیکہ بے حقیقت قیاس آرائیاں جن کا کوئی مستقل وجود نہیں بالکل یہی حال آج کی سائنس کا ہے جو علم خود ادھورا ہے ایک مکمل وجود تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ انسان جو خود اندھیرے میں ہے اور روشنی کے وجود پر قیاس آرائیاں کر رہا ہے اس کے مستقبل میں مایوسی اور ناکامی کے سوا کیا ہو سکتا ہے ؎

نہ تجھے دماغ نگاہ ہے نہ کسی کو تاب جمال ہے
انہیں کس طرح سے دکھاؤں میں جو یہ کہتے ہیں کہ خدا نہیں

خدا کے وجود کو اگر ماننا اور ثابت کرنا ہے تو اس کے لئے سادہ طریقہ یہی ہے کہ مادی علوم کو ایک طرف رکھ دیں اور مذہبی علوم کو ایک طرف رکھ دیں

مذہب کے مشاہدہ میں DEDUCTIVE METHOD استعمال کیا جائے یعنی پہلے ہم خدا کو بے چون وچرا مان لیں اس کے بعد اس کے احکام کو تسلیم کریں لیکن اگر ہر صورت میں عقل سے ثابت ہی کرنا ہے تو اس کے دلائل کے لئے تاریخ کے اوراق کو دیکھیں اور سان کی حقیقت سمجھیں۔ تاریخ کو لوگ محض ماضی کا مرثیہ کہتے ہیں جس کا مطلب یہ کہ تاریخ حقیقت سے دور ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے تاریخ ماضی کے وہ واقعات ہوتے ہیں جن کا مقصد آئندہ زندگی کے لئے سبق حاصل کرنا ہوتا ہے مثلاً اگر آج نہرو روڈ پر ایک حادثہ ہوتا ہے جس سے ایک آدمی بس کے نیچے آکر مر جاتا ہے۔ دوسرے دن اخبار اس خبر کی تفصیلات بتاتے ہیں کہ یہ حادثہ کیوں ہوا اور غلطی کس کی تھی۔ اس کا صرف یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ہم خبر کی سنسنی سے لطف اندوز ہوں بلکہ آئندہ ہم ایسی غلطی نہ کریں جس طرح کہ اس آدمی نے کی۔ تاریخ کی کتابوں کا مقصد بھی صرف پڑھنا نہیں بلکہ سبق حاصل کرنا ہوتا ہے۔

دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام آئے۔ ان کے زمانے میں بھی خدا کو ثابت کرنے کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا تھا حضرت صالح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو بتایا کہ تمہارا مالک اور خالق خدا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم تمہارے خدا کو اس وقت مانیں گے جب تم اس سامنے والے پتھر میں سے ایک اونٹنی برآمد کر دو اور وہ بھی ایسی جو نکلتے ہی ایک بچہ بھی جنے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے خدا کے حضور دعا کی اور پھر جب آپ کا یہ معجزہ پورا ہوا تو لوگوں کو خدا کا یقین آیا۔

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی کہا تھا کہ ہم ایسے خدا کی عبادت نہیں کریں گے جو نظر بھی نہ آتا ہو۔ لہٰذا خدا سے کہو کہ وہ ہمیں اپنا جلوہ دکھائے، آپ نے بہت سمجھایا مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے بالآخر انہوں نے خدا سے درخواست کی اور پھر اس کے حکم کے مطابق آپ بنی اسرائیل کا ایک جم غفیر لے کر کوہ طور پر پہونچے اور پھر جب خدا نے نور کی جھلک دکھائی تو موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو چکے تھے۔ آپ کے ساتھی فنا ہو گئے اور کوہ طور جل کر سرمہ بن گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو بیت اللہ شریف خدا کی عبادت کے لئے تعمیر کیا اور جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا لوگوں نے اس کو تباہ کرنے کی کئی کوششیں کیں۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ ایک باقاعدہ کافرنے اسے تباہ کرنے کی کوشش کی۔ خدا نے کعبہ کی حفاظت کے لئے جو طریقہ اختیار کیا اس کا پورا قصہ قرآن میں سورہ فیل میں موجود ہے اللہ تعالیٰ نے اصحاب فیل کو اس سے قبل کہ وہ کعبہ کو ہاتھ لگاتے اپنی حکمت سے ابابیلوں کے ذریعے ان کو تباہ کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی عرب کے جاہلوں نے وجود باری تعالیٰ کے دلائل طلب کئے اس کے لئے آپ کے متعدد معجزات مشہور ہیں جس میں سب سے زیادہ اہم معجزہ شق القمر ہے جب کہ کفار نے کہا کہ اگر آپ چاند کے دو ٹکڑے کر دیں تو ہم آپ کے خدا کو مان لیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شہادت کی انگلی کا اشارہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے چاند دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ ایک مشرق کی جانب چلا گیا اور دوسرا مغرب کی جانب قرآن میں سورہ قمر میں اس کا ذکر موجود ہے (اقتربت الساعة وانشق القمر وان یروا اٰیة یعرضوا ویقولوا سحر

(قیامت قریب آگئی اور چاند شق ہو گیا۔ اگر کافر کوئی بھی نشانی دیکھیں تو اس سے انکار ہی کریں گے اور کہیں گے کہ یہ تو جادو ہے جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے)

اس طرح قرآن کا معجزہ خداوند تعالیٰ کے وجود کی ایک روشن دلیل ہے۔ خدا کا دعویٰ ہے کہ اس کی حفاظت وہ خود کرے گا اور قیامت تک کوئی اس میں ترمیم نہ کر سکے گا۔ دنیا میں آج بڑے بڑے دماغ ہیں لیکن وہ خدا کی ہر شے کو جھٹلا تو سکتے ہیں لیکن ایک ایسی آیت بنا کر لا نہیں سکتے جو کلام خداوندی کی مانند ہو۔ انہوں نے قرآن میں ترمیم کی بھی کوشش کی لیکن آج تک ایک زبر زیر تک کو نہ مٹا سکے۔ اگر ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اس

ت کرنے والی کوئی بڑی طاقت ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہی خدا ہے۔ اسی نے آپ کو پیدا کیا وہی جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے۔

یہ صبح کا طلوع اور شام کا غروب، یہ بدلتے ہوئے موسم، یہ بادل، یہ ہوائیں یہ قوس قزح یہ انسان اور پھر اس کے محکم ارادے جو ٹوٹتے
یہ سب اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں! فعل سے فاعل کا، نقش سے نقاش کا، مخلوق سے خالق کا، صنعت سے صانع کا، فطرت سے فاطر کا اور عبد
کا، پتہ ملتا ہے! پھر خدا کے رسولوں اور نبیوں کی پاک زندگیاں، جنہوں نے کبھی کوئی غلط بات زبان سے نہیں کہی، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان
ستیوں نے معاذ اللہ اس بات پر آپس میں سمجھوتا اور ایکا کر لیا ہو کہ ہم خدا کے وجود کے بارے میں لوگوں کو دھوکا دیں گے! ایسا نہیں ہو سکتا
ا۔ نبیوں اور رسولوں نے جو کچھ کہا وہی سچ ہے!

خدا تھا، خدا ہے، خدا ہمیشہ رہے گا، یہی وہ حقیقت الحقائق ہے جس پر ایمان لائے بغیر انسان کی فکر بلوغ کو نہیں پہونچی!

خدا کے باب میں یہ غور کیا ہے
خدا کیا ہے خدا ہے اور کیا ہے　　　(اکبر الہ آبادی)

"اسکول کے ہیڈ ماسٹر ملا غریب چند میری تباہ حالی پر بہت متاسف ہوئے، اسکول کی فیس معاف کردی، کبھی کبھی کپڑوں کے عطیہ کا بھی وعدہ فرمایا، اسکول آبائی گاؤں کے سات میل کے فاصلہ پر تھا، ایک کم سن اور فاقہ زدہ بچے کا روزانہ پیدل آنا جانا ناممکن تھا، اسکول کی کوئی عمارت نہ تھی، درختوں کے پتے چھت کا کام دیتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ :

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ساعت مجھے مرتے دم تک نہ بھولے گی، سب زخم تازہ ہوگئے، جیب میں صرف دو پیسے باقی تھے، ایک پیسے کے چنے اور ایک پیسے کا گڑ کھا کر کولھو کے بیل کی طرح پھر اسی راہ پر چل دیا۔"

رتن پنڈوری کی ملازمت کا آغاز اسکول کی چپراس گیری سے ہوا پھر وہ پرائمری اسکول میں ٹیچر ہوگئے اس کے بعد انہوں نے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے، پروفیسر شاداں بلگرامی نے اُن کی مدد؟ اور معاونت کی، یہاں تک کہ سری گوبند پور ہائی اسکول میں مدرس فارسی کے عہدے پر اُن کا تقرر ہوگیا۔

رتن پنڈوری کو حضرت دل شاہجہاں پوری مرحوم سے شرفِ تلمذ حاصل ہے اور حضرت دل کی علالت کے زمانے میں انہوں نے جناب بھورام جوشش ملسیانی سے استفادہ کیا انہوں نے لکھا ہے :-

"۱۹۴۴ء میں بزم ادب لاہور کے زیر اہتمام علامہ تاجور نجیب آبادی کی صدارت میں جلسہ ہوا جس میں خاکسار کو نباض سخن، ممتاز الشعراء کے خطابات سے نوازا گیا"

۱۹۵۵ء میں بزم ادب جالس ذیرہ (یو۔ پی) کی طرف سے لسان الہند اور راس الادبا کے خطابات عطا ہوئے"

جناب رتن پنڈوری متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور انہوں نے اپنے شاگردوں کی جو نام بنام فہرست دی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی درجن شاگردوں کے استاد ہیں۔ رتن صاحب نے شادی نہیں کی ان دنوں سری ہرگوبند پور کے ایک غیر آباد مندر میں سادھوؤں جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں! ایک طرف بیاس کا کنارہ اور مندر کا ماحول، دوسری طرف اُن کو نعت رسولؐ لکھنے کی بھی سعادت میسر آئی ہے :-

شافع اگر حضور رسالت مآب ہوں
پھر کیوں نہ فیض عام ہو رب کریم کا
بحرِ عدن میں لاکھ ہوں لولوئے شاہوار
کچھ رنگ روپ اور ہے دُرِ یتیم کا
کیوں کر بیاں ہو مدحتِ خیر البشر رتن
ہے تنگ قافیہ مری طبعِ سلیم کا

رتن پنڈوری کے کلام میں سادگی کے ساتھ سنجیدگی ملتی ہے، سیدھی سچی باتیں کسی قسم کا کوئی الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں اور شوخ و رنگین نہیں سنجیدہ اور متین واقع ہوئے ہیں۔ یہی چیز اُن کی شاعری میں جھلکتی ہے، فرماتے ہیں:-

بڑھادی زندگی کی قدر و قیمت موت نے ورنہ		بغیر اس کے بہت بے لطف اپنی زندگی ہوتی
دل تو یونہی ہی ادا میں ہاتھ سے جاتا رہا		جان کی بازی لگے ہاتھوں لگا کر دیکھ لوں

ہستی و مرگ میں کچھ فرق نہ دیکھا میں نے — اپنے ہی گھر سے چلا اپنے ہی گھر تک پہونچا

موجوں نے ہاتھ پاؤں تو مارے مرے لئے — تقدیر نے مگر لبِ ساحل ڈبو دیا

دنیا ملی تو ہاتھ سے عقبیٰ نکل گئی — اک مشتِ خاک کے لئے گوہر کو کھو دیا

اب جو اقرار بھی ہو تو کیا فائدہ — زندگی تھی مری تیرے انکار تک

عقل نے جال پھیلا دئے اے جنوں! — اب ہے دشمن ترا پھول سے خار تک

کیا مری حسرتِ دیدار بھی رسوا ہوگی — اس نے بھیجا ہے لفافہ تو کھلا بھیجا ہے

بند کر لیتا ہوں جب آنکھیں نظر آتے ہیں وہ — ہے یہی وہ خواب جس میں شان بیداری بھی ہے

ہم تو چلتے ہیں زمانے کی ہوا کے ساتھ ساتھ — دوستی ساقی سے واعظ سے شناسائی بھی ہے

کیا مری خشک لبی یوں ہی ڈبوئے گی مجھے — کشت اُمید پہ برسوں سے نہ برسا پانی

منزل پہ جا کے غور سے دیکھا تو یہ کھلا — پہلے تھا جس مقام پہ اب تک وہیں کھڑا ہوں میں

بعد مرنے کے بھی ہے روزِ جزا کا کھٹکا — غم ہستی سے کہاں چھوٹ کے جاتے کوئی

زندگی کیا ہے چلنا سفر میں — موت کیا ہے پلٹنا سفر سے

لو سنو وہ بھی تجاہل سے یہ فرماتے ہیں — نظر انداز ہوا کرتی ہیں آہیں کیوں کر

زباں کھلی نہ کبھی شرحِ داستاں کے لئے — خموشیاں ہی مری کم نہیں بیاں کے لئے

بادلوں نے باندھ رکھی ہے ہوا برسات کی — آج اے ساقی کوئی تو چیز لا برسات کی

دوسرا رخ :—

کہاں تک اے دلِ مضطر یہ شغل گریہ پیہم — جگر پارے بہے جاتے ہیں خونیں آبشار دل میں (ص ۲۵)

ہیں بہت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ — یہ کہ آنکھوں سے لہو کے آبشار جاری ہیں اور ان میں جگر کے ٹکڑے ہیں کہ بے تحاشا بہے جاتے ہیں۔

کیف کے دریا سے بیڑا مے کشوں کا پار ہے — رہ گئی ہے آج ساقی تیرے پیمانے کی بات (ص ۳۲)

ے کا دریا پھر اُس سے میکشوں کے بیڑے کا پار ہونا۔۔۔ تکلف ہی تکلف ! کیف کے دریا میں میخوار ڈوب جاتے تو ایسا ہو جاتا کہ پیمانے کی بات بگڑ جاتی۔ پھر کیف میں ڈوبنا تو میکشوں کی عین تمنا ہوا کرتی ہے۔

اتنی ہی سرگذشت ہے باغِ حیات کی — غنچے نے مسکرا دیا، شبنم نے رو دیا (ص ۳۸)

مسکرا دیا اور شبنم رو دی یا رو پڑی —— یہ ہے صحیح زبان !

بارِ آنسوؤں کا آیا ہوں لے کر میں آپ تک — سرمایہ تھا جو پاس حضوری میں ڈھو دیا

کہنا یہ چاہتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ تھا آنسوؤں کا سرمایہ تھا، وہ میں نے سب کا سب محبوب کے حضور حاضر کر دیا مگر اس خیال کو ادا کا انداز . . . ؟! "ڈھو دیا" نے رہی سہی شعریت کو غارت کر دیا۔

دلبری آپ کی ہم کو تسلیم ہے لیکن اس میں نہیں بوئے ایثار تک (ص ۴۱)

محبوب کے طرزِ دلبری سے "ایثار" کی توقع رکھنا ہی توقع موہوم ہے، پھر اس کا شکوہ کیوں! ردیف (تک) اس شعر میں سب سے زیادہ کھٹکتی ہے!

گو لاکھ آرزوئیں دلِ ناتواں میں ہیں تقدیر سو رہی ہو تو انسان کیا کرے (ص ۴۲)

مصرعہ اولیٰ بھی اگر مصرعہ ثانی کے جوڑ کا ہوتا تو اچھا خاصہ شعر وجود میں آجاتا۔

کلیجے کا کلیجہ جب امنڈ آتا ہے آنکھوں میں تو ہر اک اشک کو لخت جگر کہنا ہی پڑتا ہے (ص ۵۴)

یہ شعر قدامت و فرسودگی کا ایک نمونہ ہے۔

حسن کی معصومیت میں اک خطا کاری بھی ہے اس کی شرمیلی ادا کے ساتھ عیاری بھی ہے (ص ۵۵)

پختہ مشق شاعروں کو ایسے شعر زیب نہیں دیتے۔

دزدیِ دل کا راز اُن کی نظر سے پوچھ یہ بات اپنے گھر کی ہے اپنے ہی گھر سے پوچھ (ص ۶۷)

"دزدیِ دل" اردو زبان و ادب میں مروج نہیں ہے۔

جب سے سرمایہ ادراک لٹایا ہم نے بے نشاں کا بھی نشاں سامنے پایا ہم نے (ص ۸۸)

شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے اُس کے اظہار کے لئے موزوں الفاظ نہیں مل سکے۔

رتن پنڈوری کی نظمیں اور رباعیاں بھی اُن کے غزلوں کا آہنگ رکھتی ہیں، اس دور میں جب کہ زبان کی نزاکتوں سے شعراء اور نثر نگار بیگانہ ہوئے جا رہے ہیں، رتن صاحب کے ایسے اشعار:-

اُف یہ جوئے بستر اور تکبر اتنا
سخت حیرت ہے کہ کس برتے پہ تتا پانی

اُردو زبان کی نزاکت و خصوصیت کا حسین مظہر ہیں۔

ہر قسم کا سوتی اور اونی کپڑا کورا اور دھلا لٹھا
دھاگہ
ہر قسم کا
تیار ہوتا ہے
باوانی
وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
منگھو پیر روڈ
کراچی
باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹیڈ کا تیار شدہ کپڑا
ہر اعتبار سے قابل اعتماد ہے
پاکستان کی صنعت کی قدر اور حوصلہ افزائی آپکا قومی فریضہ ہے
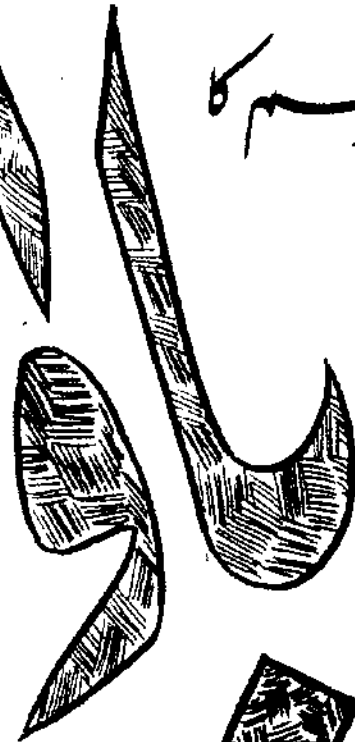
قوسِ قزح

عاصی کرنالی :-

کتنے سورج ہیں فلک پر جلوہ گر کوئی نہیں — جیسے اس شامِ مسلسل کی سحر کوئی نہیں
ایک تیشہ، ایک کوہِ بے ستوں، اک کوہکن — اور دنیا میں حیاتِ معتبر کوئی نہیں
اب مسافر کی بصیرت پہ ہے سارا انحصار — منزلیں چاروں طرف ہیں رہگزر کوئی نہیں
یہ تو اک موجِ ہوا سے ہل گئی زنجیرِ در — اے دلِ درد آشنا اے چشمِ تر کوئی نہیں
کتنا احساں ہے کہ لبریزِ تجلی ہے نظر — کتنی شوخی ہے کہ تا حدِ نظر کوئی نہیں
تیغ چلتی ہے مگر کوئی نہیں تیغ آزما — ظلم ہوتا ہے مگر بیدادگر کوئی نہیں
کب اٹھائے لطفِ فردا، کب لگائے دل [illegible] — زخم دہ دل میں ہے حسرت کا چارہ گر کوئی نہیں
ہے عجب میرے آنگن میں دبے قدموں کی چاپ — [illegible] سے دل کیوں دھڑکتا ہے اگر کوئی نہیں
کس سے ہوں ہم بدگماں کس سے [illegible] ہم بدگماں — خضر کوئی نہیں، نامعتبر کوئی نہیں

جس میں [illegible] کوئی جیسے بچھا دے فرشِ گل
جادۂ ہستی میں ایسی رہگزر کوئی نہیں

عرفان چشتی :-

[illegible] کا جیسے بنا لیں یا صورت شہزادوں کی
دور سے پہچانی جاتی ہے شکل ترے بربادوں کی
[illegible] دل پر چھنے لگی ہے گردِ راہ تو دل تو کیا
ذہن میں ہے محفوظ ابھی تک صورت ان کی یادوں کی
اب بھی ترے کوچے میں ہوائیں خاک اڑاتی پھرتی ہیں
باقی ہے یہ ایک روایت اب بھی ترے بربادوں کی

سید خورشید افسر سوانی :-

ہم نشیں تجھ سے حالِ سفر کیا کہوں — یا گھنی چھاؤں تھی یا کڑی دھوپ ہے
ان کے رخ پر پڑے زلف شکن در شکن — گلفشاں سائے ہیں، ملگجی دھوپ ہے

افسر مرے ساتھ اب اسے چلنا ہی پڑے گا
کتنے ہی بہانے غمِ ایام تراشے

کاوش عمر :-

الاماں راہوں میں بے پردہ خوبانِ حرم — چلتے ہیں جیسے ہوں یا سنگِ مرمر کے صنم
تنگ دیں تنگ وطن تنگ سلف تنگ وجود — ذہنیت مغرب زدہ پر دعوۂ ناز و نعم
سرو قد، گل رخ، سمن بر، غنچہ لب، گلشن جمال
نازنیں، زہرہ جبیں، جادو نظر، آہو قدم

شوق اثری :-

رہِ طلب میں جہاں روشنی نظر آئے — انہیں کا شہر انہیں کی گلی نظر آئے
یہ اک خیال کہ اپنا بنا لیں دنیا کو — یہ اک فریب کہ اپنا کوئی نظر آئے

روح انتخاب

سیدنا حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ بارگاہِ خداوندی میں

جب پردۂ شب گر چکا ہو اور پوری کائنات ایک گہرے سکوت میں غرق ہو، ستارے افق مغرب کی طرف بڑھ رہے ہوں تو اس وقت ذرا اپنے دل کو حاضر کیجئے اور اپنے رب کے حضور میں بیٹھ کر اس سے سرگوشیوں میں مصروف ہونا چاہیے۔ اپنی بے بسی، اپنی عاجزی کا استحضار اور خدا کی برتری و عظمت کا تصور کیجئے۔ ایک طرف اس کی رحمت بے پایاں اور اس کی رحمت بے کراں کا یقین ہو تو دوسری طرف اپنے گناہوں کا اعتراف اور تہی دامنی کا احساس ہو، سب سے پہلے آپ استغفار کیجئے، اپنی کوتاہیوں پر ندامت کا اظہار کیجئے، پھر اپنی ناتوانی، اپنے عجز کا جہاں تک ہو سکے صدق دل سے اقرار کیجئے اور پورے تضرع و عاجزی کے ساتھ مانگئے اور قبولیت کی پوری امید رکھئے۔

ذیل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مناجات پڑھئے اور اس سے روشنی حاصل کیجئے۔

الٰہی! اگر میری زندگی میں بہت سی باتیں ایسی نہ ہوتیں جن سے میں ناآشنا ہوں تو میں اپنی لغزشوں کا شکوہ کیوں کر آپ کر سکتا اور اگر میں اپنی زیادتیوں کو نہ یاد کرتا تو میری آنکھوں سے آنسو کیوں رواں ہوتے خدایا تو میری لغزشوں کو قائم رکھنے والی چیزوں کو میرے بہنے والے آنسوؤں کے طفیل میں ختم کر دے...... بارالٰہا! اگر تو محض اپنے فرماں بردار بندوں پر نظر رحمت ڈالے گا تو یہ تیرے خطاکار بندے کہاں جائیں گے اور اگر تو صرف نیکوکاروں کا کرم فرما ہو گا تو تیرے یہ گنہگار بندے کدھر کے ہوں گے، اور اگر محشر میں صرف اہل تقویٰ فوز و فلاح سے ہمکنار ہوں گے تو خطاکاروں کی فریادرسی کہاں ہو گی۔

الٰہی! میرے گناہوں کے بار نے میری زبان کو گنگ کر دیا ہے اور میں ہر طرح کی عذر خواہی سے معذور ہوں اور اپنے گناہوں کے شکنجہ میں گرفتار اور اپنے اعمال کا مرہون ہوں، تیری رحمت و درود نازل ہو تیرے مقرب و محبوب بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور تیری رحمتیں ہم گنہگاروں پر۔ اے اللہ اگرچہ میرے اعمال تیری اطاعت کے مقابل میں بالکل حقیر ہیں لیکن میری امیدیں تیرے عفو درگذر کے سامنے بہت بلند ہیں

الٰہی! میں تیرے حضور سے محروم و ناکام ہو کر کیسے لوٹ سکتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تو محض اپنے فضل و کرم سے میری رحم کی درخواست کو قبول فرمائے گا میں نے تیرے ساتھ حسن ظن رکھنے میں قنوطیوں کی مایوسی کو اپنے اوپر کبھی مسلط نہیں کیا۔ اس لئے میری امیدوں کو تو متحقق فرما دے الٰہی! میرا جرم بہت بڑا ہے اگرچہ گناہوں کے خوف سے میں متوحش ہوں لیکن تیرے لطف و کرم کے وعدوں سے میرا قلب منشرح ہے اگر تیرے حضور حاضر ہونے کی تیاری سے میں نے غفلت برتی تو تیری نعمتوں کی لذت نے مجھے اس پر متنبہ کیا۔ الٰہی! اگر تو نے اسلام کی راہ نہ دکھائی ہوتی تو بلاشبہ ہم گمراہ ہوتے اور اگر دعا کے لئے تو ہماری زبان نہ کھولی ہوتی تو ہم اس نعمت سے محروم رہتے اگر تو نے اپنے نعمتوں کی لذت سے آشنا نہ کیا ہوتا تو ہم اس کی قدر نہ کر سکتے اگر تیرے عذاب کی شدت ہم پر ظاہر نہ ہوئی ہوتی تو ہم اس سے پناہ نہ مانگتے۔ اے میرے اللہ اگرچہ میں ابرار و اولیاء کے ساتھ میں نہ رہ سکا لیکن تیری رحمت کے اعتماد نے تیرے بندوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اے میرے رب جس نفس کو تو نے ایمان کی تائید

ے عزت بخشی اس کو جہنم کے شعلوں میں تو کیوں کر ذلیل ہوتا دیکھ سکے گا۔ اے میرے پروردگار ہر شخص غمزدہ پریشان حال ہے اور وہ تیری ہی پناہ ڈھونڈتا ہے اور ہر مصیبت زدہ تجھی سے امید رکھتا ہے۔ الٰہی تیرے عبادت گذار بندوں نے ثواب کی امید میں اپنی حقیقت کو فراموش کر دیا۔ گنہگاروں نے تیری رحمت و مغفرت کے دریائے بے پایاں کو دیکھ کر تجھ سے عفو و کرم کی امید قائم رکھی یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے تیرے باب رحمت پر خطا کاروں کی یک بھیڑ جمع ہو گئی۔ کوئی ان میں گریہ وزاری کر کے تجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہ رہا ہے تو کوئی صرف سرد آہ بھر کر زبان حال سے تیری مغفرت کا طلبگار ہے۔

بار الٰہا! تو نے جنت کی حقیقت معلوم ہونے سے قبل ہم کو جنت کی درخواست کا جذبہ عطا فرمایا لیکن اب جب کہ اس حقیقت سے ہم کو آشنا کر دیا ہے اور ہم اس کی درخواست لے کر تیرے حضور میں آئے ہیں کیا تو اسے نامنظور کر دے گا! تو بڑا صاحب کرم ہے اور تیرا ہر کام حمد و ثنا کا باعث ہے۔ اے میرے اللہ اگر میں تیرے نزدیک تیری رحمتوں کا مستحق نہیں ہوں تو محض اپنے کرم سے ہم گنہگاروں کی مدد فرما، خدایا! میں تیری ذات پر مکمل اعتماد کر کے تیرے سامنے کھڑا ہوں تجھے اختیار ہے کہ میرے ساتھ جو معاملہ چاہے کر، اور اپنی رحمت کو جس طرح چاہے مجھے عطا فرما۔

اے اللہ! میرا دل تیری توحید سے سرشار ہے، میری زبان کلمۂ حمد و شکر سے تر ہے، قرآن نے تیرے بے انتہا کرم کی نشاندہی کی ہے، پھر میں کیوں کر تجھ سے رحم و کرم کی امید نہ رکھوں اور تیرے وعدوں کے پورے ہونے کی توقع ختم کر دوں۔

الٰہی! میں جب وقت قبر کی تاریکیوں میں تنہا لٹا دیا جاؤں گا اور عزیزوں، دوستوں اہل و اقارب سب ہی مجھ کو چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے، دشمنوں نے بھی اس وقت مجھ کو معاف کر دیا ہو گا اور ہر شخص پر میری بے چارگی و بے بسی عیاں ہو چکی ہو گی۔ فرشتے کہہ رہے ہوں گے کہ بے چارے کو اس کے عزیز و اقارب چھوڑ کر چلے گئے اور اس کے اہل و عیال نے بھی اس سے بے رُخی برت لی اور جن سے اس کی امیدیں قائم تھیں وہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑ گئے وہ اب ہمارے قریب آ گیا ہے اور آخرت کا سفر شروع ہو چکا ہے کیا اس وقت بھی میں تیری رحمتوں کی امید نہ رکھوں، نہیں اے میرے پروردگار اس وقت تو میری دستگیری فرما اور میرے اہل و عیال سے بھی زیادہ میرے لئے مشفق و مہربان ہو جا کہ میں اس تاریکی میں بجز تیرے اور کس سے لو لگا سکتا ہوں۔ الٰہی! تو نے دنیا میں جب میرے عیوب کو چھپایا تو آخرت میں برسرِ عام تو مجھے رسوا نہ کرنا، الٰہی میری بے کسی کا مداوا تیرے ہی جود و کرم سے ممکن ہے اور میری آرزو تیرے ہی ہاتھوں پوری ہو سکتی ہے۔

اے اللہ میں اس چیز میں تیری توفیق کا طلبگار ہوں جو مجھ کو تجھ سے قریب کر سکے اور جو چیز تجھ سے قریب کر سکے اور جو چیز تجھ سے دوری کا باعث بنے اس سے پناہ مانگتا ہوں۔ الٰہی تمام باتوں میں میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور نفع بخش وہ ہے جس کی توفیق تو نے مجھے عطا کی اور اس کی رہنمائی کی۔

اے مسکینوں اور بے نواؤں پر رحم کرنے والے قبر میں میری وحشت کو دور فرما۔ اور میری تنہائی پر رحم کر۔ اے ظاہر و باطن کے جاننے والے اور دلوں کے بھید پر آگاہ ہونے والے، اے مصیبتوں اور آزمائشوں کو دور کرنے والے جب تو زندگی میں مجھ پر مہربان تھا تو قبر کے تنگ و تاریک گڑھے میں اپنی نظر و کرم سے مجھے محروم نہ فرما اور میرے مرنے کے بعد تو اپنے احسانات کے فیض کو ختم نہ کر۔ اے الٰہ العالمین مجھ پر تیرے احسانات بے حد و حساب ہیں بس میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں اور تیری حمد و ثنا بیان کرتا ہوں، میری دعاؤں کا مرکز تو ہی ہے میری تمناؤں اور امیدوں کا ملجا و ماویٰ بجز تیرے کون ہو سکتا ہے۔

الٰہی! تو صاحب جلال ہے تو زندہ و پائندہ ہے تیرے ہی ہاتھ میں ساری کائنات کی باگ ڈور ہے اور تیری قدرت سب پر غالب ہے۔

(ترجمہ) — سعید الرحمٰن الاعظمی

ہماری نظر میں

تاریخ فقہ اُردو از :- علامہ شیخ محمد خضری بک مترجم :- مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا حبیب احمد ہاشمی، ضخامت ۴۰۰ صفحات (مجلد، رنگین، گرد پوش) قیمت :- نو روپے۔

ملنے کا پتہ :- دارالاشاعت مولوی مسافر خانہ، کراچی ۱

کتاب کا پیش لفظ مولانا محمد تقی عثمانی نے لکھا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں :-

"علامہ محمد خضری بک مصر کے آخری دور میں ایک وسیع المطالعہ عالم گذرے ہیں، تاریخ ان کا خاص موضوع رہا ہے اپنے طرز فکر اور اسلوب تحریر کے اعتبار سے اگر یوں کہا جائے کہ "وہ مصر کے مولانا شبلی ہیں" تو میرے خیال میں یہ اُن کا مکمل تعارف ہوگا ۔ ۔ ۔ !

زیر نظر کتاب میں دو تین مقام ایسے آئے ہیں، جہاں احساس مرعوبیت کے تحت علامہ خضری نے جمہور امت سے اختلاف کیا ہے، جہاد، نسخ اور غلامی پر انہوں نے جہاں گفتگو کی ہے، وہاں صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل میں خود اُن کا ذہن صاف نہیں ہے ۔ ۔ ۔"

کتاب کے ۹۰ صفحوں کا ترجمہ مولانا محمد تقی نے اور بقیہ کتاب کا ترجمہ مولانا حبیب احمد ہاشمی نے کیا ہے، ترجمہ خاصہ رواں، شستہ اور عام فہم ہے، کہیں کہیں البتہ کھٹک پیدا ہوتی ہے مثلاً :-

"بجز اس تلچھٹ کے جو نہ پیاس کو بجھاتا ہے اور نہ بیماری کو شفا دیتا ہے" (ص ۲۵۴)

بعض کی زبانوں سے تلچھٹ کو "مذکر" بھی سنا گیا ہے، لیکن جمہور اہل زبان اسے "مونث" بولتے ہیں!

ولا تکونوا کالتی نقضت غزلها من بعد قوۃ انکاثا تتخذون	تم اس عورت کے مانند بنو، جس نے اپنا سوت کاتنے پیچھے بوٹی بوٹی کرکے نوچ ڈالا۔ (ص ۸۰)

انکاثا" کا ترجمہ "بوٹی بوٹی" غلط ہے اس طرح کوئی نہیں بولتا کہ اس نے اپنا کرتہ بوٹی بوٹی کرکے پھاڑ ڈالا یا اپنی رسی کو بوٹی بوٹی کرکے توڑ دیا اس عبادت میں "قوۃ" کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے اس آیت کی زیادہ صحیح ترجمانی یوں ہو سکتی تھی ۔

"تم اس عورت جیسے نہ ہو جاؤ جس نے اپنا کاتا ہوا سوت محنت کرنے کے بعد (نوچ کر) ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا"

صفحہ ۸۰ کا ایک جملہ :-

"قرآن مجید نے جس امر کی طرف خاص توجہ دلائی ہے وہ عہد ناموں اور اقرارات کی پابندی ہے"

اردو میں انکار کی جمع " انکارات" اور اقرار کی جمع " اقرارات" نہ کوئی بولتا ہے اور نہ لکھتا ہے اس جملہ کا آخری ٹکڑا اس طرح ہونا چاہیے تھا
" ..... وہ عہد ناموں اور قول و قرار کی پابندی ہے "

صفحہ ۱۴۶ پر " لأزواجك " کا ترجمہ " اپنی بیبیوں" کیا گیا ہے، جو محل نظر ہے " زوجہ " کو اردو میں " بی بی" نہیں " بیوی" کہتے ہیں اجب کوئی عورت کسی کے نکاح میں آتی ہے تو وہ اس کی بی بی نہیں " بیوی" ہوتی ہے اشوہر کے مقابلہ میں " بی بی" نہیں " بیوی" بولا جاتا ہے !

کتابت کی غلطیوں میں سب سے فاحش غلطی یہ ہے کہ مشہور عالم حضرت ابو الزناد کا املا " ابوالزناد" (ص ۱۷۶ - ۱۷۷) کیا گیا ہے !
ص ۱۹۸ پر " قراء سبعہ" نظر آیا در اصل " قراء سبعہ" ہے۔

" غالباً سنت نے انہیں یہ حکم دیا تھا کہ وہ رمضان کی راتوں میں بھی اپنی عورتوں سے جماع نہ کریں، پھر
قرآن کریم نے اللہ سے اس سختی کو بھی ختم فرمادیا " (ص ۵۶)

فاضل مصنف نے " غالباً " لکھ کر جو بات کہی ہے وہ صحیح نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایسا قول اور فعل سننے اور پڑھنے میں نہیں آیا کہ حضور رمضان کی راتوں میں ازواج مطہرات سے دور رہا کرتے تھے !

" اللہ تعالیٰ نے صرف ماں بیٹی اور دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں لینے سے منع فرمایا ہے اور اس کے بعد
فرمایا ہے :-

وأحلّ لكم ما وراء ذلكم	ان کے سوا سب عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں "

" اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھوپھی، بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بھی نکاح میں جمع کرنے سے
منع فرمایا ..... " (ص ۷۴)

حالانکہ سورہ نساء میں واضح طور پر پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی .... وغیرہ سے نکاح حرام قرار دیا گیا ہے!

فاضل مترجمین نے بعض اصطلاحوں کی ضروری تشریح بھی کردی ہے، مثلاً متن میں لکھا ہے، حدیث سے ہماری مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقریر ہے " تقریر" کیا ہے؟ اس کی شرح " ذیلی حاشیہ " میں ملے گی ۔

" تقریر کا مطلب یہ ہے کہ کسی نے کوئی کام کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی، مگر آپؐ
نے کوئی نکیر نہیں کی "

قرآن کریم میں " أحصرتم " آیا ہے، فٹ نوٹ میں اس کی مناسب شرح کردی گئی ہے :-

" احصار کا مطلب یہ ہے کہ احرام باندھنے کے بعد کسی کو کوئی ایسا عذر پیش آجاتے کہ وہ طواف وسعی اور وقوف
عرفات پر قادر نہ رہے "

ترجمہ کا ایک نمونہ :-

" وہ (یعنی حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ) بنی امیہ کے آٹھویں خلیفہ تھے، مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے، مصر میں نشو و نما پائی اور حضرت انسؓ، مالک اور اکثر تابعین سے علم حاصل کیا، امام، فقیہ، مجتہد، سنت کے جاننے والے، بڑی شان کے بزرگ، صاحب وثوق، صاحب دلیل، حافظ، اللہ تعالیٰ کے مطیع، خشوع کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی طرف

رجوع کرنے والے تھے، عدل میں حضرت عمرؓ بن الخطاب کے مشابہ تھے اور زہد میں حضرت حسن بصریؒ کے اور
علم میں حضرت زہریؒ کے برابر تھے، حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ ہم ان کو سکھانے آئے تھے اور اس وقت تک ان کے پاس
رہے کہ ہم خود اُن سے سیکھنے لگے، سنہ ۱۰۱ھ میں وفات پائی" (ص ۱۸۶)

کیونکہ یہ حکومت و سیاست کی تاریخ نہیں بلکہ فقہ کی تاریخ ہے اس لئے فاضل مصنف نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا تذکرہ انتہائی اختصار کے ساتھ کیا ہے
مگر ان چند جملوں میں انہوں نے حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کی سیرت و کردار کا ست نکال کر رکھ دیا ہے۔

"تقلید" کے اس پہلو کی علامہ خضری نے صحیح ترجمانی کی ہے کہ :—

"۔ ۔ ۔ لیکن اس دور میں ایسے مجتہدین ظاہر ہوتے کہ جمہور نے ان کو ائمہ تسلیم کیا، ان کے نقش قدم پر چلنے اور
ان کی رایوں پر عمل کرنے لگے، حتیٰ کہ ان کی رایوں کو کتاب و سنت کے احکام قطعی کا درجہ دینے لگے، کہ کسی کو اُن
سے تجاوز کرنا جائز نہ تھا ۔ ۔ ۔" (ص ۲۴۵)

"تقلید" کا یہ غلو اور جمود پسندیدہ نہیں ہے !

"تدوین مذاہب کا تیسرا سبب یہ ہے کہ جس مذہب کو مدونین قابل اعتماد مل گئے تھے، وہ تو کامیاب ہو گیا
اور جمہور نے اس کو قبول کر لیا۔ دیکھو شافعیؒ کا قول کہ لیثؒ مالکؒ سے زیادہ فقیہ تھے مگر ان کے شاگرد ان کے
مذہب کو قائم نہ رکھ سکے ۔ ۔ ۔"

اس سلسلہ میں امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کا نام لینا ضروری تھا کہ وہ اجتہاد و فقہ کے عظیم المرتبت امام تھے مگر ان کے فقہی مذہب کی تدوین
نہیں ہوئی اس لئے وہ گم نام ہو کر رہ گیا !

اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لے کر آج تک کے دور کے فقہ اسلامی کی تاریخ بیان کی گئی ہے جو نہایت
جامع اور مفصل ہے، پھر چاروں ائمہ (ابو حنیفہ، مالک، شافعی، احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ) اور ان کے شاگردوں کے حالات درج
کئے ہیں کہ انہوں نے علم فقہ کے باب میں کیا کارنامے انجام دئے !

"آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو نافع اور مقبول بنائیں" (ص ۸)

یہ اسلوب نگارش اور طرز خاص علماء دیوبند کی تحریروں میں دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے از روئے تکریم و تعظیم جمع کا صیغہ استعمال کرتے
ہیں، مگر جب بھی اس قسم کی عبارت نگاہ سے گذری ہے وجدان نے خاصی کھٹک بلکہ خلش محسوس کی ہے! اب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال
جب کہ اردو نثر نگاری عالم طفولیت میں تھی بعض علماء یوں لکھتے تھے :—

"اللہ صاحب یہ فرماتے ہیں"

مگر زبان ترقی کرتے کرتے جب معیاری بن گئی تو پھر اللہ تعالیٰ کی نسبت سے یہ طرز تحریر متروک ہو گیا، اس زمانے میں "اللہ صاحب" کوئی لکھ
دے یا بول دے تو لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے! اہل ادب، ارباب معنی اور شعراء اردو زبان و ادب میں غایت تکریم کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ
کے لئے واحد (تو، تیرا، وہ، اُس کا ۔ ۔ ۔) کا صیغہ استعمال کرتے ہیں یہی انداز فصیح ہے اور مقبول ہے! اردو شاعروں کی شاعری دیکھئے
قصیدہ ہو، غزل یا مثنوی اور رباعی ہو ہر صنف میں اللہ تعالیٰ کے لئے صیغہ واحد استعمال کیا گیا ہے، اس طرح :—

س الٰہی تو ہے وحدہٗ لا شریک بنایا ہے تونے ہر اک شے کو ٹھیک[1]

س تیری ذات پاک ہے اے خدا تری شان جل جلالہٗ

س تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا

س بلبل کی زباں پہ گفت گو تیری ہے

س کون و مکاں کے مالک مالک ہے نام تیرا

س یہاں اللہ ہی اللہ ہے وہاں اللہ ہی اللہ ہے

س میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے

شاذونادر ہی کسی شاعر نے اللہ تعالیٰ کے لئے "آپ" یا "تم" استعمال کیا ہوگا، شعراء زبان وبیان کی نزاکتوں اور تکریم و ادب کے تقاضوں کو پہچانتے ہیں، وہ جس طرز یا اسلوب پر اتفاق کرلیں زبان میں وہ سند بن جاتا ہے شعراء کے علاوہ ادیبوں اور نثر نگاروں کی غالب اکثریت بلکہ یوں کہنا چاہئے سو فی صد اکثریت اللہ تعالیٰ کی ذات وصفت کے لئے صیغہ واحد بولتی اور لکھتی ہے ـــــ اس لئے ہم دیوبند سے وابستگی رکھنے والے نوجوان اہل قلم کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ وہ اس طرز نگارش (اللہ تعالیٰ دعا قبول فرمالیں، اللہ بگڑی بنادیں اللہ تعالیٰ نبیوں پر وحی بھیجتے رہے ہیں . . . .) کو ترک کردیں اور اسلاف کی تقلید کے جوش میں اُس طرزِ نگارش پر اصرار نہ کریں جسے ذوق سلیم گوارا نہیں کرتا۔

یہ کتاب کوئی شک نہیں، اپنے موضوع پر اونچے درجہ کی کتاب ہے اس کے ترجمہ نے اردو ادب کی ثروت میں اضافہ کیا ہے اس کے مطالعہ سے نہ صرف طلبا بلکہ علماء کو تو فیض ملے گی اور فقہی مسائل میں بصیرت پیدا ہوگی۔

حیاتِ امدادؒ

از:۔ پروفیسر محمد انوار الحسن انور۔ ضخامت ۱۷۶ صفحات (مجلد، رنگین گردپوش) قیمت چار روپے
ملنے کا پتہ:۔ شعبہ تالیف وتصنیف مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی ۵

اس کتاب میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۱۸۱۴ء وفات ۱۸۹۶ء) کے حالاتِ زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب کا آغاز دارالعلوم دیوبند کے تعارف سے ہوتا ہے اس سلسلہ میں علامہ رشید رضا اور شیخ الاسلام فلپائن وغیرہ مشاہیر علماءِ اسلام کے ساتھ ڈاکٹر راجندر پرشاد آنجہانی سابق صدرِ حکومت ہند کی رائے بھی درج ہے، اس کتاب میں دیوبند کے نامور علماء کی تصانیف اور ان کی ادبی وعلمی خدمات تذکرہ کیا گیا ہے کانگریس اور مسلم لیگ سے دیوبند کا کیا تعلق رہا ہے اس کی تفصیل بھی زیرِ تنقید کتاب میں ملتی ہے! پھر ان غلط عقائد کی تردید کی گئی ہے جن کو اہل بدعت دیوبند کو بدنام کرنے کے لئے دیوبندیوں سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ جو تایا نی اہل قلم مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لئے حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو متہم کرتے ہیں۔ کہ مولانا موصوف ختم نبوت کے قائل نہ تھے۔ اس کی تردید میں، حضرت مولانا محمد قاسم کی یہ عبارت نقل کی گئی ہے :ـــ

"بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور نبی کے ہونے کا احتمال نہیں جو اس میں تامل کرے اس کو

---

[1] یہ شعر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

کافر سمجھتا ہوں (مناظرہ عجیبہ ص۱۰۳)

حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی فاضل مصنف نے نہ جانے کہاں کہاں سے تحقیق و تفحص کر کے فراہم کئے ہیں، حضرت حاجی صاحب کی اردو فارسی نثر و نظم، فارسی ادب اور فارسی شاعری پر تفصیل سے بحث کی ہے اُن کی غزل کے یہ شعر کتنے اچھے ہیں ——

رفتم چو بمکہ ہوسِ کوئے تو کردم	دیدم رُخِ کعبہ ہوسِ روئے تو کردم
محرابِ حرم گرچہ بہ پیشِ نظرم شد	من سجدہ دلے در خمِ ابروئے تو کردم
در سعی و طواف و بہ حطیم و بہ مقامے	ہر سمت تماشائے رخِ نیکوئے تو کردم

مکۂ معظمہ میں ہجرت کے بعد کیا حالات پیش آئے ؟ اس کی تفصیل کتاب میں نہیں ملتی! کاش! کوئی دوسرا سیرت نگار اس کمی کو پورا کر سکے!

"حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے خود مثنوی مولانا روم سے پڑھی" (ص ۹۱)

اس قسم کے مکاشفات اور واردات کی کاش! کوئی علمی، دینی یا طبیعاتی و روحانی توجیہہ کوئی صاحب فرما دیتے۔

"حاجی صاحب کے درس میں مثنوی شریف ختم ہو گئی تو گیارہ گیارہ بار سورۂ اخلاص پڑھ کر نیاز کی گئی اور شربت بٹنا شروع ہوا . . . ." (ص ۹۰)

بریلوی عقائد رکھنے والے بھی یہی کچھ کرتے ہیں؟ نذر و نیاز کا یہ طریقہ کیا مسنون اور ماثور ہے؟ اگر ہے تو ثبوت پیش کیا جائے، نہیں ہے تو پھر . . . . ؟

". . . . جب اس میں مشق ہو جائے تو اس کے بعد اپنی تلاوت کے متعلق خیال کرے کہ وہ بلند ذات خود ہی پڑھ رہی ہے اور خود ہی سُن رہی ہے" (ص ۱۶۸)

یہ حضرت حاجی صاحب کی کتاب "ضیاء القلوب" (فارسی) کا اردو ترجمہ ہے، قاری کا اپنی قرأت کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ "وہ خود نہیں پڑھ رہا بلکہ اللہ تعالیٰ خود پڑھ رہا ہے" کس قدر وحشت انگیز تصور ہے، توحیدِ خالص اس نکتہ آفرینی کو گوارا نہیں کر سکتی۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے حالاتِ زندگی پر غالباً یہ پہلی کتاب ہے جو اس قدر تفصیل کے ساتھ آئی ہے!

سفینہ چاہیئے از :- شاد عارفی، مرتب :- سلطان اشرف، ضخامت ۱۵۲ صفحات (مجلد، خوبصورت سرورق)
ملنے کا پتہ :- رام پور پبلشنگ سوسائٹی، بنگلہ آزاد خاں، رام پور (یو۔ پی۔ انڈیا)

یہ کتاب شاد عارفی کے کلام کا مجموعہ ہے، جس میں ان کی نظمیں، غزلیں اور قطعات شامل ہیں! شاد عارفی کی زندگی ہی میں اس مجموعہ کی اشاعت کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں، مگر اس زمانے میں شاد صاحب کو شدید قسم کی بیماری نے آن گھیرا یہاں تک کہ ۸ر فروری ۱۹۶۴ء کو وفات پا گئے! فہرست کے بعد اس کتاب کا آغاز "روداد سفر" سے ہوا ہے جو سکریٹری صاحب رام پور پبلشنگ ہاؤس کی لکھی ہوئی ہے، سکریٹری صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں :——

". . . . کوشش یہی کی گئی ہے کہ شاعر کے زیادہ سے زیادہ رنگِ سخن کی نمائندگی اس مجموعہ کے ذریعہ ہو جائے"۔

رام پور کے اس ادارہ نے شاد عارفی کے سوگ میں کوئی تعزیتی جلسہ نہیں کیا بلکہ اس کی بجائے شاعر کی قدر شناسی اور اس کی ذات سے محبت و عقیدت کا یہ عملی ثبوت پیش کیا کہ اُس کے مجموعہ کلام کو مرتب کر کے چھپوا دیا، اس ادارہ کے سکریٹری صاحب کے خلوص اور بے نفسی کا زندہ ثبوت

یہ ہے کہ پیش لفظ "دردعادِ سفر) میں اپنا نام نہیں لکھا، ورنہ آج کے زمانے میں شعر و ادب کا زیادہ تر کاروبار نام و نمود ہی کے لئے ہو رہا ہے۔

جناب گوپال متل کا ایک مختصر سا مقالہ اس مجموعہ کی زینت ہے' وہ لکھتے ہیں :-

"شاد عارفی مجتہد بھی تھے اور مجاہد بھی انہوں نے شاعری میں ایک نیا اسلوب سخن ایجاد کیا"

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اپنے مقالہ میں شاد عارفی کے فن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے :-

"اور شاید یہ بھی اس کے بڑے پن کی ایک نشانی ہے کہ اُس کی شخصیت اور شاعری میں کہیں دو رنگی نہیں"

آخری مضمون خود شاد عارفی کا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے بارے میں تین صفحے لکھے ہیں، جن کی ہر سطر میں آن کی "خودی بیدار نظر آتی ہے! وہ اس کا دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے اردو شاعری میں نئی راہ نکالی ہے اور ان کا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے، شاد عارفی کا کلام پڑھتے ہوئے ایک نئے "آہنگ" کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری میں ابھرتے انداز میں سماج کی عکاسی کی گئی ہے اُن کی پہلی نظم "آپ کی تعریف" ہے اس کے دو بند کتنے جاندار ہیں۔

پیر گلشن شاہ سے بیعت ہیں آپ
سر نگھتے ہیں پھول کھاتے کچھ نہیں　　　جھوٹ ہے پیتے پلاتے کچھ نہیں
خلوتوں میں "مرغ و ماہی" کے سوا　　　کر چکے ہیں ترک بیران و غذا!
بخشتی ہے آپ کی میٹھی نظر　　　بانجھ کو اولاد اور کنواری کو بر
بند کیجے منہ بڑے حضرت ہیں آپ
پیر گلشن شاہ سے بیعت ہیں آپ

(۵)

کیا انہیں بھی آپ پہچانے نہیں
بلبل فردوس کے سالے ہیں یہ　　　بات اتنی ہے ذرا کالے ہیں یہ
چھن چکی جب گیر آمد بند ہے　　　اب فقط افیون میں آنند ہے
پھل پھلاری بیچتے ہیں آج کل　　　بھوگتا ہے آدمی کرنی کا پھل
ہیں پریشاں حال دیوانے نہیں
کیا انہیں بھی آپ پہچانے نہیں

اس نظم میں ایسے اشعار بھی نظر آتے :-

اس تامل میں کہ ہو جائے نہ جیل　　　ملتے ہیں اشعار پر سانڈے کا تیل

اول تو "تامل" یہاں اکھڑا اکھڑا لگتا ہے، پھر مصرعہ ثانی خاصہ عریاں ہے اور اشعار پر سانڈے کا تیل ملنا یہ خلاف واقعہ ہے۔

ناچنے میں آپ کا ثانی نہ تھا　　　"بھاؤ" میں امکانِ ارزانی نہ تھا

مصرعہ ثانی مبہم نہیں مہمل ہے!

انقلاب آیا تو تنہ گاہ تھے　　　آپ ظل اللہ عالی جاہ تھے

عربی کے الفاظ ـــ شر، جر، بر ـــ وغیرہ کی "ر" تو بیشک مشدد ہے، مگر "پکار" کی "ر" پر تشدید غلط بھی ہے اور وجدان' سامعہ کے لئے ناگوار بھی!

یہ صحافی ہیں پرائے ہاتھ سے
جہل و طغیانِ معر کی قسم ٭ ہیں ملازم چند ازہانِ قلم
جو لکھا کرتے ہیں ان کے نام سے ٭ کام ہے جن کو شبابِ جام سے
ہو نہ جائے مطبع و اخبار ضبط ٭ قوم کی خدمت کو فرماتے ہیں خبط
جس طرح اندھا کوئی نٹ ہاتھ پہ ٭ یہ صحافی ہیں پرائے ہاتھ پہ

اس بند میں نوشتوں کا سا انداز سمایا جاتا ہے، سلطان اشرف صاحب کو چاہئے تھا کہ ترتیب دیتے وقت وہ اس قسم کے سطحی اشعار کو چھانٹ دیتے:

ہیں ملازم چند اذہانِ قلم

میں "اذہانِ قلم" سے آخر کیا مراد ہے؟ پھر "شبابِ جام" کس بلا کا نام ہے ـ قوم کی خدمت کو فرماتے ہیں خبط ـــ یہ مصرعہ بچکانہ ہے!

شاد عارفی نے "بلینک ورس" میں بھی طبع آزمائی کی ہے، "شب برات" کا یہ بند واقعہ کی ہو بہو عکاسی ہے ـــ

تاش کھیلیں گے ورانڈے میں لگا کر بازی
میری بھیا پہ لگایا تھا ترپ کا اکّا
ہاتھ میں اینٹ کی یکّی جو لئے بیٹھا تھا
یاد رہتا ہے مجھے ہر سال
یہ بڑا بول نہیں البتہ

اسی نظم کا یہ مصرعہ ـــــ

نہ چاہنے دماغوں کو کرے گی گھائل

پڑھ کر طبیعت خاصی منغض ہوئی!

"ٹکڑ گدے" کے ان شعروں میں کس قدر لطف ہے ـــ

سرفراز خاں نانا تھے حضور کی مانند اس کھجور کی مانند
جس پہ بادِ باراں کا حملہ ہائے طوفاں کا
کچھ اثر نہ ہوتا تھا، شیخ طور کی مانند
عمر کے تناسب سے آپ سن رسیدہ ہیں، فلسفہ دیدہ ہیں ـ

آنکھ ہے سیاست پر، دانت ہے وزارت پر
فکرِ شہر میں دبلے، بلکہ آبدیدہ ہیں

صفحہ ۱۶ پر غالباً علامہ اقبال کے اتباع میں شاد عارفی نے قطعہ کو رباعی (کسی مشین کے پرزے اگر غلط ہو جائیں ... م) لکھا ہے۔
"گنگا اشنان" معرکہ آرا نظم ہے مگر افسوس ہے کہ اُس کے شروع کے دونوں مصرعے کمزور ہیں :-

اشنان کے تقریب میں گنگا کے کنارے جمعیت افراد پہ طاری ہیں نظارے

"تقریب" تو مونث ہے پھر "کے" کیوں ؟ مصرعہ ثانی بھرتی کے لفظوں سے عبارت ہے ! ان اشعار میں جوش و ولولہ اور روانی دیکھئے

پگھلے ہوئے بلّور کی لہروں میں "جوانی"
بکھرے ہوئے سیماب کے پہلو میں شرارے
وہ "سوریا پوجا" وہ "ہری اوم" کی جاپیں
زاہد بھی جو سن لے تو "ہری اوم" پکارے

لمحات سبک سیر کو پرواز کا ایما
گھڑیوں کو دبے پاؤں گزرنے کے اشارے

چند منتخب اشعار :-

اگر فطرت عطا کرتی نہ احساسِ زیاں مجھ کو تو چکمہ دے چکا ہوتا امیرِ کارواں مجھ کو
خلوتوں کا بھید کوئی جاننے والا بھی ہے مت سمجھ لینا ہمارے درمیاں کوئی نہیں
جب گریباں گیر ہو جاتا ہے ٹھکرایا ہوا سوچتا ہے تب ہر اک ظالم ارے یہ کیا ہوا

ہمیں ستا کر جو ہیں پشیمان دل میں شاید وہ بچ بھی جائیں
ہمیں ستا کر جو مطمئن ہیں انہیں سزا لازمی ملے گی

تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی لیکن سوال یہ ہے کہ پھر کیا کرے کوئی
خود مبتلا ہیں پیچ پریشانیوں میں ہم فرصت کسے کہ آپ کو رسوا کرے کوئی

برائے زاہد، برائے ناصح، برائے واعظ، برائے قاضی
ملا کے مشک و گلاب و عنبر شراب کو خوشگوار کر لوں

اسی غزل میں شاد نے "بدلگاموں" کو "بدلجاموں" نظم کیا ہے عربی میں تو بے شک "لجام" بولتے ہیں مگر اردو میں تو "لگام" ہی مروج ہے

بے رونقیِ شمعِ تمنا نہ پوچھئے جیسے کوئی چراغ کسی قبر پہ جلے
ہجومِ گل میں بھی تسکینِ جستجو نہ ہوئی کسی میں رنگ نہ پایا کسی میں بو نہ ہوئی
آئی ہیں مری طنز کی چھینٹیں تو سبھی پر یہ کیا ! کہ فقط آپ ہراسان سے ہیں

یہ انتخاب غیر مبارک نہ ہے مگر ہیرا سمجھ کے آپ نے پتھر اُٹھا لیا
منکرِ وحدت کی یکسوئی پہ کثرت چھا گئی ایک کو چھوڑا تو دو لاکھوں کو خدا کہنا پڑا
آتے جاتے ہوئے لوگوں کو نہ گزرے کوئی شک اس تصور نے ترے در پہ ٹھہر نہ دیا
بعفادجود کو خوبی تو ہم بھی کہتے ہیں حکومتوں میں نہیں بلکہ مہ جبینوں[ط] میں
ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں
ہم خدا کے ہیں ، وطن سرکار کا حکم چلتا ہے مگر زردار کا
خشک لب کھیتوں کو پانی چاہیے کیا کریں گے ابر گوہر بار کا

ہم وفا شعاروں کی، تا کجا دل آزاری، طنزِ تلخ ناداری، طعنۂ سبک ساری
چاہیے رواداری اے بتانِ سنگین دل ، آبرو نہیں بھی آرزو کی ہے

دل پہ کیا دوشِ محبت جو چھپائے نہ بنے
یہ وہ دریا ہے جو کوزے میں سمائے نہ بنے

اگر ہم سے پھولوں کو ضد ہو گئی ہے ، اگر باغباں بھی ہمارا نہیں ہے
یہ گلبن تمہارا ، یہ گلشن تمہارا ، تو کیا آشیاں بھی ہمارا نہیں ہے

دیکھتا ہوں پھول کو کھویا ہوا شبنم میں ہوں کوئی کیا جانے کہ کس حالت میں کس عالم میں ہوں
یوں بھی الزامِ محبت کوئی الزام نہیں اور پھر آپ مرے ساتھ جس الزام میں ہوں
میں چراتا نہیں مضمونِ شگفتہ اے شاد چھین لیتا ہوں اگر دامنِ الہام میں ہوں
تم نے عرضِ حال پہ ہنس کر ظلم کیا ہے ، داد تو کیا دی
اپنی مرضی سے اُگتے نہیں خود رو پودے ہم غریبوں کا بہر حال نگہباں ہے کوئی
زرد چہروں کے تبسم نے کیا ہے رسوا ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی
چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اُٹھا لا ساقی شیخ صاحب میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی
چلو ہلکی سی مے پی کر چلے آئیں کہ میخانہ بس اتنا دور ہے جتنا مرا گھر آپ کے گھر سے
زاہد کی مے کشی کا سلیقہ نہ پوچھئے جیسے کوئی نماز پڑھے اور وضو نہ آئے
اب ہاتھ بڑھ گیا ہے تو میرا قصور کیا میں کہہ رہا تھا جام مرے روبرو نہ آئے
یہ بتانِ مرمریں بت کدہ جیسے اب انگڑائی لی اب بات کی
نیم سرحن کی نظروں کو ترے گیسو کے سائے میں غزل کے خوش نما اسلوب اُن کے ہاتھ آئے میں

ط - نازنینوں، مسودے میں لفظ تھا ۔

اس کو دیکھا تھام کر دل رہ گئے | کچھ نہ کہہ پائے بہت کچھ کہہ گئے
یہ تو ایسا ہے کہ جیسے کوچہ دار و رسن | ہم نہ جانے کر رہے تھے کیا گمانِ کوئے دوست
ہر صداقت رنگ لاتی ہے مگر تاخیر سے | دوست بنتے جا رہے ہیں دشمنانِ کوئے دوست
مشکین و معتبر ہیں اُس بت کی گزر گاہیں | واللہ بس آہو، گردِ رم آہو ہے

پھر اور چلن پھر اور چلن پھر اور چلن پھر اور چلن
جبھی تو بزم ہزار جلوہ پہ کوئی پہرہ نہ کوئی قدغن

دوسرا رُخ :۔

گمنام آرزو میں بڑا نام پالیا | دامن کی بھینٹ دے کے گریباں بچا لیا (ص ۱۰۰)

"گمنام آرزو" نے مصرعہ اولیٰ کو مبہم بنا دیا۔

عظمتِ فن کو روایات نے مرنے نہ دیا | شعر سے بچ کے کوئی ظلم گزرنے نہ دیا (ص ۱۰۴)

مصرعہ ثانی میں شاعر کا مفہوم گھٹ کر رہ گیا۔

صداقتوں کے ہمنوا پچاس فیصدی نہیں | مرے وطن میں میرے دشمنوں کی کچھ کمی نہیں (ص ۱۰۸)

"دندانِ تو جملہ در دہانند" جیسا شعر!

بحث تھی جس پہ وہ موضوعِ سخن باقی نہیں | فن پژوہوں میں مذاقِ انجمن باقی نہیں (ص ۱۱۱)

"فن پژوہوں" شعر کی لطافت پر بار ہے!

حقیقت ناگوار خاطر نازک نہ بن پائی | کچھ اس "تکنیک" سے ہم نے انہیں قصے سنائے ہیں (ص ۱۲۸)

"تکنیک" کی جگہ "انداز" آسکتا تھا!

"قطعات" میں ایسے قطعے بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔

مسکن میں بھر دی گئی ہو جیسے اک مُلّا کی روح | یا نمائش گاہ کے پھکنوں کا انفاخِ شکم
مولوی کا فاتحہ سے ربط ہے ضرب المثل | اس لئے نیت کے مارے فاتحہ خواں تو کہ ہم

یہ قطعہ زبان و بیان اور خیال ہر اعتبار سے بے لطف اور سطحی درجہ کا ہے!

سیٹھ بالو رام کہلاتا ہے آج | بیچتا تھا کل جو کابل کے چنے
اور دفتر کا یہ بوڑھا اردلی | عمر گزری اس کو چپراسی بنے

اس قطعہ میں "طنز" کتنی چبھتی ہوئی ہے! شاد عارفی کی شاعری نقار خانے میں طوطی کی آواز نہیں بلکہ ایسے ساز کی آواز ہے جو سننے والوں کو چونکا دیتی ہے!

قافلہ سخت جاں

از :- اسعد گیلانی، ضخامت ۲۰۰ صفحات (مجلد، گرد پوش کے ساتھ) قیمت اعلیٰ ایڈیشن :- چھ روپے، سستا ایڈیشن چار روپے۔

ملنے کا پتہ :- ادارہ ادب اسلامی، ۲۳ اے سٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا۔

ت اسلامی کو حکومت نے کالعدم قرار دے کر، اُس کے جن رہنماؤں کو جیلوں میں بند کر دیا تھا اس کتاب میں اُن شخصیتوں کا تعارف کرایا ہے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے لے کر مولانا صفات اللہ تک ساٹھ افراد ہیں جن کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے، ہر شخصیت کے کردار و سیرت کاسی بڑی دیدہ وری اور سلیقہ کیساتھ کی گئی ہے۔

اس کتاب میں جماعتِ اسلامی کے اُس اجتماعِ عام کی روداد بھی ملتی ہے، جس میں غنڈوں نے جماعت کے ایک رفیق کو شہید کر کے رکو درہم برہم کرنے کی ناپاک کوشش کی تھی، یہ روداد اتنی اثر انگیز ہے کہ کئی مقامات پر ہماری آنکھیں بے اختیار اشک آلود ہو گئیں، کے علاوہ جماعت کے خلاف قانون قرار دئے جانے اور اُس کے رہنماؤں کی گرفتاری کی تفصیل بھی اس کتاب میں ملتی ہے، جس کا حرف حرف یں ڈوبا ہوا ہے۔ اسعد گیلانی نے جو کچھ لکھا ہے اُس میں حقیقت کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے، نہ کسی پر الزام تراشی نہ مبالغہ آرائی نہ کوئی بات ہے خلاف! جیل میں اسعد صاحب نے کیا دیکھا ؟ کن حالات سے سابقہ پڑا کیسے کیسے مرحلے سامنے آئے ! جیل میں نماز کا کیا رنگ رہا، ت الٰہی نے دلوں میں کس طرح نفوذ کیا ! یہ تمام تفصیل اس کتاب میں ملتی ہے۔ صبر و شکر، توکل علی اللہ، عزیمت و استقامت کے جذبات تاب کی ایک ایک سطر معمور ہے، کوئی سنگدل سے سنگدل آدمی بھی اس کتاب کو پڑھے گا تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

صفحہ ۲۴ پر "غیظ" کا املا "غیض" دیکھ کر طبیعت بہت مکدر ہوئی اگر اسعد گیلانی صاحب "فاران" کا باقاعدگی کیساتھ مطالعہ کرتے ، تو وہ املا کی یہ غلطی نہ کرتے ۔ صفحہ ۶۲ پر خورشید احمد صاحب کا جو حلیہ بیان کیا ہے، اس میں "رنگ گورا" لکھا ہے حالانکہ خورشید صاحب کے رنگ گندمی ہی کہا جاسکتا ہے۔ صفحہ ۱۲۱ پر فضل معبود صاحب کے تذکرے میں جو "شیریں شخصیت" لکھا گیا ہے وہ بھی وجدان کو کھٹکا۔ شخصیت کو ریں، نمکین یا تلخ کوئی نہیں کہتا۔

اس کتاب سے پہلی بار اس کا علم ہوا کہ ڈیرہ غازی خاں کے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی اور انہوں نے لمی نام (Pen Name) عاصی صحرائی اختیار کر رکھا ہے ان کی غزل کا یہ شعر کتنا اچھا ہے :-

تیرے مصالح ساحل ساحل　　　میرے عزائم طوفاں طوفاں

"قافلہ سخت جاں" کے خطوط حق و صداقت کے ادب پارے ہیں ؛ جماعت اسلامی کے خلاف اب تک جتنا لٹریچر آیا ہے کے توڑ کے لئے تنہا یہ کتاب کافی ہے۔

فرشِ نظر

از :- رتن پنڈوری، ضخامت ۱۴۴ صفحات (مجلد، مصنف کی تصویر کے ساتھ) قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ :- سندھ پبلیکیشنز ۳ کیسر باغ پٹھان کوٹ (انڈیا)

"فرشِ نظر" جناب پنڈت رتن پنڈوری کے کلام کا مجموعہ ہے، حضرت مہر جالسی نے اس کتاب پہ مختصر سی "تقریظ" لکھی ہے، رتن پنڈوری نے جو حالات تمہید میں لکھے ہیں وہ ایک طرف واقعیت کے اعتبار سے سچائی کے آئینہ دار ہیں دوسری طرف اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اندر و کلام کی لگن اور سچا جذبہ ہو تو غربت، ناداری اور فقر و فاقہ کے مصائب بھی اُسے منزلِ مقصود پر پہنچنے سے نہیں روک سکتے وہ لکھتے ہیں :-

کارمینا

دردِ شکم، بدہضمی، بھوک کی کمی، اپھارہ، قبض، قے، دست، ہضم کی خرابی ——

یہ اور معدہ اور جگر کے دوسرے امراض آج کل عام ہیں۔ اور ان شکایتوں کی وجہ سے نہ صرف صحتیں خراب رہتی ہیں بلکہ کاروبار اور زندگی کے دوسرے مشاغل پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اچھا ہضم اور صحیح معدہ اچھی صحت کا ضامن ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ وہی ہیں جو کچھ آپ کھاتے ہیں۔ لیکن جب آپ کا کھایا ہوا جسم کو نہ لگے، اور جزوِ بدن ہو کر، خون بن کر آپ کو طاقت نہ پہنچائے تو کھانا پینا ہی بیکار نہیں ہوتا بلکہ اٹھنا بیٹھنا، سوچنا جاگنا مشکل ہو جاتا ہے اور جینا دوبھر۔

ہمدرد کی لیبارٹریوں اور ہمدرد مطبوں میں چیدہ جڑی بوٹیوں اور ان کے قدرتی ترکیبات پر طویل تجربات اور سائنسی تحقیقات کے بعد ایک متوازن اور مفید دوا "کارمینا" تیار کی گئی ہے جو ہضم کی جملہ خرابیوں کو دور کرنے میں خصوصیت رکھتی ہے۔ **کارمینا** معدے پر نہایت خوشگوار اثر کرتی اور اس کے افعال کو درست کرتی ہے۔ ہضم کے فعل کے لیے جو رطوبتیں ضروری ہیں کارمینا ان کو مناسب مقدار میں پیدا کرتی ہے۔ جگر کی اصلاح کرتی اور جگر کی جملہ خرابیوں کو درست کرتی ہے۔

سینے کی جلن، تیزابیت، پیٹ کا بھاری پن، نفخ، بدہضمی، پیٹ کا درد، کھٹی ڈکاریں، دردِ شکم، متلی اور قے، بھوک کی کمی، قبض یا معدہ اور جگر کی دوسری بیماریوں میں **کارمینا** کا استعمال نہایت مفید ہوتا ہے۔

"کارمینا" نظامِ ہضم کو درست اور مقدرتی کرنے کی یقینی دوا ہے ہر موسم اور ہر آب و ہوا میں ہر مزاج کے لوگوں کے لیے فائدہ بخش اور مؤثر ہے۔ بلاخطر استعمال کی جا سکتی ہے

کارمینا ہر گھر کی ایک ضرورت ہے

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی ڈھاکہ لاہور چاٹگام

ماہنامہ فاران کراچی
ایڈیٹر .... ماہر القادری
جلد ۱۷ | اگست ۱۹۶۵ء | شمارہ ۵

ترتیب

قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے
مقام اشاعت
دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی
(دکتبہ اشبیر مشن کوثی)
چندہ سالانہ سات روپے

منظور حسین پبلشر نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں طبع کرا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

رن کچھ کے مسئلہ پر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان بڑی تناتنی پیدا ہو گئی تھی، دونوں طرف فوجی تیاریاں، محاذِ جنگ کی سی کیفیت! یوں سمجھئے کہ لڑائی کی بارود بچھ چکی تھی، بس ذرا شتابہ دکھانے کی دیر تھی! محدود پیمانہ پر تھوڑی بہت معرکہ آرائی ہوئی، بات آگے بڑھنے نہیں پائی، یہاں تک کہ دونوں حکومتوں کے مابین سمجھوتہ ہو گیا! صلح بہرحال جنگ سے اچھی چیز ہے اور پھر آج کل کی جنگ خدا کی پناہ! تلوار اور تیر و کمان سے برسوں میں انسانوں کا جتنا خون بہتا تھا، آج سیکنڈوں اور منٹوں میں اس سے کہیں بڑھ کر غارت گری خونریزی اور انسانوں کی ہلاکت و تباہی ہو سکتی ہے!

پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کی اسی میں بھلائی ہے اور خیریت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حریف نہیں حلیف بن کر رہیں! ایک دوسرے کی طرف سے بے اطمینانی، خطروں اور اندیشوں کی فضا کا اس کے سوا اور کوئی حاصل نہیں ہے کہ دماغوں کو تشویش لاحق ہے، دل مضطرب و پریشان اور زندگیاں بے آرام ہیں! رن کچھ کی طرح دوسرے تنازعے بھی طے ہو سکتے ہیں اور طے ہونے چاہئیں! بھارت کی یہ روش کہ "مسئلہ کشمیر" کا ذکر ہی نہ آنے پائے، واقعہ اور حقیقت کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہے! مسئلہ کشمیر زندہ ہے اور یہ تنازعہ بدستور موجود ہے۔ بعض اوقات مسائل اس لئے بھی الجھا دیے ہیں پڑ جاتے ہیں کہ ملک کی اندرونی ابتری سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے بیرونی تنازعوں کو باقی رکھا جاتا ہے اور ان مسائل پر گفت و شنید تو ہوتی رہتی ہے مگر انہیں حل نہیں ہونے دیا جاتا! بقول شاعر۔

ع مسئلہ کشمیر کا لیڈر کو ہے تھامے ہوئے

پاکستان اور ہندوستان کا کھل کر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہندوستان میں ایسی متعصب جماعتیں موجود ہیں جو پاک و ہند کے درمیان صلح و صفائی نہیں چاہتیں اور جو اب تک "اکھنڈ ہندوستان" کا خواب دیکھ رہی ہیں، اور جن کے مشن کی کامیابی اسی میں ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ہمیشہ دشمنی اور کشاکش باقی رہے اور یہ حکومتیں ایک دوسرے کی دوست نہ بننے پائیں! بھارت کی یہ متعصب ندہ اور جھگڑالو جماعتیں اس کوشش اور سازش میں برابر لگی ہوئی ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے! ان کی عزت، مذہب، جان و مال اور ناموس ان میں سے کوئی چیز بھی محفوظ نہ رہے! سال دو سال میں کوئی نہ کوئی رڈکیلا اور جبل پور جیسا سانحہ مظلوم مسلمانوں کے لئے تیار ہوتا رہتا ہے، اس کے برخلاف پاکستان کی کوئی جماعت بھی پاک و ہند کے تعلقات کی کشیدگی کی آرزومند نہیں ہے، پاکستان میں بسنے والے ہندوؤں کو پریشان کرنے اور ستانے کے لئے اُن سے وفاداری کا کبھی کوئی ثبوت نہیں مانگا گیا، پاکستان کا دینی لٹریچر موجود

جس میں بار بار اس بات کو دہرایا گیا ہے کہ پاکستان میں جو ہندو اور دوسرے غیر مسلم رہتے ہیں، اُن کی جان و مال اور عزت کی حفاظت
مہ داری اللہ اور رسولؐ نے ہم پر ڈالی ہے، جس کا ہر حال میں لحاظ رکھنا ہمارا دینی فریضہ ہے، اور انسانی اخوت کے رشتہ کا ہر قیمت
رام ہونا چاہئے۔

ہندوستان کے شہری قوانین جو دین و شریعت سے متصادم نہ ہوں، اُن کی پابندی وہاں کے مسلمانوں پر ضروری ہے، اس نوعیت کے
ت بھارت کے داخلی معاملات میں کسی بیرونی حکومت کو دخل در معقولات کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، مگر وہاں کے مسلمانوں کو صرف اس جرم
پاداش میں ستایا، برباد کیا اور کھاٹا جائے کہ وہ دین اسلام کے حلقہ بگوش ہیں، تو اُن کی عزت، مذہب اور جان و مال کی حفاظت کا
سئلہ رن کچھ اور کشمیر کے مسائل سے بھی زیادہ اہم اور نازک ہو جاتا ہے! اگر اس مسئلہ سے صرف نظر کیا گیا یا غفلت برتی گئی تو اللہ
لیٰ کے یہاں ہم سے سخت باز پرس ہوگی!

رن کچھ کے معاملہ میں سب سے زیادہ مدح و ستائش کے مستحق وہ مجاہد سپاہی ہیں جنہوں نے خطروں کے ہجوم میں اللہ تعالیٰ کے حضور
ع و سجدے کئے ہیں اور نمازیں ادا کی ہیں، یہی اسپرٹ مسلمان کی سب سے قیمتی متاع اور سب سے بڑی قوت ہے! یہ قوت جب تک موجود ہے امریکہ یا
ی اور دوسری حکومت اپنا دست تعاون کھینچ کر ہمیں کمزور نہیں کر سکتی یہ قوت خدانخواستہ نہ رہے تو ساری دنیا کی حکومتیں بھی ہماری مدد
رہیں پھر بھی ہم کمزور و ناتواں ہی رہیں گے۔

اللہ غنی! نشیب و فراز کا یہ ڈرامہ، اقبال و ادبار کے یہ صبح و شام اور عروج و زوال کی یہ دھوپ چھاؤں کہ شام کے وقت تختِ حکومت پر
صبح کو جیل خانہ کی کوٹھری میں! الجزائر کے صدر بن باللہ کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا! جب تک وہ برسر اقتدار رہا عوام و خواص سب کے سب
کی قصیدہ خوانی کرتے رہے، اس کی فراست و تدبر کی تعریف، خلوص و دیانت کی مدح سرائی، اُس کے کردار کو خراج عقیدت جیسے الجزائر میں
یہی ایک "انسانِ کامل" صدیوں کے بعد پیدا ہوا ہے، مگر زوال حکومت اور عنانِ اقتدار چھن جانے کے بعد اب اُسی "عظیم و کامل انسان" میں
ح طرح کے عیب نکالے جا رہے ہیں! یا تو اقبال کا وہ عالم کہ بن باللہ صاحب کا ذرا کان بھی گرم ہو جائے تو صبح و شام بلیٹن شائع ہوتے تھے یا اب
ک پتہ نہیں کہ وہ بیچارہ اگر واقعی زندہ ہے تو کہاں ہے کس حال میں ہے؟ اس واقعہ میں قلب غافل کے لئے سبق نہیں مگر قلب حساس اور
ر بیدار کے لئے بڑی عبرت ہے! چھوٹے ہوں یا بڑے، تخت نشین ہوں یا خاک نشین، ہر شخص کو اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنی چاہئے، دنیا کے حالات
تے بدلتے رہتے ہیں، تغیر زمانہ کی سرشت اور انقلاب دنیا کا مزاج ہے! انقلاب کی زد سے کوئی بچ بھی جائے تو "موت" سے نہیں بچ سکتا۔ یہ
ایک انقلاب اور زندگی کا سب سے بڑا سانحہ ہے، جس سے مفر نہیں! موت آتی ہے تو سارے کروفر اور ٹھاٹ باٹ دھرے کے دھرے ہی رہ جاتے ہیں!

شاہ فاروق ہوں یا بن باللہ، سکندر مرزا ہوں یا غلام محمد، جب تک یہ لوگ برسر اقتدار رہے ان کی خدمت میں گارڈ آف آنر،
سنامے اور قصیدے پیش کئے جاتے تھے! ان کی حکمت عملی، سیاست دانی، فراست، ذہانت، ہوشمندی اور معاملہ فہمی کے کیا کیا تو
تی تھیں، اخباروں اور رسالوں میں کس اہتمام و شان کے ساتھ ان کی تصویریں چھپتی تھیں، خود حکومتوں کے محکمہ جات اطلاعات یہ ڈیوٹی
ام دیتے تھے کہ باہر کے کسی ایڈیٹر، سیاح، سیاست داں اور مشہور شخصیت کا ایک حرف بھی اُن کی تعریف میں آتا تو اُسے ملک کے اخباروں میں
یاں کر کے چھپایا جاتا تاکہ عوام باخبر اور مرعوب و متاثر ہیں کہ تمہارے خداوند نعمت کی عزت و شہرت کے ڈنکے چار دانگ عالم میں بج رہے ہیں۔

خوشامدی لوگ کس کس تقریب اور حیلہ سے ان "بڑے آدمیوں" کی بارگاہوں میں باریابی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، مگر حکومت کے چھنتے اور اقتدار و اختیار سے بے دخل ہوتے ہی ان کے "مناقب" دفعۃً "مثالب" سے بدل گئے، جیسے ان سب نے طاقت کے زور سے حکومت پر غاصبانہ قبضہ جما رکھا تھا، دراصل حکمرانی اور فرماں روائی کے یہ حقدار اور اہل ہی نہ تھے، معائب اور کمزوریوں کی لمبی فہرست اور الزامات کی طویل فردِ جرم ان کے خلاف مرتب کی گئی! اور اس کے بعد منقبت و قصیدہ مدح و تعریف اور عزت و تکریم کے قافلہ کا رُخ نئے حکمرانوں کی طرف مڑ گیا، اُن کی تصویریں اُتریں اور ان کی تصویریں لگ گئیں!

حکومتوں کے انقلابات اور اتار چڑھاؤ کے واقعات یہ بتاتے ہیں کہ حکمرانی کے دور میں صاحبانِ اختیار و اقتدار کی جو تعریفیں کی جاتی ہیں، وہ کوئی خاص وزن اور اعتبار نہیں رکھتیں، یہ تمام عزتیں اور اجلال و تکریم کے مظاہرے "اضافی" ہیں، جس حاکم نے لوگوں کے منہ کی تعریفوں سے اپنی شخصیت اور مقبولیت کا اندازہ لگایا، اس نے غلطی کی! جب اختیار و اقتدار نہ رہے، اُس وقت عوام خوبیاں بیان کریں، یہ ہے وہ واقعی تعریف جو جریدۂ عالم پر نقش دوام بن جاتی ہے، خلفاء راشدین کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، ساڑھے تیرہ سو سال سے دنیا کسی وقفہ کے بغیر مسلسل ان کو خراجِ عقیدت پیش کر رہی ہے، دل اُن کی محبت اور عقیدت سے معمور ہیں، اُن کے ناموں پر نام رکھنا باعثِ سعادت و برکت سمجھا جاتا ہے! یہ وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جو اپنی تعریفیں سننا پسند نہیں کرتے تھے، ان کی مدح و منقبت کے دفتر تو ان کے بعد لکھے گئے ہیں! (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)

دنیا کے حاکموں اور فرمانرواؤں کو تاریخ پیغام دے رہی ہے ـــــ اچھے بن جاؤ، اچھے کام کرو اور دنیا سے داد و ستائش کی تمنا نہ رکھو ـــــ بس پھر تم چاہے حکومت کی کرسی پر رہو یا نہ رہو ہر حالت میں تمہیں سراہا جائے گا، مورخین کے قلم تمہیں گارڈ آف آنر دیں گے ـــ ادیبوں اور شاعروں کی زبانیں تمہیں سپاسنامے پیش کریں گی۔ اور تمہیں اچھے ناموں سے یاد کیا جائے گا!

نیکی کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

جن لوگوں کو حکومت کے نشہ نے غافل رکھا، اُن کی آنکھیں اختیارات سے بے دخل ہوتے یا مرتے وقت کھلیں، اُس وقت انہوں نے جانا کہ ہم نے کیا کیا اور دراصل کرنا کیا چاہئے تھا، مگر اب پچھتانے سے کیا ہونا تھا، ندامت و توبہ کی مہلت ختم ہو چکی تھی!

وزارت امورِ مذہبی کے بارے میں اخبارات میں خبریں آ رہی ہیں اور عوام کی زبانوں پر بھی اس کے چرچے ہیں، گزشتہ حکومتوں کے دور میں بھی کچھ مولویوں نے اس قسم کی وزارت کا مطالبہ کیا تھا، اس مطالبہ کو لوگ بھول گئے تھے مگر اب اسے ذہنوں میں تازہ کیا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس خبر میں کتنی صداقت ہے اور اربابِ اقتدار کے پیشِ نظر کیا اسکیم ہے۔

پاکستان کی تو پوری حکومت اور تمام محکموں، شعبوں اور وزارتوں پر دین کا غلبہ ہونا چاہئے کہ پاکستان درحقیقت اسی مقصد کے لئے وجود میں آیا تھا، یہ وزارتوں میں امورِ مذہبی اور غیر امورِ مذہبی کی تقسیم کیوں؟ ریاست حیدرآباد دکن میں امورِ مذہبی کا محکمہ اس لئے قائم تھا کہ وہاں کی ـــ حکومت اسلامی نہ تھی بلکہ مسلمان خانوادے کی بادشاہت تھی! اس لئے دولتِ آصفیہ میں دین و سیاست کی تفریق باقی جاتی تھی، پاکستان میں کچھ محکمے سودی کاروبار چلاتے رہیں اور جوئے اور شراب کی آمدنی وصول کرتے رہیں اور ایک محکمہ مساجد و اوقاف کی نگرانی کرتا اور موذنوں اور خطیبوں کو تنخواہیں دیتا رہے تو ایسا کرنے سے کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تقاضا پورا ہو جائے گا، اور اگر محکمہ امورِ مذہبی دین کے تقاضوں کو پورا

کرنے کی جدوجہد کرے گا، تو حکومت کے جن شعبوں اور محکموں میں دین کا غلبہ نہیں ہے اُن سے اس محکمہ کا تصادم ہوگا ـــ مگر یہ تو ہماری قیاس آرائی اور خوش خیالی ہے، اس تصادم کی نوبت کیوں آنے لگی، محکمہ امورِ مذہبی اگر قائم ہوا تو اس کے حدود عمل متعین کر دئیے جائیں گے، وہ اُن سے تجاوز کیسے کر سکتا ہے! رہے عوام تو اُن کی بے خبری کا یہ عالم ہے کہ یوم میلاد النبیؐ پر سرکاری عمارتوں کو بجلی کے قمقموں سے جگمگاتا دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ عشقِ رسولؐ اور احترامِ نبیؐ کا یہ مظاہرہ ہو رہا ہے" امورِ مذہبی" کے نام میں بے شک اُن کے لئے بہت بڑی کشش ہے، مگر جن کو اللہ تعالیٰ نے فہم اور کتاب و سنت میں بصیرت عطا فرمائی ہے اور اسلامی روایات کے حقیقی تقاضوں سے واقف ہیں وہ دین میں حشو و زوائد کی نشان دہی کرتے رہیں گے۔

کوئی شک نہیں اسرائیلی حکومت مشرقِ بعید کے لئے بہت بڑا فتنہ ہے، جس طرح یہودیت اللہ تعالیٰ کے غضب و لعنت کا دوسرا نام ہے اسی طرح یہودی حکومت بھی سطحِ ارض پر نفاق و نحوست اور دنائت کی علامت ہے، مغرب کے سامراج نے اس ناشدنی حکومت کو قائم کر دیا اور اس کی طرح پشت پناہی کی جا رہی ہے! اسرائیلی حکومت کے ارد گرد جو مسلمان ممالک ہیں اُن کے باشندے اگر مل جل کر خاک بھی ڈال دیتے تو یہ حکومت اُس کے غبار میں دفن ہو کر رہ جاتی، مگر افسوس ہے کہ یہ ملک ایک دوسرے سے بیگانے اور دگر دگر رہے اور ان کے اندرونی اختلافات نے اسرائیل کی اس گورنمنٹ کو مستحکم کرتے چلے گئے! ان ممالک میں "اخوان المسلمون" ہی تنہا ایک ایسی جماعت تھی، جس کا وجود تمام عرب ممالک کے لئے نقطۂ اتحاد کی حیثیت رکھتا تھا کہ یہ لوگ اسلام اور دینی اخوت کے سب سے بڑے مبلغ اور علمبردار تھے! "اخوان المسلمون" کی ایمانی و اخلاقی قوت اور مجاہدانہ اسپرٹ سے اسرائیلی حکومت ڈرتی تھی، اخوان نے محاذِ جنگ پر اسرائیلی فوجوں کا بڑی جانبازی، پامردی اور بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا تھا اور زک پہونچائی تھی۔ "اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت" تو اخوان کا نعرہ تھا! مگر افسوس ہے کہ ان مخلص ترین دین پسند افراد کو جس طرح مٹایا گیا ہے اور جو تھوڑے بہت بیچارے جہاں بھی باقی رہ گئے ہیں وہ جس پریشانی اور مصیبت میں مبتلا ہیں اُس پر کسی دردمند اور خدا ترس انسان کا جی خون رونے بھی ہلکا نہیں ہو سکتا! "اخوان" کی تباہی اور بربادی یہودیوں کی مسرتوں کا مقصد و تھی! اس جماعت کے مٹ جانے سے عرب ممالک میں دینی محاذ کو نقصان پہونچا ہے اُس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا! ان کی تباہی کے بعد کتنی نسلی اور قومی عصبیتیں ہیں! جنہوں نے اُبھر کر اسلامی وحدت کو مجروح کیا یہ مصیبت اس حد تک پہونچ گئی کہ فرعون جس پر قرآن لعنت بھیجتا ہے اُس کی اولاد ہونے پر فخر کیا جا رہا ہے۔

"اخوان" کے مرشدِ عام اور اس جماعت کے بانی حضرت حسن البنا شہید اور ان کے اعوان و انصار پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو کہ وہ خدا کی راہ میں سرفروشی، اخلاص، وفاداری، بےنفسی، للّٰہیت اور صبر و استقامت کے ایسے نشان قائم کر گئے جو آنے والی نسلوں کو روشنی دیں گے! ـــ (وا ولٰئک ہم المفلحون)

جس زمانے میں صدارتی انتخاب کی مہم پاکستان میں چل رہی تھی، اور محترمہ فاطمہ جناح کے طوفانی دورے ہو رہے تھے اُس وقت اور بعض بڑے لوگوں کے بیانات اخباروں میں آ رہے تھے کہ قانون و دستور کو اسلام کے مطابق بھی بنایا جا سکتا ہے یہاں تک کہ عائلی قوانین پر بھی نظرثانی ہو سکتی ہے! لیکن صدارت اور اسمبلیوں کے انتخابات کے بعد اس لہجہ میں تبدیلی پیدا ہو گئی، اب اسلام کا نام تو بہت کم لیا جاتا ہے، بااصرار ذکر "فلاحی حکومت" کا آتا ہے۔ حالانکہ پاکستان صرف فلاحی حکومت کے لئے نہیں بنا تھا، مسلم لیگ کا یہ نعرہ اور مطالبہ نہیں تھا کہ ہندوستان کے مسلمان ایک ایسا خطہ چاہتے ہیں جہاں امریکہ اور انگلستان کے باشندوں کی طرح وہ چین آرام سے رہ سکیں! گائیں بجائیں،

کھیلیں، شرابیں پئیں، سودی کاروبار کریں، جنس کی بھوک مٹائیں، مرد و زن کا بیباکانہ اختلاط ہو، فسق و فجور پر کوئی پابندی نہ ہو! اگر مسلم لیگ اس قسم کا کوئی مطالبہ لے کر اٹھتی تو اس پر "لبیک" کہنے کے بجائے مسلمان لعنت و ملامت کی بوچھار کرتے، مسلم لیگ کا مطالبہ تو یہ تھا کہ متحدہ ہندوستان کے مسلمان اپنی اکثریت کے علاقوں میں ایک ایسی حکومت چاہتے ہیں جہاں وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں! اور کتاب و سنت کی بنیادوں پر جس حکومت کا آئین مدون و متشکل ہو سکے! (مسلم لیگ کے اکابر نے اس مطالبہ کے سلسلہ میں جو تقریریں کی تھیں اور بیانات دیئے تھے اُن کا خلاصہ ہم نے بیان کر دیا ہے)

یہ مسلمانوں کے دین و ایمان کا معاملہ ہے، یہاں کسی ایک شخص یا چند آدمیوں کی پسند اور مرضی کوئی وقعت نہیں رکھتی، پاکستان کو "اسلامی حکومت" بننا ہے کہ یہی پاکستان کے قیام کا اصل مقصد ہے "اسلامی حکومت" میں "عوام کی فلاح" کا عملی تصور اس طرح شامل ہے جیسے گلاب میں خوشبو! جب "اسلامی حکومت" کا ذکر آتا ہے تو اُس میں عوام کی رفاہ و فلاح بھی لازماً شریک ہوتی ہے! ہاں! اسلام مغربی ملکوں جیسی آسودگی اور عیش و فلاح نہیں چاہتا کہ جس کے نام پر فسق و فجور، بدکاری اور حیوانی جذبات کو فروغ حاصل ہو! اگر اونچے طبقہ کے لوگ "فلاحی حکومت" (ویلفیر اسٹیٹ) بول کر "اسلامی حکومت" ہی کا قیام چاہتے ہیں تو پھر کسی اختلاف و تردید، بحث و تکرار اور آئینی احتجاج و نزاع کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، معاشرے اور حکومت کو اسلامی و اخلاقی بنانے کا کام ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر فوراً شروع ہو جانا چاہئے، عوام اس دن کے برسوں سے منتظر ہیں، سب کی آنکھیں اسی افق پر لگی ہوئی ہیں جہاں سے "اقامت دین" کا مہر جہاں تاب طلوع ہو گا!

اسلام میں کیا چیزیں "معروف" ہیں اور کیا "منکر" ہیں، یہ سب کو معلوم ہیں، ان کے لئے نہ تو کسی ادارۂ تحقیقات اسلامی کی ریسرچ کی ضرورت ہے اور نہ کسی مجلس مشورت کی رائے درکار ہے "معروف" بھی سب پر کھلے ہوئے ہیں اور "منکر" بھی ظاہر ہیں۔ معروف کو قائم کیجئے اور "منکر" کو مٹائیے! مسلم ممالک میں عنانِ حکومت اور زمامِ اقتدار انہی کو زیب دیتی ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دینے کی تڑپ اور داعیہ اپنے اندر رکھتے ہیں! اُس طاقت و اقتدار سے اللہ کی پناہ جس کے بل بوتے پر نیکیاں ماند پڑ جائیں اور برائیوں کو فروغ حاصل ہو! اور اُس قوت و اختیار پر درود و سلام جو برائیوں کو مٹانے اور نیکیوں کے قیام میں کام آئے۔

ماہر القادری

۱۰ / جولائی ۶۵ء

مولانا محمد تقی عثمانی مدرس دارالعلوم کراچی

بائبل کی تضاد بیانیاں

(حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی شہرۂ آفاق کتاب اظہار الحق سے اقتباسات)

ہندوستان پر مغربی اقتدار کے تاریک دور میں ایک زمانہ ایسا آیا تھا کہ عیسائی مشنریوں نے اپنی پوری طاقت ہندوستان کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی مہم پر صرف کر رکھی تھی۔ ایک طرف تو مسلمانوں کے سر پہ انگریز کی تلوار لٹک رہی تھی، دوسری طرف عیسائی مبلّغ ان کے دین کے خلاف زہر اگلتے پھر رہے تھے، یہ صورتِ حال انتہائی خطرناک تھی اور ہندوستان کے بعض علاقوں میں تو مسلمان دھڑا دھڑ مرتد ہو رہے تھے، لیکن تاریخ اسلام کا کوئی زمانہ ان سرفروشوں سے خالی نہیں رہا جو دین کے ناموس پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس زمانے میں بھی علمائے اسلام کی ایک مقدس جماعت کھڑی کر دی جس نے اپنی جان پر کھیل کر اس صبر آزما فتنے کا مقابلہ کیا، اور اس مقصد کے لئے اپنے جان و مال کی وہ بیش بہا قربانیاں پیش کیں جو اسلامی تاریخ میں یادگار رہیں گی۔

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ اسی جماعت کے سرخیل تھے، جنہوں نے اپنا گھر بار لٹا کر اس فتنے کا مقابلہ کیا، حق گوئی کے صلے میں بے شمار اذیتیں سہیں، طرح طرح سے ستائے گئے، یہاں تک کہ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور آج جنت المعلیٰ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قدموں میں آرام فرما ہیں۔ یہ مولانا ہی تھے جنہوں نے اکبر آباد کے شہرۂ آفاق مناظرے میں عیسائیوں کے مشہور پادری فنڈر کو شکستِ فاش دی تھی، یہ مناظرہ اپنی نوعیت کا منفرد مناظرہ تھا، پوری مسلمان دنیا میں اس کی دھوم تھی اور اس میں پادری فنڈر نے انگریز حاکموں، ججوں اور سینکڑوں مسلمان اور ہندو عوام کے سامنے بائبل میں تحریف کا اعتراف کیا تھا، اس مناظرے نے عیسائی مشنریوں کی کمر توڑ دی تھی اور اس کے بعد یہ فتنہ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکا۔

مولانا نے عیسائیت کے موضوع پر اپنی تصانیف کا جو قیمتی ذخیرہ چھوڑا ہے، ان میں سب سے زیادہ معرکۃ الآراء کتاب اظہار الحق ہے، اس کتاب میں عیسائیت کے ہر گوشہ پر جو بھرپور، باوقار اور عالمانہ تنقید کی گئی ہے شاید کسی زبان میں بھی اس کی مثال نہیں ہے، اصل کتاب عربی میں ہے، پھر اس کے فارسی، انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور گجراتی زبانوں میں ترجمے بار بار شائع ہوئے ہیں، عیسائی پادریوں نے بارہا اس کے نسخے خرید خرید کر جلائے ہیں، اور ایک مدت تک یہ کتاب جامع ازہر کے

فضا میں داخل رہی ہے، بڑے بڑے علماء نے اسے مولانا[1] سے پڑھنے کے لئے دور دراز کے سفر کئے ہیں، اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ ٹائمز آف انڈیا نے یہ لکھا تھا کہ اگر یہ کتاب دنیا میں پڑھی جاتی رہی تو روئے زمین سے عیسائیت کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

افسوس ہے کہ آج جب کہ عیسائی مشنریوں نے پھر کروٹ لی ہے، یہ کتاب نایاب ہے، اور تعجب کی بات ہے کہ چھ زبانوں میں چھپنے کے باوجود اس کا کوئی اردو ترجمہ آج تک شائع نہیں ہو سکا[1]، آج جب کوئی مسلمان عیسائیت پر قلم اٹھاتا ہے تو اس جیسی کتابوں کی نایابی اس کی ہمت توڑ دیتی ہے۔

اس ضرورت کے پیش نظر میرے استاذ مکرم حضرت مولانا اکبر علی صاحب مدرس دار العلوم کراچی نے اپنے ضعف اور تدریسی مصروفیات کے باوجود اس کتاب کا اردو ترجمہ کیا ہے، جو بحمد اللہ مکمل ہو چکا ہے اور اب راقم الحروف اس کی ترتیب و تہذیب اور اس پر تشریحی حواشی (FOOT NOTES) لکھنے کا کام کر رہا ہے۔ جلد اول کتابت کے ابتدائی مراحل میں ہے، اور جلد دوم پر کام جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

یہ کتاب ایک مقدمے اور چھ بابوں پر مشتمل ہے، پہلے باب میں "بائبل" کا مطلب، اس کی ایک ایک کتاب کا تاریخی جائزہ بائبل کی تضاد بیانیاں اور اس کی علمی، اخلاقی و تاریخی غلطیاں واضح کی گئی ہیں، دوسرے باب میں ناقابل انکار دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ بائبل میں طرح طرح سے تحریف ہوئی ہے، تیسرے باب میں مسئلہ نسخ پر سیر حاصل گفتگو ہے چوتھے باب میں عقیدۂ تثلیث کو عقل اور نقل کی روشنی میں باطل قرار دیا گیا ہے، پانچویں باب میں قرآن کریم کی حقانیت اور چھٹے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر بے نظیر بحث ہے۔

ذیل میں احقر اس کتاب کے پہلے باب سے کچھ اقتباسات اپنے لکھے ہوئے حواشی سمیت قارئین فاران کی خدمت میں پیش کر رہا ہے جس سے ایک مقصد تو اس کتاب کا تعارف کرانا ہے، دوسرے یہ پیش نظر ہے کہ قارئین مختصر سے وقت میں بائبل سے متعلق بڑی اچھی معلومات حاصل کر سکیں گے، تیسرے اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی خدمت میں اسے اس غرض سے پیش کر رہا ہوں کہ وہ اس پر ایک تنقیدی نظر ڈال کر دیکھیں کہ اسے اردو کے لباس میں پیش کرنے کے لئے اور کس قسم کے کام کی ضرورت ہے! ابھی کتاب کے طبع ہونے میں کچھ دیر ہے، اگر جلد ہی احقر کو کچھ مفید مشورے مل گئے تو اس کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو سکے گا، اس لئے بطور خاص اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مجھے اپنے مفید مشوروں سے مطلع فرمائیں۔ ممنون ہوں گا[2]۔

---

[1] ایک عرصہ پہلے اس کا اردو ترجمہ ہوا تھا، مگر نامعلوم وجوہ کی بناء پر چھپ نہ سکا، اس کا مسودہ سورت کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ۱۲۔ تقی

[2] احقر سے مراسلت کے لئے دار العلوم کراچی ۱۴ کا پتہ کافی ہے۔ ۱۲

بائبل کیا ہے؟

عیسائی حضرات اپنی مقدس کتابوں کی دو قسمیں کرتے ہیں، ایک وہ کتابیں جن کی نسبت ان کا دعویٰ ہے کہ یہ ان پیغمبروں کے واسطہ سے ہمارے پاس پہونچی ہیں جو عیسٰی علیہ السلام سے پہلے گذر چکے ہیں، دوسری وہ کتابیں جن کی نسبت وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عیسٰی علیہ السلام کے بعد الہام کے ذریعہ لکھی گئی ہیں، پہلی قسم کی کتابوں کے مجموعے کو عہد عتیق[1] اور دوسری قسم کے مجموعہ کو عہد جدید کہتے ہیں اور دونوں کے مجموعہ کا نام بائبل[2] رکھتے ہیں، یہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی "کتاب" کے ہیں، پھر دونوں عہدوں کی قسموں میں سے ایک وہ قسم ہے جس کی صحت پر تمام پچھلے عیسائی متفق ہیں، دوسری قسم وہ ہے جس کی صحت میں اختلاف ہے۔

عہد قدیم کی پہلی قسم

اس مجموعہ میں ۳۸ کتابیں ہیں، (۱) سفر[3] تکوین[4] اس کا دوسرا نام سفر الخلیقہ بھی ہے، (۲) سفر خروج[5] (۳) سفر احبار[6] (۴) سفر عدد[7] (۵) سفر استثناء[8]، ان پانچوں کتابوں کے مجموعے کا نام "توریت" ہے جو عبرانی لفظ ہے اور جس کے معنی "شریعت" اور "تعلیم" کے ہیں، کبھی کبھی مجازاً یہ لفظ عہد عتیق کے مجموعے پر بھی بولا جاتا ہے۔

---

[1] آج کل اسے پرانا عہد نامہ (OLD TESTAMENT) اور عہد جدید کو نیا عہد نامہ (NEW TESTAMENT) کہتے ہیں

[2] BIBLE [3] یہ لفظ سین کے کسرہ اور فا کے سکون کے ساتھ "سِفر" ہے جس کے معنی عربی زبان میں صحیفہ اور کتاب کے ہیں۔

[4] اردو میں اس کا نام "پیدائش" اور انگریزی میں (GENESIS) ہے اس میں زمین و آسمان کی تخلیق سے لے کر حضرت آدم حضرت نوح۔ حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے کی تاریخ ہے اور یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات پر ختم ہو گئی ہے، اس کے ۵۰ باب ہیں، [5] اردو میں اس کا نام "خروج" ہی ہے اور انگریزی میں (EXODUS) کہتے ہیں، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر ان کی دعوتِ اسلام، فرعون کے غرق اور کوہ سینا پر اللہ سے ہم کلامی کے واقعات اور توریت کے احکام مذکور ہیں، اور یہ بنی اسرائیل کے صحرائے سینا میں خیمہ زن ہونے کے واقعات پر ختم ہو گیا ہے۔ اسے "خروج" اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کا واقعہ مذکور ہے ——— اس میں ۴۰ باب ہیں۔

[6] اردو میں اس کا نام بھی "احبار" ہے اور انگریزی میں (LEQ, ricus) اس میں وہ احکام مذکور ہیں جو بنی اسرائیل کے صحرائے سینا میں خیمہ زن ہونے کے دوران ـ انہیں دئے گئے اس کے ۲۷ باب ہیں۔

[7] اسے اردو میں "گنتی" کہتے ہیں اور انگریزی میں (NUMBERS) اس میں بنی اسرائیل کی مردم شماری سے لے کر ان کے کنعان جانے سے پہلے تک کے احوال اور وہ احکام مذکور ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریائے اردن کے کنارے پر دئے گئے اس کے کل ۳۶ باب ہیں۔

[8] اسے اردو میں بھی "استثناء" اور انگریزی میں (DEUT. RONOMY) کہا جاتا ہے اور اس میں وہ احکام اور واقعات مذکور ہیں جو "گنتی" کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات تک پیش آئے اس کے کل ۳۴ باب ہیں۔

(۶) کتاب یوشع بن نون (۷) کتاب[1] القضاۃ (۸) کتاب[2] راعوت (۹) سفر سموئیل اول (۱۰) کتاب سموئیل ثانی (۱۱) سفر الملوک الاول۔ (۱۲) سفر الملوک الثانی (۱۳) السفر الاول من اخبار الایام (۱۴) السفر الثانی من اخبار الایام (۱۵) السفر الاول لعزرا (۱۶) السفر الثانی لعزرا اس کا دوسرا نام سفر نحمیاہ بھی ہے (۱۷) کتاب ایوب (۱۸) زبور (۱۹) امثال سلیمان (۲۰) کتاب[3] الجامعہ (۲۱) کتاب نشید الانشاد (۲۲) کتاب اشعیاء۔ (۲۳) کتاب یرمیاہ (۲۴) مراثی یرمیاہ (۲۵) کتاب حزقیال (۲۶) کتاب دانیال (۲۷) کتاب یوشع (۲۸) کتاب یوایل (۲۹) کتاب عاموس (۳۰) کتاب عبدیاہ (۳۱) کتاب یونان (۳۲) کتاب میخا (۳۳) کتاب ناحوم (۳۴) کتاب حبقوق (۳۵) صفنیا (۳۶) کتاب حجی (۳۷) کتاب زکریا (۳۸) کتاب ملاخیا۔ یہ ملاخیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ۴۲۰ سال قبل گذرے ہیں۔ یہ تمام ۳۸ کتابیں جمہور قدما مسیحیین کے نزدیک معتمد اور معتبر اور تسلیم شدہ تھیں۔ البتہ سامری[4] فرقہ کے نزدیک صرف سات کتابیں مسلم ہیں، وہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں، اور کتاب یوشع بن نون اور کتاب القضاۃ، ان کی توریت کا نسخہ عام یہودیوں کی توریت کے نسخے کے خلاف ہے[5]۔

---

[1] اسے اردو میں بھی "قضاۃ" اور انگریزی میں (JUDGES) کہا گیا ہے، اس میں حضرت یوشع علیہ السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کی حالت زار کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جس میں ان کا کوئی بادشاہ نہ تھا، ان کی بت پرستی اور بدکاریوں کی بنا پر بار بار اللہ تعالیٰ ان پر کوئی اجنبی بادشاہ مقرر کر دیتا جو ان پر ظلم کرتا، پھر جب وہ خدا سے توبہ و فریاد کرتے تو ان کے لئے کوئی قائد بھیجا جاتا جو انہیں اس مصیبت سے نجات دلاتا، مگر وہ پھر بدکاریاں کرتے اور کوئی بادشاہ ان پر مسلط ہو جاتا۔ اور چونکہ اس زمانہ میں جو قائد آتا اسے وہ قاضی کہتے تھے اس لئے اس کتاب کا نام قضاۃ ہے اور اس میں ۲۱ باب ہیں۔ ۱۲

[2] اس کا نام اردو میں "روت" اور انگریزی میں (RUTH) ہے اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کے دادا عوبید کی والدہ جناب "راعوت" کے احوال مذکور ہیں جو ایک موآبی خاتون تھیں، بیت اللحم میں آگئیں اور وہاں بوعز سے شادی کی جن سے عوبید، ان سے یشی اور ان سے داؤد علیہ السلام پیدا ہوئے، اس میں چار باب ہیں ۱۲

[3] اسے آج کل اردو میں "واعظ" اور انگریزی میں (ECCLESIASTES) کہا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام جامعہ یا واعظ تھا اور اس کتاب میں اس کی نصیحتیں مذکور ہیں، اس کے کل ۱۲ باب ہیں۔ ۱۲

[4] اس کا نام اردو میں "غزل الغزلات" اور انگریزی میں (SONG OF SOLOMON) ہے اور یہ بقول نصاریٰ ان گیتوں کا مجموعہ ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے لکھے تھے، اور جن کا ذکر کتاب السلاطین اول میں ہے کہ: "اور اس نے تین ہزار مثلیں کہیں اور اس کے ایک ہزار پانچ گیت تھے" (۴:۳۲) اس کے آٹھ باب ہیں ۱۲

[5] سامری یہودیوں کا ایک فرقہ، یہ فلسطین کے شہر سامرہ (SAMARIE) کی طرف منسوب ہیں جو تباہ ہونے کے بعد دوبارہ نابلس کے نام سے مشہور ہوا، یہاں کے باشندے عام یہودیوں سے بنیادی طور پر دو امور میں اختلاف کرتے ہیں، ایک مسلمہ کتب کی تعداد جیسا کہ مصنف نے بیان فرمایا ہے، دوسرے عبادت گاہ، یعنی وہ عام یہودیوں کے برخلاف یروشلم کے بجائے کوہ جرزیم پر عبادت کرتے ہیں، جو نابلس کے جنوب میں ایک پہاڑ ہے اور وہاں چوتھی صدی قبل مسیح میں منسّی نے (جس کا ذکر عزرا ۱۳:۲۸ میں ہے) ایک ہیکل تعمیر کیا تھا۔ ۱۲

[6] یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ پروٹسٹنٹ فرقے کے نزدیک عہد قدیم کی کل کتابیں انتالیس ہیں، حالانکہ مشہور مؤرخ یوسیفس تقریباً سنہ ۱۰۰ء میں لکھتا ہے کہ:
"ہمارے پاس صرف بائیس کتابیں ہیں جن میں زمانۂ ماضی کے حالات مندرج ہیں اور الہامی تسلیم کی جاتی ہیں" (بحوالہ ہماری کتب مقدسہ از بی۔ ڈی علی ص ۷۴) عیسائی حضرات تین کو ایک تو قرار دیتے ہی تھے۔ اب انتالیس کو بائیس بھی قرار دینے لگے اور اس مقصد کے لئے عجیب عجیب تاویلیں کرتے ہیں کہ: انبیاء صغیر کی بارہ کتب کو ایک، عزرا اور نحمیاہ کو ملا کر ایک، روت اور قضاۃ کو ملا کر ایک اور یرمیاہ اور نوحہ کو ملا کر ایک شمار کیا جائے تو بائیس ہو جاتے ہیں۔ اس مضحکہ خیز حرکت پر ہم ان حضرات کے لئے ہدایت کی دعا کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں؟

عہد عتیق کی دوسری قسم یعنی وہ کتابیں جن کی صحت میں اختلاف ہے، یہ کل ۹ کتابیں ہیں ۱—
(۱) کتاب استیر (۲) کتاب باروخ (۳) کتاب دانیال کا ایک جزو (۴) کتاب طوبیا (۵) کتاب یہودیت (۶)
اب دانش (۷) کلیسائی پند و نصائح (۸) کتاب المقابیین الاول (۹) کتاب المقابیین الثانی۔

"عہد جدید کی کتابیں یہ کل بیس کتابیں ہیں"

ہ کتابیں جن کی صحت پر اتفاق ہے یہ کل بیس کتابیں ہیں (۱) انجیل متی (۲) انجیل مرقس (۳) انجیل لوقا (۴) انجیل یوحنا ان چاروں
کو اناجیل اربعہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور انجیل کا لفظ ان ہی چاروں کے ساتھ مخصوص ہے، اور
ہی کبھی مجازاً تمام عہد جدید کی کتابوں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے، یہ لفظ معرب ہے، اصل یونانی لفظ "انکلیون" تھا جس کے معنی بشارت
تعلیم کے ہیں (۵) کتاب اعمال حواریین (۶) پولس کا خط رومیوں کی جانب (۷) پولس کا خط قورنتیوں والوں کی جانب (۸) دوسرا خط انہی کی طرف
(۹) پولس کا خط غلاطیہ والوں کی طرف (۱۰) پولس کا خط افسس والوں کی طرف (۱۱) پولس کا خط فلپیوں کی طرف (۱۲) پولس کا خط قولاسائس
ئوں کی طرف (۱۳) اس کا پہلا خط تسالونیکی والوں کی طرف (۱۴) پولس کا دوسرا خط ان کی جانب (۱۵) پولس کا رسالہ تیموتاوس کی طرف (۱۶)
ں کا دوسرا رسالہ ان کی طرف (۱۷) پولس کا رسالہ تیطوس کی طرف (۱۸) پولس کا خط فلیمون کی جانب (۱۹) پطرس کا پہلا رسالہ (۲۰) یوحنا کا پہلا رسالہ
ائے بعض جملوں کے۔

ہ مکابیوں کی دوسری کتاب میں چند سالوں کی تاریخ اور نہایت بیہودہ قسم کی روایات ہیں، ان کتابوں کے علاوہ پہلا اور دوسرا الیسدرلیس، تین بچوں کا گیت، بعض
ساڑہ دعا، اور منسی کی دعا اور پانچ کتابیں اور بھی مختلف فیہ ہیں اور ان ہی چودہ کتابوں کے مجموعے کو "اپاکریفا" (APOCRYPHA) کہا جاتا ہے، اور فرقہ پروٹسٹنٹ
ہیں الہامی تسلیم نہیں کرتا، ۱۲ سے متی حواری کی طرف منسوب ہے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواریوں میں سے ایک ہیں، آپ گفرناحوم (CAPHARNAUM)
ں جو فلسطین کا ایک شہر تھا، عشر وصول کرنے پر مامور تھے، آپ کو شہید کیا گیا، مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کب؟ اور کہاں؟ اناجیل اربعہ میں سے ایک انجیل آپ ہی کی طرف
سوب ہے اور اسے عیسائی حضرات قدیم ترین انجیل مانتے ہیں، اگرچہ وہ درحقیقت ان کی ہرگز نہیں، ۱۲ ۔ سے مرقس (میم اور قاف پر پیش ہے) یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام
حواری جناب پطرس کے شاگرد ہیں، عیسائی حضرات کہتے ہیں کہ اسکندریہ کا کلیسا انہوں نے ہی قائم کیا تھا، انہیں ۶۸ء میں قتل کیا گیا، ان کی انجیل سابقہ
نبیاء کے ان بیانوں سے شروع ہوتی ہے جو حضرت مسیح کی تشریف آوری پر دیئے گئے اور حضرت عیسیٰؑ کے عروج آسمانی پر ختم ہو جاتی ہے، اس میں ۱۶ ابواب ہیں
نگریزی میں اسے (MARK) کہا جاتا ہے، سے "لوقا" (LUKE) اپنے زمانے میں طبیب تھے، پولس کے سفروں میں اس کے ساتھ جیسا کہ
فلسیوں کے نام ۴:۱۴ اور اعمال ۱۶) سے معلوم ہوتا ہے تقریباً ۷۰ء میں انتقال ہوا، ان کی انجیل حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کے واقعہ سے شروع
رتی ہے، اور ۲۴ بابوں میں عروج آسمانی تک کے واقعات و احکام درج ہیں ۱۲ ۔ سے "یوحنا حلقہ مقربہ ہے (JOHN) حبیب بن زبدی حضرت
عیسیٰؑ کے بارہ حواریوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، اناجیل اربعہ میں سے چوتھی انجیل آپ ہی سے منسوب ہے اور عہد نامہ جدیدہ کے مجموعہ میں تین خط اور ایک
تاب مکاشفہ بھی آپ کی طرف منسوب کی گئی ہے، آپ نے عمر بھر یہودیوں کے ظلم و ستم برداشت کئے، اور پہلی صدی عیسوی ہی میں آپ کا انتقال ہوا۔
یاد رہے کہ عیسائی حضرات حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بھی یوحنا کہتے ہیں مگر اس کے ساتھ "المعمدان" کی قید ہے، یہاں وہ مراد نہیں ۔ ان
ن انجیل میں حضرت یحییٰ علیہ السلام (جن کو بائبل میں (JOHN) کہا ہے) کی تشریف آوری کے بعد کے حالات سے حضرت عیسیٰؑ کے عروج آسمانی
ک کے حالات درج ہیں اور اس کے ۲۱ باب ہیں ۔ ۱۲ ت

عہد جدید کی دوسری قسم

یعنی جن کی صحت میں اختلاف ہے۔ یہ کل سات کتابیں ہیں اور بعض جیسے یوحنا کے پہلے خط کے (۱) پولس کا خط جو عبرانیوں کی جانب ہے (۲) پطرس کا دوسرا رسالہ (۳) یوحنا کا دوسرا رسالہ (۴) یوحنا کا تیسرا رسالہ (۵) یعقوب کا رسالہ (۶) یہودا کا رسالہ (۷) مشاہدات یوحنا،

کتابوں کی تحقیق کیلئے عیسائی علماء کی مجلسیں

اس کے بعد ناظرین کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ۳۲۵ء میں بادشاہ قسطنطین[1] کے حکم سے عیسائی علماء کا ایک عظیم الشان اجتماع شہر نائس میں ہوا، تاکہ مشکوک کتابوں کے بارہ میں مشورہ کے ذریعہ کوئی بات طے ہو جائے، بڑی تحقیق اور مشورہ کے بعد ان علماء نے یہ فیصلہ کیا کہ کتاب یہودیت واجب التسلیم ہے، اس کے علاوہ باقی کتابوں کو بدستور مشکوک رکھا، یہ بات اس مقدمہ سے خوب واضح ہو جاتی ہے جو جیروم[2] نے کتاب یہودیت پر لکھا ہے،

اس کے بعد ایک دوسری مجلس ۳۶۴ء میں منعقد ہوئی جو لوڈیشیا کی مجلس کے نام سے مشہور ہے، اس مجلس کے علماء نے بھی پہلی مجلس کے علماء کا فیصلہ کتاب یہودیت کی نسبت برقرار رکھا، اور اس فیصلہ میں اس پر سات دیگر کتابوں کا اضافہ کر کے ان کو واجب التسلیم قرار دیا، کتاب آستیر، یعقوب کا رسالہ، پطرس کا دوسرا رسالہ، یوحنا کا دوسرا اور تیسرا رسالہ، یہوداہ کا رسالہ، پولس کا رسالہ عبرانیوں کی جانب، اس مجلس نے اپنے اس فیصلہ کو عام پیغام کے ذریعہ مؤکد کر دیا اور کتاب مشاہدات ان دونوں جلسوں میں بدستور خارج اور مشکوک ہی باقی رہی۔

اس کے بعد ۳۹۷ء میں ایک اور بڑی مجلس جو کارتھیج کی مجلس کے نام سے مشہور ہے، منعقد ہوئی اس مجلس کے شرکاء میں عیسائیوں کا مشہور فاضل آگسٹائن اور ۱۲۶ دوسرے مشہور علماء تھے، اس مجلس کے اراکین نے پہلی دونوں مجالس کے فیصلہ کو بدستور باقی رکھتے ہوئے اس پر حسب ذیل کتابوں کا اضافہ کیا (۱) کتاب دانش (۲) کتاب طوبیاہ (۳) کتاب باروخ (۴) کتاب کلیسائی پند و نصائح (۵، ۶) مکابین کی دونوں کتابیں (۷) کتاب مشاہدات یوحنا، مگر اس جلسہ کے شرکاء نے کتاب باروخ کو کتاب یرمیاہ کا تقریباً جزو قرار دیا، اس لئے کہ باروخ علیہ السلام ارمیاہ علیہ السلام کے نائب اور خلیفہ تھے۔ اس لئے ان لوگوں نے اسماء کتب کی فہرست میں کتاب باروخ کا نام علیحدہ نہیں لکھا، اس کے بعد تین مجلسیں منعقد ہوئیں، مجلس ٹرلو اور مجلس فلورنس اور مجلس ٹرنٹ ان تینوں مجالس کے علماء نے بھی پہلی کارتھیج کی مجلس کے فیصلہ کو قائم اور باقی رکھا، صرف آخر کی دو مجلسوں نے کتاب باروخ کا نام ان کتابوں کے اسماء کی فہرست میں علیحدہ لکھ دیا۔

ان اسلاف کے فیصلوں سے فرقہ پروٹسٹنٹ کی بغاوت

ان کتابوں کی یہ پوزیشن سنہ ۱۳۰۰ء تک بدستور قائم رہی، یہاں تک کہ فرقہ پروٹسٹنٹ نمودار ہوا جنہوں نے اپنے بزرگوں کے فیصلہ کے خلاف کتاب باروخ، کتاب طوبیا، کتاب یہودیت اور کتاب دانش کتاب پند کلیسا اور مکابین کی دونوں کتابوں کے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ یہ سب واجب الرد اور غیر مسلم ہیں، اسی طرح اس فرقہ نے کتاب آستر کے بعض ابواب کی نسبت اسلاف کے فیصلہ کو رد کر دیا اور بعض بابوں کے سلسلہ میں

---

[1] یہ قسطنطین اول (CONSTANTINE I) ہے جس کے نام پر بیزنطیہ کو قسطنطنیہ کہا گیا ہے، کیونکہ اس نے اسے اپنا پایۂ تخت بنایا تھا وفات ۳۳۷ء ۱۲ ت

[2] (ST. JEROME) عیسائیوں کا مشہور عالم اور فاضل سفر ۳۴۰ء میں پیدا ہوا، اسی نے بائبل کا لاطینی میں ترجمہ کیا اور بائبل کے علوم میں معروف ہوا اس سلسلہ میں اس کی بہت سی تصانیف ہیں ۴۲۰ء میں انتقال ہوا یاد رہے کہ یہ جان ہس کا شاگرد جیروم متوفی ۱۴۱۶ء نہیں ہے۔ تقی

ان کے فیصلہ کو تسلیم کیا، کیونکہ یہ کتاب ۱۶ ابواب پر مشتمل ہے جس میں کے شروع کے ۹ ابواب اور ۱۰ باب کی تین آیتوں کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ یہ واجب التسلیم ہیں اور باقی ۱۶ ابواب واجب الرد ہیں اس انکار اور رد کے سلسلہ میں انہوں نے چھ دلائل پیش کئے ۔

(۱) یہ کتابیں اپنی اصل زبانوں عبرانی اور کسدی میں جھوٹی ہیں، اور اس وقت ان زبانوں میں یہ کتابیں موجود بھی نہیں ہیں (۲) یہودی ان کتابوں کو الہامی تسلیم نہیں کرتے (۳) تمام عیسائیوں نے ان کتابوں کو تسلیم نہیں کیا ہے (۴) جیروم کہتا ہے کہ یہ کتابیں دینی مسائل کی تقریر و اثبات کے لئے کافی نہیں ہیں (۵) کلوس نے تصریح کی ہے کہ یہ کتابیں پڑھی جاتی ہیں، لیکن ہر مقام پر نہیں، (۶) یوسی بیس نے کتاب رابع کے باب ۲۲ میں تصریح کی ہے کہ یہ کتابیں محرف ہو چکی ہیں، خصوصاً مقابین کی دوسری کتاب)

ملاحظہ کیجئے دلیل ملہ، ملہ، ملہ کو کہ ان لوگوں نے کس طرح اپنے اسلاف اور بزرگوں کی اس بد دیانتی کا دعویٰ کیا کہ ہزاروں اشخاص کا ان کتابوں کے واجب التسلیم ہونے پر اتفاق کرنا غلط تھا، جن کی اصل اور ماخذ ناپید ہو چکے ہیں ان کے صرف تراجم باقی ہیں اور جو یہودیوں کے نزدیک محرف ہو چکی ہیں بالخصوص مکابیین کی دوسری کتاب، اب بتایئے کہ ایسی حالت میں اپنے کسی مخالف کے حق میں ان کے اجماع یا اتفاق کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے ؟ اس کے برعکس فرقہ کیتھولک ملے آج تک ان کتابوں کو اپنے اسلاف کی اتباع میں تسلیم کرتے آئے ہیں ۔

بائبل اختلافات سے لبریز ہے :-

بائیس برس یا بیالیس برس ؟ کتاب سلاطین ثانی باب ۸ آیت ۲۶ میں کہا گیا ہے کہ " اخزیاہ بائیس برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا اور کتاب تواریخ ثانی کے باب ۲۲ آیت ۲ میں یوں ہے: " اخزیاہ بیالیس برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا " دیکھیے ان دونوں عبارتوں میں کس قدر سخت اختلاف ہے، دوسرا قول یقینی طور پر غلط ہے، چنانچہ ان کے مفسرین نے اس کا اعتراف کیا ہے اور غلط کیونکر نہ ہو ؟ جب کہ اس کے باپ یہورام کی عمر بوقت وفات کل چالیس سال[1] تھی اور اخزیاہ اپنے باپ کی وفات کے بعد فوراً تخت نشین ہوا ہے، جیسا کہ گذشتہ باب سے معلوم ہوتا ہے، ایسی صورت میں اگر دوسرے قول کو غلط نہ مانا جائے تو بیٹے کا اپنے باپ سے دو سال بڑا ہونا لازم آتا ہے ۔

چالیس ہزار یا چار ہزار کتاب سلاطین اول باب ۴ آیت ۲۶ میں اس طرح ہے کہ :

" اور سلیمان کے ہاں اس کے رتھوں کے لئے چالیس ہزار تھان اور بارہ ہزار سوار تھے "

اور کتاب تواریخ ثانی کے باب ۹ آیت ۲۵ میں یوں ہے کہ :

" اور سلیمان کے پاس گھوڑوں کے لئے چار ہزار تھان اور بارہ ہزار سوار تھے "

فارسی اور اردو ترجموں میں بھی اسی طرح ہے، البتہ عربی ترجمہ کے مترجم نے کتاب تواریخ کی عبارت کو بدل ڈالا یعنی چار کے لفظ کو چالیس سے تبدیل[2] کر دیا آدم کلارک مفسر نے کتاب سلاطین کی عبارت کے ذیل میں تراجم اور شروح کا یہ اختلاف نقل کیا ہے، پھر کہتا ہے کہ " بہتر یہی ہے کہ ہم ان اختلافات کے پیش نظر تعداد کے بیان میں تحریف واقع ہونے کا اعتراف کر لیں ۔ "

---

[1] باب ۲۱ میں ہے کہ " وہ بتیس برس کا تھا جب سلطنت کرنے لگا اور اس نے آٹھ برس یروشلم میں سلطنت کی " [2] ہمارے پاس عربی ترجمے مطبوعہ ۱۸۶۵ء میں چار ہزار ہی کا لفظ ہے، " وکان لسلیمان اربعۃ آلاف مذود " انگریزی ترجمہ میں بھی ایسا ہی ہے ۔ ۱۲ تقی

لٹو، بیل یا ککڑیاں کتاب سلاطین اول کے باب ۷ آیت ۲۴ میں اور کتاب تواریخ ثانی کے باب ۴ آیت ۳ کے درمیان اختلاف موجود ہے ۔ آدم کلارک اپنی تفسیر جلد ۲ کتاب تواریخ کی عبارت کی شرح کے ذیل میں لکھتا ہے کہ : بڑے بڑے محققین کی رائے یہ ہے کہ اس موقعہ پر کتاب سلاطین کی عبارت کو تسلیم کر لیا جائے البتہ ممکن ہے کہ لفظ "بقریم" "بقیم" کی جگہ استعمال ہو گیا ہو حالانکہ "بقریم" کے معنی بیل کے ہیں اور "بقیم" کے معنی لٹو ہیں ۔ بہرحال اس عالم نے کتاب تواریخ میں تحریف واقع ہونے کا اعتراف کر لیا ہے اس لئے اس کے نزدیک کتاب تواریخ کی عبارت غلط ہوئی ہنری واسکاٹ کی تفسیر کے جامعین کہتے ہیں کہ "یہاں پر حروف بدل جانے کی وجہ سے فرق پیدا ہو گیا ہے" ۔

بیس یا پچیس؟ اسی طرح کتاب تواریخ ثانی کے باب ۲۸ آیت ۱ میں اس طرح ہے کہ :

"آخز بیس برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا اور اس نے سولہ برس یروشلم میں سلطنت کی"

اور باب ۲۹ میں ہے کہ : "حزقیاہ پچیس برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا"

یہاں پر بھی ایک عبارت یقیناً غلط ہے اور بظاہر پہلی عبارت ہی غلط معلوم ہوتی ہے ۔

بعشا کا یہوداہ پر حملہ کتاب سلاطین اول باب ۱۵ آیت ۳۳ میں ہے کہ : "شاہ یہوداہ آسا کے تیسرے سال سے اخیاہ کا بیٹا بعشا ترضہ میں سارے اسرائیل پر بادشاہی کرنے لگا اور اس نے چوبیس برس سلطنت کی "

مگر کتاب تواریخ ثانی باب ۱۶ آیت ۱ میں یوں ہے کہ :

"آسا کی سلطنت کے چھتیسویں برس اسرائیل کا بادشاہ بعشا یہوداہ پر چڑھ آیا" ۔

ان دونوں عبارتوں میں اختلاف ہے' ان میں سے ایک یقینی طور پر غلط ہے ، کیونکہ پہلی عبارت کے بموجب بعشا آسا کے چھبیسویں سال میں وفات پا[2] چکا ہے ، اور آسا کی سلطنت کے چھتیسویں سال میں اس کی وفات کو دس سال گذر چکے ہیں تو پھر اس سال اس کا یہوداہ پر حملہ کرنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے ؟ ہنری واسکاٹ کی تفسیر کے جامعین نے کتاب تواریخ کی عبارت کے ذیل میں کہا ہے کہ :

"ظاہر یہ ہے کہ یہ غلط ہے"

آشر جو ایک بڑے پائے کا مسیحی عالم ہے ، کہتا ہے کہ یہ سال یعنی ۳۶ آسا کی سلطنت کا سال نہیں ہے ، بلکہ بادشاہت کی تقسیم کا سال ہے جو یربعام کے عہد میں ہوئی تھی ، بہرحال ان علماء نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ کتاب تواریخ کی عبارت غلط ہے یا تو ۲۶ کی جگہ ۳۶ کا لفظ لکھا گیا ہے یا لفظ تقسیم بادشاہت کے بجائے آسا کی بادشاہت لکھا گیا ۔

---

[1] ان دونوں مقامات پر حضرت سلیمان علیہ السلام کے بنائے ہوئے ایک حوض کا تذکرہ ہے اور اس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کتاب سلاطین میں ہے " اور اس کے کنارے کے نیچے گرداگرد دس دس ہاتھ تک لٹو تھے' جو اسے یعنی بڑے حوض کو گھیرے ہوئے تھے' یہ لٹو دو قطاروں میں تھے اور جب وہ ڈھالا گیا تب ہی یہ بھی ڈھالے گئے" (۲۴) ، اور کتاب تواریخ میں ہے ! "اور اس کے نیچے بیلوں کی صورتیں اس کے گرداگرد دس ہاتھ تک تھیں' اور اس بڑے حوض کو چاروں طرف گھیرے ہوئے تھیں' یہ بیل دو قطاروں میں تھے اور اسی کے ساتھ ڈھالے گئے تھے" (۴:۳) یہ الفاظ اردو اور انگریزی ترجمے کے ہیں ؛ عربی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۶۵ء کتاب تواریخ میں لٹو اور بیلوں کے بجائے ککڑیوں کا تذکرہ ہے : "وشبہ القثاء تحتہ مستدیرة" ملاحظہ فرمایئے کہاں لٹو ؟ کہاں بیل ! اور ککڑیاں ! [2] کیونکہ اس نے چوبیس برس سلطنت کی ، اور آسا کے بادشاہ ہونے کے تیسرے سال بعد وہ بیٹھا تھا ، اس طرح ۲۶ سال ہوئے ۔ اور سلاطین اول ہی میں ہے کہ بعشا اپنے باپ دادا کے ساتھ سو گیا (۱۶:۶) اور شاہ یہوداہ آسا کے چھبیسویں سال سے بعشا کا بیٹا ایلہ ترضہ میں بنی اسرائیل پر سلطنت کرنے لگا (۱۶:۸)

...بل کی قید سے رہا ہونے والوں کی تعداد

جو شخص کتاب عزرا کے باب ۲ کا مقابلہ کتاب نحمیاہ کے باب ۷ سے کرے گا، اکثر مقامات پر دونوں میں بڑا سخت اختلافات پائے گا اور اگر ہم اختلاف سے قطع نظر بھی کر لیں تب بھی ایک غلطی ...وں میں پائی جاتی ہے وہ یہ کہ دونوں حاصل جمع میں متفق ہیں اور کہتے ہیں کہ جو لوگ بابل کی قید سے رہائی پانے کے بعد وہاں سے اورشلیم آئے ہیں، ان کی ...داد بیالیس ہزار تین سو ساٹھ افراد تھی، لیکن اگر ہم جمع کرتے ہیں تو یہ تعداد حاصل نہیں ہوتی نہ عزرا میں نہ نحمیاہ میں بلکہ پہلی میں حاصل جمع انتیس ہزار آٹھ سو ...ٹھارہ اور دوسری میں اکتیس ہزار نوسو اسی ہوتی ہے اور تعجب یہ ہے کہ یہ متفقہ میزان مورخین کی تصریح کے مطابق غلط ہے۔

...سیفس اپنی تاریخ کی کتاب ۱۱ باب ۱ میں کہتا ہے کہ "جو لوگ بابل سے اورشلیم آئے — ان کی مردم شماری بیالیس ہزار چار سو باسٹھ افراد ...ی: ہنری واسکاٹ کی تفسیر کے جامعین عزرا کی عبارت کی شرح کے ذیل میں کہتے ہیں کہ "اس باب میں اور کتاب نحمیاہ کے باب ۷ میں کاتبوں کی غلطی ...ے بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے، اور جب انگریزی ترجمہ کی تالیف ہوئی تو اس کے بہت حصہ کی دوسرے نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد تصحیح کر دی گئی ...باقی میں یونانی ترجمہ عبرانی متن کی شرح میں متعین ہو گی۔"

...رفرمائیں کہ یہ حالت ان کی مقدس کتابوں کی ہے۔ یہ لوگ تصحیح کے پردے میں ایسی زبردست تحریف کرتے ہیں کہ صدیوں سے تسلیم شدہ چیز ایک ہی آن ...خس و خاشاک کی طرح بہ جاتی ہے، اس کے باوجود اغلاط موجود ہیں۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ یہ کتابیں اصل ہی سے غلط ہیں، تصحیح کرنے والوں اس کے سوا کوئی تصور نہیں کہ وہ بے چارے جب عاجز ہو گئے تو انہوں نے ان بے گناہ کاتبوں کے سر ڈال دیا، جن کو اس سازش کی خبر بھی نہیں، ...ب جو صاحب ان دو بابوں میں غور کریں گے تو اغلاط اور اختلافات کی تعداد بیس سے بھی زیادہ دستیاب ہونگی، آئندہ کا حال خدا جانے کہ وہ کس طرح ...ـــریف کریں گے؟

...للہ یا شیطان؟

سفر سموئیل ثانی باب ۲۴ آیت ۱ میں یوں ہے کہ:

"اس کے بعد خداوند کا غصہ اسرائیل پر بھڑکا اور اس نے داؤد کے دل کو ان کے خلاف یہ کہہ کر ابھارا کہ جاکر اسرائیل اور یہوداہ کو گن۔"

...: تواریخ اول باب ۲۱ آیت ۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال ڈالنے والا شیطان تھا اور چونکہ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق خدا خالق شر نہیں ہے اس لئے ...یا سخت اختلاف لازم آگیا۔

...، اس مقام پر دونوں بابوں میں ناموں کے اختلافات کو چھوڑ کر صرف گنتی کے بیس اختلافات موجود ہیں جن میں سے بعض ہم نمونہ کے طور پر ذیل کے نقشے میں پیش کرتے ہیں، اس ...ب بابل کی قید سے رہائی پانے والوں کی مردم شماری کی گئی ہے۔

...یت نمبر	الفاظ کتاب عزرا ۲	آیت نمبر	کتاب نحمیاہ ۷
۶	بنی پخت ..... دو ہزار آٹھ سو بارہ	۱۱	بنی پختوآب ..... دو ہزار آٹھ سو اٹھارہ
۲	بنی زتو نو سو پینتالیس	۱۳	بنی زتو آٹھ سو پینتالیس
۱۲	بنی عزجاد ایک ہزار دو سو بائیس	۱۷	بنی عزجاد دو ہزار تین سو بائیس
۱۵	بنی عدین چار سو چون	۲۰	بنی عدین چھ سو پچپن
۱۹	بنی حاشوم دو سو تیئیس	۲۲	بنی حاشوم تین سو اٹھائیس
۲۸	بیت ایل اور عی کے لوگ دو سو تیئیس	۳۲	بیت ایل اور عی کے لوگ ایک سو تیئیس

ولادت مسیح کے بعد حضرت مریمؑ کہاں رہیں

متی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے والدین مسیح کی پیدائش کے بعد بیت اللحم ہی میں رہتے تھے، اور اس کے بعد ایک کلام سے واضح ہوتا ہے کہ بیت اللحم کی قیام کی مدت تقریباً دو سال تھی اور چونکہ وہاں آتش پرستوں کا تسلط ہوگیا تو ان کے والدین مصر چلے گئے اور ھیرودیسؑ کی زندگی مصر ہی میں رہتے رہے، اس کے مرنے کے بعد واپس لوٹے تو ناصرہ میں قیام کیا اس کے برعکس لوقاؑ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کے والدین ان کی پیدائش کے بعد زچگی کے دن پورے کرتے ہی اورشلیم چلے گئے تھے، اور قربانی ادا کر کے ناصرہ چلے آئے تھے، اور وہاں دونوں کا مستقل قیام رہا، البتہ سال بھر میں صرف عید کے موقع پر اورشلیم چلے جاتے تھے، ہاں مسیح علیہ السلام نے ضرور ساں باپ کی اجازت و اطلاع کے بغیر عمر کے بارہویں سال میں اورشلیم میں تین روز قیام کیا۔ اس کے بیان کے مطابق آتش پرستوں کے بیت اللحم میں آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر ان کی آمد کو تسلیم ہی کیا جائے تو وہ ناصرہ میں ہو سکتی ہے کیونکہ راستہ میں ان کی آمد بہت ہی بعید ہے یہ بھی ممکن نہیں کہ ان کے والدین مصر آگئے ہوں اور وہاں ہی ان کا قیام رہا ہو چونکہ اس کلام میں تصریح موجود ہے کہ یوسف نے یہوداہ کے علاقہ سے کبھی باہر قدم ہی نہیں نکالا نہ مصر کی جانب دوسری طرف۔

لاٹھی ساتھ لینے کی ممانعت

انجیل متی کے باب ۱۰ آیت اور انجیل لوقا کے باب ۹ آیت ۳ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسیح نے جب حواریوں کو روانہ کیا تو ان کو اپنے ساتھ لاٹھی رکھنے سے منع کیاؑ، انجیل مرقس باب ۶ آیت ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح نے ان کو لاٹھی لینے کی اجازت دی تھیؑ۔

حضرت یحییٰؑ نے حضرت عیسیٰؑ کو کب پہچانا؟

انجیل متی کے باب ۳ میں کہا گیا ہے کہ جب عیسیٰؑ یحییٰؑ کے پاس اصطباغؑ کے لئے آئے، تو یحییٰ نے ان کو یہ کہہ کر منع کیا کہ میں خود آپ سے بپتسمہ لینے کا محتاج ہوں اور آپ میرے پاس آتے ہیں، پھر عیسیٰؑ نے ان سے اصطباغ لیا، اور پانی میں چلے، پھر آپ پر کبوتر کی شکل میں خدا کی روح نازل ہوئی اور انجیل یوحنا کے باب ۱ میں لکھا ہےؑ کہ:

> "یوحناؑ نے یہ گواہی دی کہ میں نے روح کو کبوتر کی طرح آسمان سے اترتے دیکھا ہے اور وہ اس پر ٹھہر گیا اور میں تو اسے پہچانتا نہ تھا مگر جس نے مجھے پانی کے بپتسمہ دینے کو بھیجا اسی نے مجھ سے کہا کہ جس پر تو روح کو اترتے ٹھہرتے دیکھے وہی روح القدس سے بپتسمہ دینے والا ہے"

ۓ پس وہ اٹھا اور بچے اور اس کی ماں کو لے کر اسرائیل کے ملک میں آگیا (متی ۲۱؍۲) ۲ھ ھیرودیس (HEROD THE GREAT) یہوداہ کا بادشاہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت بنی اسرائیل پر حکومت کرتا تھا۔ ۱۲ ۳ھ اور پھر جب موسیٰ کی شریعت کے موافق ان کے پاک ہونے کے دن پورے ہوگئے تو وہ اس کو یروشلم میں لائے تا کہ خداوند کے آگے حاضر کریں (لوقا ۲۲؍۲) ۴ھ اور جب وہ خداوند کی شریعت کے مطابق سب کچھ کر چکے تو گلیل میں اپنے شہر ناصرہ کو پھر گئے (۳۹؍۲) اس کے ماں باپ ہر برس عید فسح پر یروشلم جایا کرتے تھے (۴۱؍۲) ۵ھ راستہ کیلئے نہ جھولی نہ دو دو کرتے، نہ جوتیاں نہ لاٹھی (۱۰؍۲) ۶ھ راستے کے لئے لاٹھی کے سوا کچھ نہ لو (مرقس ۸؍۶) ۷ھ اصطباغ (BAPTISM) عیسائیوں کی ایک رسم ہے کہ وقت کا بزرگ ترین شخص لوگوں کو پانی میں یا کسی رنگ میں نہلاتا ہے عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اس طرح گناہ دھلتے ہیں کوئی شخص نیا نیا عیسائی ہو تو اس کو سب سے پہلے اصطباغ کیا جاتا ہے اردو بائبل میں اس عمل کو "بپتسمہ" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ۱۲ ۸ھ آیت ۳۲، ۳۳ ۹ھ یعنی حضرت یحییٰ علیہ السلام ——— (مق کا حاشیہ) ۱۰ھ یہ ایک یہودی کاہن تھا اپنے عہد کے بادشاہوں کا منظور نظر اس نے یونانی زبان میں اپنی قوم کی تاریخ لکھی تھی ۱۱ھ اس وقت بھی انگریزی ترجمے میں تقریباً نہیں لفظ ... موجود ہیں تحقیق فرمائیے کہ بہت سے ... ؟ ۱۲ھ ایک شخص نے اسرائیل کے خلاف اللہ کی دائمی کو پکارا کہ اسرائیل کا شمار کرے؟

نجیل متی کے باب ۱۱ میں یوں ہے کہ "اور یوحنا نے قید خانہ میں مسیح کے کاموں کا حال سن کر اپنے شاگردوں کی معرفت پچھوا بھیجا کہ آنے والا تو ہی ہے،
دوسرے کی راہ دیکھیں؟"
عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ عیسیٰ کو نزول روح کے پہلے سے جانتے تھے[۱] اس کے برعکس دوسری عبارت یہ کہتی ہے کہ نزول روح سے پہلے بالکل ناواقف
بعد میں پہچانا تیسری عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول روح کے بعد بھی ان کو نہیں پہچانا[۲]
نف میزان الحق نے اپنی کتاب حل الاشکال کے صفحہ ۱۳۲ پر پہلی دونوں عبارتوں کی ایسی توجیہ کی ہے جس کی تردید استفسار کے مصنف نے کامل طور
دی ہے اور یہ تردید مجھ تک پہونچی، اسی طرح میں نے بھی اس کی تردید اپنی کتاب ازالۃ الشکوک میں کی ہے[۳]۔ چونکہ توجیہ کمزور تھی اور اس سے متی کی
نوں عبارتوں کا اختلاف دور نہیں ہوتا تھا، اس لئے میں نے تطویل کے اندیشہ سے یہاں ترک کر دی ہے۔

طرس کا انکار

چاروں انجیل والے پطرس کے انکار[۴] کے سلسلہ میں آٹھ لحاظ سے اختلاف کر رہے ہیں۔
(۱) متی[۵] اور مرقس[۶] کی روایت کے مطابق پطرس کو حضرت عیسیٰ کا شاگرد قرار دینے والی دو لڑکیاں تھیں اور کچھ پاس کھڑے
ئے مرد۔ اور لوقا کی روایت کے مطابق[۷] ایک باندی اور دو مرد تھے،
اپنی باندی کے سوال کرتے وقت متی کی روایت کے مطابق پطرس مکان کے صحن[۸] میں تھے، اور لوقا کی روایت کے مطابق مکان کے درمیان میں تھے
مرقس کے بیان کے موافق مکان کے نیچے کے حصے میں[۹] اور یوحنا کے قول کے مطابق[۱۰] کے اندر۔
) پطرس سے کیا سوال کیا گیا؟ اس میں چاروں انجیلوں کا اختلاف پایا جاتا ہے[۱۱]۔
) مرغ کا بولنا متی اور لوقا و یوحنا کی روایت کے مطابق صرف ایک مرتبہ ہوا یعنی جب کہ پطرس تین مرتبہ انکار کر چکا اور مرقس کے بیان کے مطابق تین
بہ، ایک دفعہ پہلے انکار کے بعد اور دو مرتبہ دوبارہ انکار کے بعد،
) متی اور لوقا لکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پطرس سے کہا تھا کہ مرغ کے بانگ دینے سے پہلے تین بار میرا انکار کرے گا اور مرقس کہتا ہے کہ عیسیٰ
السلام نے کہا تھا کہ تو مرغ کے دو مرتبہ بولنے سے پہلے تین بار میرا انکار کرے گا۔

کیونکہ آپ نے بپتسمہ دینے سے اسی بنا پر انکار کیا۔ [۲] اسی لئے شاگردوں کو بھیجا ۱۲۔ [۳] ص ۳۸۲ ج ۱ اردو، اس موضوع پر مصنف نے بڑی قیمتی بحث کی ہے شائقین
مطالعہ کریں ۱۲ [۴] حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے (بروایت انجیل) گرفتار ہونے سے ایک روز پہلے رات کو پطرس سے کہا تھا کہ تم مرغ کے اذان دینے سے پہلے
مرتبہ مجھے پہچاننے سے انکار کرو گے، چنانچہ جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو گرفتار کر لیا تو پطرس ان کے پیچھے پیچھے گئے اور تین یہودیوں نے انہیں
ن بار آگ میں دیکھ کر کہا کہ یہ بھی ان کا ساتھی ہے، مگر پطرس نے ہر بار حضرت عیسیٰ کا ساتھی ہونے اور آپ کو پہچاننے سے انکار کیا اتنے میں مرغ بول پڑا
انہیں حضرت عیسیٰ کی کہی ہوئی بات یاد آئی، مصنف نے یہاں اسی واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے ۱۲۔ [۵] متی ۲۶: ۶۹-۷۲ [۶] مرقس ۱۴: ۶۶-۷۲ میں مذکور ہے
ایک لونڈی نے دو مرتبہ یہ بات کہی، پھر آخر میں پاس کھڑے ہونے والوں نے بھی اس کی تصدیق کی [۷] ۲۲: ۵۶-۶۰ [۸] آیت ۶۹ [۹] آیت
۶۶ [۱۰] یوحنا ۱۸: ۱۶ [۱۱] یوحنا میں ہے کہ "کیا تو بھی اس شخص کے شاگردوں میں سے ہے؟" (۱۸: ۱۷) لوقا میں ہے کہ لونڈی نے
ال نہیں کیا اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ "یہ بھی اس کے ساتھ تھا" مرقس اور متی کا بیان ہے کہ خود پطرس سے خطاب کر کے کہا: "تو بھی
یسوع گلیلی کے ساتھ تھا"

(۶) پطرس کا جواب اس باندی کو جس نے پہلے سوال کیا تھا متی کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ "میں نہیں جانتا کہ تو کیا کہتی ہے" اور یوحنا کی روایت کے مطابق صرف "میں نہیں ہوں" اور مرقس کی روایت کے بموجب "میں نے تو نہ جانا اور نہ سمجھتا ہوں کہ تو کیا کہتی ہے!" اور لوقا کے بیان کے موافق "اے عورت میں اس کو نہیں جانتا"

(۷) متی کی روایت کے مطابق پطرس نے دوسرے سوال کا جواب قسم کھا کر اس طرح دیا: "میں اس آدمی کو نہیں جانتا" اور یوحنا کی روایت کے مطابق اس کا قول یہ ہے کہ: "میں نہیں ہوں" اور مرقس کی روایت کے مطابق فقط انکار، اور لوقا کی روایت کے مطابق "میں نہیں ہوں"

(۸) کھڑے ہوئے لوگ مرقس کے بیان کے موافق سوال کے وقت گھر سے باہر تھے، اور لوقا کے کہنے کے موافق وہ صحن کے درمیان میں تھے۔

مسیح علیہ السلام کے ساتھ ڈاکوؤں کا سلوک

متی اور مرقس ان ڈاکوؤں کے بارے میں جن کو حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ سولی دی گئی کہتے ہیں کہ "وہ ڈاکو بھی جو اس کے ساتھ مصلوب ہوئے تھے اس پر یوں طعن کرتے تھے" لیکن لوقا[۱] کا بیان یہ ہے کہ ایک نے مسیح کو بے شرم کہا اور دوسرے نے ان سے چلا کر کہا کہ: "اے یسوع! جب تو اپنی بادشاہی میں آئے تو مجھے یاد کیجیو۔[۲]" پھر مسیح نے اس کو جواب دیا کہ آج ہی تو میرے ساتھ فردوس میں ہوگا۔ ہندی ترجموں مطبوعہ ۱۸۳۹ء ۱۸۴۰ء ۱۸۴۴ء ۱۸۳۶ء کے مترجموں نے متی اور مرقس کی عبارت میں تحریف کر ڈالی اور اختلاف دور کرنے کے لئے "تثنیہ" کو مفرد سے بدل ڈالا[۳] یہ بات ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے جس کی چھوٹنے کی امید نہیں ہے۔

حضرت عیسیٰ کا دوبارہ زندہ ہونا

متی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے[۴] کہ مریم مگدلینی اور دوسری مریم[۵] جب قبر کے پاس پہنچیں تو خدا کا فرشتہ نازل ہوا اور پتھر قبر سے لڑھک گیا، اور وہ اس پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ تم فوراً مت اور جلدی جا کر کہو[۶] جاؤ، اور مرقس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں اور سلومی جب قبر کے پاس پہونچیں تو دیکھا کہ پتھر لڑھکا ہوا ہے اور جب قبر میں داخل ہوتے تو ایک سفید پوش جوان کو قبر میں داہنے جانب بیٹھا دیکھا[۷] اور لوقا کا بیان یہ ہے کہ: "یہ جب پہونچیں تو پتھر کو لڑھکا ہوا پایا، پھر وہ قبر میں داخل ہو گئیں مگر مسیح کا جسم نہ پایا تو حیران ہو گئیں، اچانک اپنے پاس دو شخصوں کو دیکھا کہ سفید کپڑے پہنے ہوئے کھڑے ہیں۔

پولس کے عیسائی ہونے کا واقعہ

کتاب الاعمال کے باب ۹، باب ۲۲ اور باب ۲۶ میں پولس کے ایمان لانے کا حال لکھا ہے[۸] اور تینوں ابواب میں کئی لحاظ سے اختلاف ہے ہم اس کتاب میں صرف تین وجوہ نقل کرتے ہیں، البتہ اپنی کتاب ازالۃ الشکوک میں ہم نے دس وجوہ لکھی ہیں۔

۱؎ متی ۲۷/۴۴ و مرقس ۱۵/۳۲۔ ۲؎ ۲۳/۴۲-۴۳ ۳؎ صرف یہی نہیں! اس سے پہلے یہ بھی ہے کہ جب آپ کو لعن طعن کیا تو "دوسرے نے اسے جھڑک کر جواب دیا کہ کیا تو خدا سے بھی نہیں ڈرتا حالانکہ اسی سزا میں گرفتار ہے؟" (۲۳/۴۰) ۴؎ مگر موجودہ اردو ترجموں میں تثنیہ ہی کا صیغہ ہے۔ ۲۸ متی ۵؎ یہ دونوں انجیل کی روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیرو تھیں۔ اور آپ کی قبر زیارت کے لئے آئی تھیں، ۱۲، [illegible]

۶؎ انہیں متی ۲۷/۵۶ میں یوسیس کی ماں کہا گیا ہے اور لوقا ۱۶ - ۱ میں یعقوب کی ماں ۱۲ ۷؎ پورے الفاظ "تم نہ ڈرو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم یسوع کو ڈھونڈتی ہو جو مصلوب ہوا تھا وہ یہاں نہیں ہے کیونکہ مردوں میں سے جی اٹھا ہے" (۲۸/۵) ۸؎ پہلے پھر اس نے وہی بات کہی جو متی ۲۸ سے ہم نے نقل کی

۹؎ لوقا ۲۴/۴ ۱۰؎ اس اختلاف کو بخوبی سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ بائبل کے مطابق پولس جو یہودی تھا عیسائیوں کی دشمنی میں دمشق جا رہا تھا راستے میں ایک نور اس پر چمکا اور اسے عیسائی ہونے کی ترغیب میں حضرت مسیح کی آواز سنائی دی۔

(۱) یہ کہ باب ۹ میں یوں[1] ہے کہ "جو آدمی اس کے ہمراہ تھے وہ خاموش کھڑے رہ گئے کیونکہ آواز تو سنتے تھے مگر کسی کو دیکھتے نہ تھے اور باب ۲۲ میں یوں[2] ہے کہ "اور میرے ساتھیوں نے نور تو دیکھا، لیکن جو مجھ سے بولتا تھا اس کی آواز نہ سنی"

دیکھئے پہلی عبارت میں "آواز تو سنتے تھے" اور دوسری میں "آواز نہ سنی" دونوں کس قدر مختلف ہیں!

(۲) دوسرے باب ۹ میں اس طرح کہا گیا ہے کہ "اس سے خدا نے کہا کہ: اٹھ اور شہر میں جا اور جو تجھے کرنا چاہئے وہ تجھ سے کہا جائے گا اور باب ۲۲ میں بھی ہے کہ "خداوند نے مجھ سے کہا کہ اٹھ کر دمشق میں جا، جو کچھ تیرے کرنے کیلئے مقرر ہوا ہے وہاں تجھ سے سب کہا جائے گا۔

لیکن باب ۲۶ میں اس طرح ہے کہ:

"اٹھ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کیونکہ میں اس لئے تجھ پر ظاہر ہوا ہوں کہ تجھے ان چیزوں کا بھی خادم اور گواہ مقرر کروں جن کی گواہی کے لئے میں تجھے اس امت اور غیر قوموں سے بچاتا رہوں گا جن کے پاس تجھے اس لئے بھیجتا ہوں کہ تو ان کی آنکھیں کھول دیگا کہ اندھیرے سے روشنی کی طرف اور شیطان کے اختیار سے خدا کی طرف رجوع لائیں اور مجھ پر ایمان لانے کے باعث گناہوں کی معافی اور مقدسوں میں شریک ہو کر میراث پائیں"

دیکھئے پہلے دونوں بابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پولس کے ذمہ جو کام تھا اس کی تفصیل و توضیح کو شہر میں پہونچنے پر موقوف رکھا گیا تھا اور تیسری عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ آواز سننے کے مقام پر ہی اس کو بیان کر دیا گیا، پہلی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اس کے ساتھ تھے وہ خاموش کھڑے ہو گئے، اور تیسری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین پر گر پڑے[3] اور دوسری عبارت کھڑے رہنے اور گرنے کے معاملہ میں خاموش ہے۔

حضرت یحییٰ کی گرفتاری کا سبب

انجیل مرقس باب ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیرودیس[4] یحییٰ علیہ السلام کی نیکی کا معتقد اور ان سے بہت خوش تھا۔ ان کا وعظ بھی سنتا تھا اس نے ان پر جو کچھ بھی ظلم کیا وہ محض ہیرودیاس[5] کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے، لیکن اس کے برعکس لوقا کی انجیل باب ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے صرف ہیرودیاس کی رضا جوئی کی خاطر یحییٰ پر ظلم نہیں کیا بلکہ اپنی خوشنودی بھی اس میں شامل تھی، کیونکہ وہ یحییٰ سے اپنی بدکاریوں کی بنا پر نالاں اور ناراض[6] تھا۔

بارہ[12] حواریوں کے نام

متی و مرقس اور لوقا تینوں انجیل ان گیارہ حواریوں کے نام میں اتفاق رائے رکھتے ہیں یعنی پطرس ۲۔ اندریاس ۳۔ یعقوب بن زبدی ۴۔ یوحنا ۵۔ فیلپس ۶۔ برتلمائی ۷۔ توما ۸۔ متی ۹۔ یعقوب بن حلفئی ۱۰۔ شمعون قنانی ۱۱۔ یہوداہ اسکریوتی، لیکن بارہویں حواری کے نام میں سب کا اختلاف ہے، متی کا بیان ہے کہ اس کا نام لباؔس ہے اور لقب تدّی تھا مرقس تداؔس بیان کرتا ہے، لوقا کہتا ہے کہ وہ یہوداہ ہے یعقوب کا بھائی۔

---

[1] آیت ۷ [2] آیت ۹ [3] "جب ہم سب گر پڑے تو میں نے عبرانی زبان میں یہ آواز سنی" (اعمال ۲۶/۱۴) [4] ہیرودیس یوحنا کو راستباز اور مقدس آدمی جان کر اس سے ڈرتا اور اسے بچائے رکھتا تھا اور اس کی باتیں سن کر حیران رہ جاتا تھا مگر سنتا خوشی سے تھا (۶/۲۰) [5] ہیرودیس کی بیوی جو پہلے اس کی بھائی کی تھی اس سے شادی کرنے پر حضرت یحییٰ علیہ السلام نے ہیرودیس کو منع کیا تھا جس پر ہیرودیس نے آپ کو گرفتار کرا دیا (دیکھئے مرقس ۶/۱۷) [6] اپنے بھائی فلپس کی بیوی۔ ہیرودیس کے سبب سے اور ان سب بدیوں کے باعث جو ہیرودیس نے کی تھیں (۳/۱۹) [7] عربی اور انگریزی ترجموں میں ایسا ہی ہے مگر اردو ترجمے میں صرف "تدّی" مذکور [illegible]

اعظم الحوارین یا شیطان

متی نے اپنی انجیل کے باب ۱۶ میں نقل کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پطرس کو اعظم الحوا قرار دیا ہے، اس طرح کہ ان سے فرمایا: "میں بھی تجھ سے کہتا ہوں کہ تو پطرس ہے اور میں اس پتھ اپنی کلیسیا بناؤں گا اور عالم ارواح کے دروازے اس پر غالب نہ آئیں گے میں آسمان کی بادشاہی کی کنجیاں تجھے دوں گا اور جو کچھ تو زمین پر باندھے گا وہ آسمان پر بندھے گا اور جو کچھ زمین پر کھولے گا وہ آسمان پر کھلے گا۔" پھر اسی باب[1] میں آگے پطرس ہی کے حق میں حضرت عیسیٰ کا قول اس طرح نقل کیا ہے: "اے شیطان! میرے سامنے سے دور ہو تو میرے لئے ٹھوکر کا باعث ہے، کیونکہ تو خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں کا خیال رکھتا ہے" علماء پروٹسٹنٹ نے اپنے رسالوں میں قدیم عیسائیوں کے جو اقوال پطرس کی مذمت میں نقل کئے ہیں، منجملہ اس کے یوحنا اپنی تفسیر متی میں تصریح کی ہے کہ پطرس میں تکبر کی بیماری تھی۔ اور شدید مخالفت کی، وہ بہت کم عقل انسان تھا۔

اگسٹائن کہتا ہے کہ: یہ شخص ثابت قدم اور پختہ نہیں تھا، کبھی تصدیق کرتا تھا اور کبھی شک کرنے لگتا، غور کیجئے کہ جو شخص ان صفات کے موصوف ہو کیا وہ آسمانوں کی کنجیوں کا مالک ہو سکتا ہے! اور کیا کوئی شیطان ایسا بھی ممکن ہے کہ جس پر جہنم کے دروازے قابو نہ پاسکیں

انجیر کے سوکھنے کا واقعہ

متی کے باب ۲۱[2] میں حضرت عیسیٰ کے متعلق نقل کیا ہے کہ:

"اور راہ کے کنارے انجیر کا ایک درخت دیکھ کر اس کے پاس گیا اور پتوں کے سوا اس میں کچھ نہ پاکر اس سے کہا کہ آئندہ تجھ میں کبھی پھل نہ لگے اور انجیر کا درخت اسی دم سوکھ گیا، شاگردوں نے یہ دیکھ کر تعجب کیا اور کہا یہ انجیر کا درخت کیونکر ایک دم میں سوکھ گیا، پھر حضرت مسیح نے انہیں جواب دیا"

اس کے برعکس انجیل مرقس باب ۱۱ میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

"اور وہ دور سے انجیر کا ایک درخت جس میں پتے تھے دیکھ کر گیا کہ شاید اس میں کچھ پائے، مگر جب اس کے پاس پہونچا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا، کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا اس نے اس سے کہا کہ آئندہ کوئی تجھ سے کبھی پھل نہ کھائے اور اس کے شاگردوں نے سنا۔"

اس کے بعد مذکور ہے کہ آپ یروشلم تشریف لے گئے، اور جب شام ہوئی تو شہر سے باہر تشریف لے گئے پھر صبح کے وقت جب آپ کا گذر دوبارہ ادھر سے ہوا تو اس انجیر[3] کے درخت کو جڑ تک سوکھا ہوا دیکھا، پطرس کو وہ بات یاد آئی۔ اور اس سے کہنے لگا "اے ربی! دیکھ یہ انجیر کا درخت جس پر لعنت کی تھی سوکھ گیا ہے" اس پر حضرت مسیح نے جواب دیا، غور فرمایئے کہ دونوں عبارتوں میں کتنا شدید اختلاف ہے، پھر اختلاف کے علاوہ دوسری اور بھی ہے وہ یہ کہ شرعی حیثیت سے عیسیٰؑ کو یہ حق کب حاصل تھا کہ اس درخت کا پھل بغیر اس کے مالک کی اجازت کے کھائیں؟ اور درخت کو بددعا دینا جس سے سراسر مالک کا نقصان مقصود ہے یقیناً عقل کے خلاف ہے اور یہ بات بھی بعید از عقل ہے کہ بغیر موسم میں درخت سے پھل کی توقع کی جائے اور نہ ہونے پر اس غریب پر غصہ کیا جائے، بلکہ شان اعجاز کا مقتضی تو اس موقع پر یہ تھا کہ درخت کے حق میں ایسی دعا کی جاتی کہ وہ فوراً پھلدار ہو جاتا اور پھر مالک کی اجازت سے آپ بھی اس کو کھاتے اور مالک کا بھی فائدہ ہوتا۔

---

[1] آیت ۱۸ و ۱۹ [2] چنانچہ رومن کیتھولک فرقہ پطرس کو تمام حواریوں میں افضل قرار دیتا ہے اور پروٹسٹنٹ اسے تسلیم نہیں کرتا۔

[3] آیت ۲۳ [4] ۱۸ تا ۲۰ [5] آیت ۱۳ و ۱۴۔

یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ مسیح خدا نہ تھے، اس لئے کہ اگر خدا ہوتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ درخت پر پھل نہیں ہے اور نہ یہ پھل کا موسم ہے
.آپ اس پر غضبناک ہوتے،

حضرت مسیح کے سر پر عطر ڈالنے کا واقعہ

جس شخص نے بھی اس عورت کا واقعہ[1] جس نے مسیح پر خوشبو کی شیشی الٹ دی تھی انجیل متی کے باب ۲۶ میں اور انجیل مرقس کے باب ۱۴ میں اور انجیل یوحنا کے باب ۱۲ میں
ا ہوگا اس کو چھ قسم کے اختلاف نظر آئیں گے۔

(۱) مرقس[2] نے تصریح کی ہے کہ یہ واقعہ فسح[3] سے دو روز قبل کا[4] ہے، یوحنا کا بیان ہے کہ ۶[5] روز قبل کا ہے، متی عید[6] سے قبل کی مدت بیان کرنے سے خاموش ہے۔

(۲) مرقس اور متی دونوں اس واقعہ کا محل وقوع شمعون ابرص کا گھر بیان کرتے ہیں اور یوحنا اس کی جگہ مریم[7] کا مکان ذکر کرتا ہے۔

(۳) ... متی اور[8] مرقس خوشبو کا مسیح کے سر پر ڈالنا ذکر کرتے ہیں اور یوحنا پاؤں[9] کا ذکر کرتا ہے۔

(۴) مرقس کا بیان ہے کہ معترضین حاضرین میں سے کچھ لوگ تھے[10] اور متی کہتا ہے کہ اعتراض کرنے والے خود مسیح کے شاگرد تھے اور یوحنا کے نزدیک معترض یہودا[11] تھا۔

(۵) یوحنا خوشبو کی قیمت ۳۰۰ دینار بتاتا ہے اور مرقس نے مبالغہ کرتے ہوئے تین سو سے زائد مقدار بیان کی ہے، متی قیمت کو گول مول کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ بیش قیمت تھا۔

(۶) تینوں راوی عیسیٰ علیہ السلام کا قول مختلف نقل کرتے ہیں۔

متعدد قصوں پر اس کو محمول کرنا نہایت بعید ہے، کیونکہ یہ بات بہت ہی بعید ہے کہ ہر مرتبہ خوشبو لگانے والی عورت ہی ہو، اور ہر وقت کھانے

---

[1] یہ واقعہ انجیل متی کی رو سے مختصراً یہ ہے کہ عید سے دو روز قبل حضرت مسیح بیت عنیاہ میں کھانا کھا رہے تھے کہ ایک عورت نے نہایت ہی قیمتی عطر لا کر آپ کے سر میں ڈال دیا جس پر حواری خفا ہوئے کہ خواہ مخواہ ایک قیمتی عطر ضائع کیا گیا ورنہ غریبوں کے کام آسکتا تھا حضرت مسیح نے سن کر انہیں تنبیہ کی کہ غریبا تو ہمیشہ تمہارے پاس ہیں میں ہمیشہ تمہارے پاس نہ رہوں گا۔ ۱۲ [2] نیز متی نے بھی تصریح کی ہے (آیت ۲) [3] عید فسح PASSOVER یہودیوں کا مذہبی تہوار ہے جو ماہ نیسان (اپریل) کی چودھویں تاریخ کو منایا جاتا ہے اور در حقیقت یہ بنی اسرائیل کے مصریوں سے نجات پانے کی یادگار تھی۔ چونکہ اسی تاریخ میں موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے تھے، (فسح) دنبے کو کہتے ہیں، اور چونکہ اس دن میں ایک دنبہ ذبح کیا جاتا تھا اس لئے اسے عید فسح کہتے ہیں اس عید کو منانے کے تفصیلی احکام خروج ۱۲/۱۵ احبار ۲۳/۵ اور گنتی ۲۸/۱۶-۲۵ میں دیکھے جا سکتے ہیں ۱۲ تقی

[4] مرقس ۱۴/۱، [5] پھر یسوع عید فسح سے چھ روز پہلے بیت عنیاہ میں آیا، (یوحنا ۱۲/۱)

[6] لیکن ہمارے پاس سب ترجموں میں اس نے دو دن پہلے کی مدت بیان کی ہے (۲۶/۲) شاید مصنف کے نسخہ میں یہ عبارت نہ ہو۔

[7] بائبل میں اگرچہ لعزر کا مکان مذکور ہے مگر چونکہ وہ مریم کا بھائی تھا اس لئے اس کے گھر کو مریم کا گھر بھی کہہ سکتے ہیں ۱۲

[8] متی ۲۶/۷ مرقس ۱۴/۳، [9] یسوع کے پاؤں پر ڈالا (یوحنا ۱۲/۳)

[10] بعض اپنے دل میں خفا ہو کر کہنے لگے" (۱۴/۴) [11] یعنی اسکریوتی (۱۲/۴)

وقت ہی یہ صورت پیش آتے اور ہر قصہ میں دعوت طعام کی ہی شکل ہو؟ ہر مرتبہ ہر موقع پر معترضوں نے بالخصوص شاگردوں نے دوبارہ اعتراض کیا ہو، حالانکہ یہ لوگ پہلی مرتبہ تھوڑے دن قبل عیسٰی سے اس عورت کے فعل کی درستی اور اچھائی سن چکے تھے اور یہ کہ ہر واقعہ میں اس خوشبو کی قیمت ۳۰۰ دینار یا اس سے کچھ زیادہ ہی ہو اس کے علاوہ عیسٰی کی دو مرتبہ عورت کے فعل اسراف کی تصویب کرنا گویا ۶۰۰ دینار سے زیادہ کی فضول خرچی کو صحیح کہنا خود اسراف ہے، سچی بات یہ ہے کہ واقعہ ایک ہی ہے اور یہ اختلاف انجیل کے ناقلوں کی عادت کے مطابق ہے۔

عشائے ربانی کا واقعہ

جو شخص لوقا کی انجیل کے باب ۲۲ کا مقابلہ متی کی انجیل کے باب ۲۶ سے اور مرقس کی انجیل کے باب ۱۴ سے عشاء ربانی[1] کے حال کے بیان میں کرے گا تو اس کو دو اختلاف نظر آئیں گے۔ لوقا دو پیالے کا ذکر کرتا ہے ایک کھانے کے وقت دوسرا اس کے بعد[2]۔ اور متی و مرقس صرف ایک کا ذکر کرتے ہیں، غالباً متی اور مرقس کا بیان درست ہے اور لوقا کا غلط ہے ورنہ کیتھولک والوں پر خصوصیت کے ساتھ بڑا اشکال پڑے گا، اس لئے کہ ان کو اس بات کا اقرار ہے کہ روٹی اور شراب پورے مسیح کی ذات میں منتقل ہو جاتے ہیں اب اگر لوقا کا بیان درست مان لیا جائے تو لازم آتا ہے کہ ہر پیالہ کامل مسیح بن گیا، اس طرح تو روٹی اور شراب سے تین کامل مسیحوں کا وجود ہونا لازم آئے گا لہٰذا پہلے مسیح کے ساتھ مل کر کل چار مسیح ہو جائیں گے۔

اس کے علاوہ عیسائیوں کے خلاف یہ جرم عائد ہوتا ہے کہ انہوں نے اس رسم[3] کو کیوں ترک کر دیا، اور ایک ہی پر اکتفا کیوں کر لیا؟

(۲) دوسرے یہ کہ لوقا کی عبارت بتاتی ہے کہ عیسٰی کا جسم شاگردوں کی جانب سے قربان ہو گیا[4]۔ مرقس کی روایت واضح کرتی ہے کہ عیسٰی

---

[1] عشاء ربانی (LORDS SUPPER) یا (EUCHARIST) عیسائیوں کی مشہور رسم ہے جس کی اصل بقول اناجیل یہ ہے کہ گرفتاری کی ایک رات پہلے حضرت عیسٰی اپنے حواریوں کے ساتھ رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ آپ نے پیالہ لے کر برکت کی دعا کی، یا شکر ادا کیا اور فرمایا کہ اسے آپس میں بانٹ لو، پھر روٹی لے کر اس پر بھی برکت کی دعا فرمائی اور یہ کہہ کر انہیں دی کہ: یہ میرا بدن ہے جو تمہارے واسطے دیا جاتا ہے میری یادگار کے لئے یہی کیا کرو۔ اس کے بعد عیسائیوں میں یہ رسم چل پڑی کہ وہ ایک پیالہ میں انگور کا رس لے کر پیتے ہیں اور شکر کرتے ہیں اور روٹی توڑ کر تقسیم کرتے ہیں، پھر پروٹسٹنٹ فرقہ تو بات یہیں حد تک رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس عمل سے یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ لینے والا مسیح کے کھانے میں شریک ہے اس پر پورا ایمان رکھتا ہے کہ مسیح سے نجات مل سکتی ہے، اس عمل سے ان کے نزدیک عقیدہ کفارہ پر ایمان رکھنے کا تعلق یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عیسٰی نے اپنے بارے میں یہ کہا ہے کہ: "میں ہوں وہ زندگی کی روٹی جو آسمان سے اتری اگر کوئی اس روٹی میں سے کھائے ابد تک زندہ رہے گا (یوحنا ۶: ۵۱) اس کا مطلب یہی سمجھا گیا کہ جس طرح ایک انسان روٹی کو قربان کر کے کھا جاتا ہے اور اس سے توانائی حاصل کرتا ہے اسی طرح حضرت مسیح قوم کے لئے قربان ہو جائیں گے اور اس سے پوری قوم کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا، اب یہ روٹی کھانے کی رسم اسی عقیدہ کو یاد دلاتی ہے اور کیتھولک فرقہ اس پر اضافہ کرتا ہے کہ اس عمل سے اس کھانے پینے کی ماہیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ جب کوئی پادری "عشاء ربانی" دیتے وقت لاطینی زبان میں کہے کہ "ہاکیست کارپس میئم" یعنی یہ میرا بدن ہے" تو فوراً روٹی مسیح کا گوشت بن جاتی ہے اور انگور کا رس مسیح کا خون بن جاتا ہے، اگرچہ وہ کھانے والے کو محسوس نہیں ہوتا۔ اس عمل کو "عشاء ربانی" کا نام پولس نے دیا ہے جیسا کہ کرنتھیوں (۱۱: ۲۰) سے معلوم ہوتا ہے۔ (تفصیل انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مقالہ (EUCHARIST) اور پادری ایچ۔ ایس نزبٹ کی کتاب "حقائق بائبل و بدعات قدم" سے لی گئی)

[2] کھانے کے بعد پیالہ یہ کہہ کر دیا کہ یہ پیالہ میرے خون میں نیا عہد ہے تو یعنی صرف ایک پیالہ سے "عشاء ربانی" کیوں بناتے ہیں؟ دوسرے کیوں نہیں

آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین

Opal

سید محمود الحسینی
ایڈیٹر ہفت روزہ "ندیم" (بھوپال)

روحِ انتخاب

پیامِ اقبالؒ پر ایک نظر

آج شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کی برسی بڑی عقیدت سے منائی جا رہی ہے، اس موقع پر ہم اس عظیم شاعر کے کلام و پیام پر مسٹر محمود الحسینی کا ایک مقالہ پیش کر رہے ہیں جو اپنی جامعیت اور افادیت کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہے اب تک علامہ اقبال پر بے شمار مضامین اور مقالے لکھے جا چکے ہیں، اور اُن کے فلسفۂ شعر پر مختلف انداز سے اظہارِ خیال کیا جا چکا ہے۔ محمود الحسینی صاحب نے مختصر مقالہ میں جس تعمق اور تفکر سے علامہ کی شاعری کے تدریجی ارتقاء کا جائزہ لیا ہے وہ پڑھنے کے قابل چیز ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والے اس مقالہ کی معنویت سے ضرور لطف اندوز ہوں گے

(ادارہ "ندیم")

اقبال کی شاعری آفاقیت پسند کی شاعری تھی۔ کیونکہ شعر برائے شعر کا عارضہ ایک صاحبِ فکر تعلیم یافتہ اور ذہین انسان کو لاحق نہیں ہو سکتا یہ ضرور ہے کہ موصوف کا شعوری سفر بتدریج ہی ظلمتِ شب سے روشنی میں آتا ہے اور نظر تاروں، چاند اور سورج سے ہوتی ہوئی بالآخر کائنات کی مرکزی حقیقت تک پہنچتی ہے اس تدریجی ارتقاء میں اقبال کا متحرک ذہن اور شخصیت کے نشو و نما کے آثار صاف نظر آتے ہیں اسی تدریج سے ان کی شاعری کا مقصدی پہلو واضح ہوتا ہے اور ان کے پیغام میں واقعیت اور جرأت دونوں پیدا ہوتی ہیں:

اقبال اور اس کی شاعری پر غور کرتے وقت اکثر لوگوں کو مختلف الجھنیں پیش آیا کرتی ہیں۔ ایک طرف وہ وطن پرست کی حیثیت سے کہتا "خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے"۔ دوسری طرف وہی کہتا ہے:-

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

کہیں وہ اس طرح اظہارِ خیال کرتا ہے:-

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

یہی وجہ ہے کہ کوئی اس کو وطن پرست سمجھتا ہے۔ کوئی اسے فرقہ پرست اور کوئی اس کو فاشیت کا علمبردار؛ اور کوئی اشتراکیت کا حامی اور ایسے لوگ [illegible] شاعر قرار دیتے ہیں۔ وہ ان کے ان اشعار سخت کوشی کی تعلیم دینے میں جو ہر نظامِ اجتماعی کے لئے ضروری ہے، فاشزم کی

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

م چونکہ دینِ فطرت ہے اور اس کی یہی چیز دیکھ کر اقبال اس کا گرویدہ اور ترجمان بنا ہے اس لئے قدرتی طور پر فطرت کے تمام تقاضے جو اسلام
ی اس کے کلام میں بھی ہونا چاہیئے۔ اب یہ دیکھنے والوں کا قصور ہے کہ وہ کوئی ایک چیز یا اپنے مطلب کی چیزیں اس کے کلام میں سے لے کر اُسے
خیالات و جذبات کا ترجمان سمجھنے لگیں۔

مثال کے طور پر وطن کی محبت انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اسلام بھی وطن کی محبت کو جزوِ ایمان یعنی انسانی فطرت اور شرافت کا ایک
بتا ہے۔ لیکن اس کی پرستش نہیں سکھاتا بلکہ عبدیت اور پرستش کو وہ صرف خدا کے لئے مخصوص کرتا ہے۔ اسی لئے اقبال نے کہا کہ خاکِ وطن
کو ہر ذرہ دیوتا ہے۔ لیکن جب ایک سیاسی عقیدے کی حیثیت سے وطن کو اجتماعیت اور ساری وفاداریوں کا مرکز و محور بنا لیا گیا اور
بت پرستیوں کے ساتھ ایک وطن پرستی بھی وجود میں آگئی تو اقبال چیخ اٹھا ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیراہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

ل وطن پرست کہلاتے ہیں اور اہلِ وطن کے دل میں وطن کی محبت ہی نہیں بلکہ وہ وفاداری پیدا کرنا چاہتے ہیں جو خدا کے لئے ہونا چاہیئے تو وہ فوراً
ل کو اپنے پیچھے کھڑا کر کے کہنے لگتے ہیں کہ دیکھو اقبال جیسے پیغامبر نے بھی وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا کہا ہے اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ اقبال کے
جستجو کا پہلا مرحلہ ہے۔

ن سے انسان کے فطری تعلق کا ایک پہلو ہے جو غلط انداز میں اجاگر کیا گیا ہے یا مثلاً معاشی انصاف انسانی فطرت کا یہی مطالبہ ہے اور
ت نفس کا بھی اس لئے جب اقبال سرمایہ داری کا زوال دیکھتا ہے تو خوش ہو کر کہتا ہے ؎

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
پرانی سیاست گری خوار ہے

ن اس چیز کو وہ لوگ جو انسان کے جسم میں صرف معدے کا وجود مانتے ہیں دلیل میں پیش کر کے کہتے ہیں اقبال بھی انہی کی طرح روٹی کا پرستار
حالانکہ روٹی اور معاش کو ذریعۂ زندگی کہنے اور اس کو مقصدِ زندگی ماننے میں جو فرق ہے وہ ہر اس شخص سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا جس کی
ولیں ـــــ بھوک کی شدت اور ضدات کا گرد کاسے اندھا نہ کر گیا ہو! . . . .

تبرکات

حضرت احسن مارہروی مرحوم

غفلتیں دم ساز ہیں ابتر ہے سازِ زندگی　　زندہ ہیں لیکن نہیں کچھ امتیازِ زندگی

نازِ قاتل پر فدا ہوگا نیازِ زندگی　　جب قضا ہوگی ادا ہوگی نمازِ زندگی

کھل گیا خالی ہوا بندی سے رازِ زندگی　　یعنی اک تارِ نفس ہے نغمہ سازِ زندگی

شمع گھل گھل کر دیا کرتی ہے شعلہ کو فروغ　　سوز ہے مظلوم کا ظالم کا سازِ زندگی

نزع کی غفلت سے چونکا بھی تو کیا چونکا کوئی　　خاک اب دیکھے گی چشمِ نیم بازِ زندگی

اے شبِ فرقت! مبارک تجھ کو طول اپنا کہ ہم　　کر چکے صد پارہ دامانِ درازِ زندگی

دل شکستہ ہوں مگر امید سے وابستہ ہوں　　بس یہی وابستگی ہے دل نوازِ زندگی

لے چلی ہے سوئے جنت حور و غلماں کی ہوس
مر کے بھی احسن نہ چھوٹی حرص و آزِ زندگی [1]

نو بہ نو

ماہر القادری

اے نگاہِ دوست! یہ کیا ہو گیا کیا کر دیا　　پہلے پہلے روشنی دی پھر اندھیرا کر دیا

آدمی کو درد دل کی قدر کرنی چاہیئے　　زندگی کی تلخیوں میں لطف پیدا کر دیا

وہ خرامِ ناز، موجِ آب رکنا یاد ہے　　جس نے ویرانوں کو گلگشت مصلا کر دیا

اُس نگاہِ شوخ کی تیر افگنی رکھی رہی　　میں نے پہلے اُس کو مجروحِ تماشا کر دیا

اُن کی محفل کے تصور نے پھر اُن کی یاد نے　　میرے غم خانہ کی رونق کو دوبالا کر دیا

میکدے کی شام اللہ وہ کانپتے ہاتھوں میں جام　　تشنگی کی خیر ہو، کس کس کو رسوا کر دیا

چشمِ ساقی جو بیگانہ بیگانہ ہے　　مدتوں سے یہی رنگ میخانہ ہے

ہے توجہ مگر بے نیازانہ ہے　　میرا حسنِ طلب کیا گدایانہ ہے

دل کی گرمی ہے یا آرزو کی تپش　　رنگ مے ہے کہ رنگ پیمانہ ہے

چل رہا ہے یوں ہی کاروبارِ جہاں
کوئی فسانہ ہے، کوئی دیوانہ ہے

---

[1] یہ غزل حضرت احسن مارہروی مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر افخم احسن صاحب نے عنایت فرمائی ہے مولانا احسن مرحوم کی یاد میں ۲۸ اگست کو طرحی مشاعرہ کراچی میں ہو رہا ہے۔

ہماری نظر میں

فتاویٰ عبدالحیٔ اردو

از :- علامہ ابوالحسنات محمد عبدالحی لکھنوی رحمتہ اللہ علیہ ترجمہ و تبویب :- مولانا خورشید عالم (کامل مُبوّب) (فاضل دیوبند) ضخامت ۵۰۸ صفحات (مجلد رنگین گردپوش) قیمت پندرہ روپے۔

ملنے کا پتہ :- قرآن محل، مقابل مولوی مسافرخانہ، کراچی

حضرت مولانا محمد عبدالحیؔ لکھنوی (پیدائش ۱۲۶۴ھ) کا شمار متحدہ ہندوستان کے اُن اکابر علماء میں ہوتا ہے، جو دینی علوم میں مجتہد بصیرت رکھتے تھے اور جن کی شخصیت عقلی و نقلی علوم کی جامع تھی، مولانا موصوف کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد نوّے کے قریب بتائی جاتی ہے، جامعیت کا یہ عالم کہ حدیث میں موطا امام محمد پر حاشیہ (التعلیق المجد) لکھا، فقہ میں شرح الوقایہ کی شرح کی اور اس پر حاشیہ ـــــ (عمدۃ الرعایہ) تحریر فرمایا، فقہ حنفی کی شہرہ آفاق کتاب ہدایہ کی تحشّی کی، نحو میں خیر الکلام، صرف میں التبیان، مناظرہ میں الہدایۃ المختارہ، منطق میں رسالہ قطبیہ کے حواشی الزاہد پر تحقیقات، تاریخ میں ابناء الخلان، یہ وہ معرکہ آرا کتابیں ہیں جو مولانا عبدالحی مرحوم کے نام کو ہمیشہ باقی رکھیں گی، اور اہل علم ہر دور میں ان سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

مولانا رحمتہ اللہ علیہ کے فتاویٰ جو زیادہ تر عربی اور فارسی زبان میں تھے تین حصوں میں شائع ہو چکے ہیں مگر ان میں ہر باب کے مسائل نہ تھے، محمد سعید اینڈ سنز کو یہ سعادت میسر آئی کہ انہوں نے اپنے اہتمام سے ان فتاویٰ کا اردو ترجمہ کرایا پھر فاضل مترجم (مولانا خورشید عالم) نے ان فتاویٰ کی ایک جلد میں تبویب کی :

اس کتاب میں عقائد، فقہ، علم کلام اور معاشرت کے گوناگوں مسائل پر استفتار کے جوابات ملتے ہیں، پوری کتاب معلومات سے پُر ہے، جس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبدالحی لکھنوی حقیقت میں بحر العلوم تھے۔ ـــــ بعض اقتباسات ـــــ

"سوال (۱) اگر کوئی شخص یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ ارواح مشائخ حاضر و ناظر ہیں اور ہر چیز کو جانتے ہیں اس کا کیا حکم ہے۔

جواب :- وہ کافر ہے ـــــ فی البزازیہ من قال ارواح المشائخ حاضرۃ تعلم یکفر انتہی

یعنی جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ارواح مشائخ ہر وقت حاضر ہیں اور ہر چیز جانتے ہیں، وہ کافر ہے۔ اور حنفیہ نے صراحتہً تکفیر کی اُس شخص کی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم غیب ہونے کا معتقد ہو . . . .

سوال :- ایسے آدمی کے بارے میں کیا حکم ہے جو اعتقاد رکھتا ہے کہ اولیاء کرام تمام چیزوں کو جانتے اور پکارنے والے کی آواز نزدیک و دُور سے سُن لیتے ہیں اور آپس میں بولے جانے والے الفاظ سے"

ان سے مدد مانگتے ہیں اور ان کے نام پر جانوروں کی نذر مانتے ہیں ۔

جواب :۔ یہ شخص بدعقیدہ ہے، بلکہ اس کے اعتقاد سے کفر کا خوف ہوتا ہے ۔کیونکہ اولیاء اللہ کا دُور سے آواز سننا ثابت نہیں ہے اور تمام غیبات کا ہر وقت علم کلی حاصل ہونا خاص ہے باری تعالیٰ کے ساتھ ۔۔۔ الخ ، نیز بدایہ میں دوسری جگہ ہے ۔۔۔۔۔ "غیر اللہ کے لئے نذر ماننا حرام ہے "

سوال :۔ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ ہر مقام سے ندا دینے والے کی آواز کو سن لیتے ہیں اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے ؟

جواب :۔ یہ عقیدہ اہل اسلام کے مخالف بلکہ شرک کے مترادف اور برابر ہے ہر شخص کی ندا کو ہر جگہ سے اور ہر وقت سُننا یہ صرف پروردگار عالم کے ساتھ خاص ہے کسی مخلوق کی یہ صفت نہیں ۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی سفر السعادۃ کی شرح میں فرماتے ہیں، یہ عادت نہ ہونی چاہئے کہ نماز کے اوقات کے علاوہ کسی دوسرے وقت میت کے ایصال ثواب کے لئے نہایت اہتمام کے ساتھ جمع ہو کر ختم قرآن کریں قبر پر اور نہ کسی دوسری جگہ پر، کیونکہ یہ بدعت ہے اور مکروہ !

" تفسیر مظہری میں "عرس" کو ناجائز کہا گیا ہے ۔"

سوال :۔ اگر کوئی پیر اپنے مریدوں کو تعلیم دے کہ یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کو بطور دُعا اور ورد کے مستقل پڑھا کرو، یہ قضائے حاجات کے واسطے مفید ہے ۔۔۔۔۔

جواب :۔ اس قسم کے وظیفہ سے احتراز کرنا لازم و ضروری ہے، پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ وظیفہ شیئاً للہ پر مشتمل ہے اور فقہا نے اس قسم کے الفاظ پر کفر کا حکم لگا دیا جیسا کہ دُرِّ مختار میں ہے کذا قول شئ للہ قیل یکفر کہا گیا ہے کہ شیئاً للہ کہنے والے کی تکفیر کی جائے گی ۔۔۔۔ اور ہمارے علماء کا اتفاق ہے جو شخص اولیاء اور مشائخ کی ارواح کو حاضر و عالم سمجھے وہ کافر ہے ۔ حضرت شیخ عبدالقادر اگرچہ امت محمدیہ کے کبار اولیاء میں سے ہیں اور ان کے مناقب و فضائل بے شمار ہیں، مگر دُور سے آواز سننے کی اور فریاد رسی کی طاقت اُن کے لئے بھی ثابت نہیں، اب اُن کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ اپنے مریدوں کے حال سے واقف ہیں اور اُن کی آوازوں کو سنتے ہیں، یہ شرک ہے "

و عوام مسلمان " اشہد ان محمد رسول اللہ " کہے جانے کے وقت انگوٹھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہیں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس مسئلہ کی احادیث صحیح نہیں ہیں، دیلمی نے مسند الفردوس میں حضرت ابوبکر سے مرفوعاً جو نقل کیا ہے وہ صحیح حدیث نہیں ہے اور ۔۔۔۔

" اسی میں ہے کہ جو شخص اشہد ان محمد رسول اللہ سننے کے وقت مرحبا بحبیبی و قرۃ عینی محمد بن عبداللہ کہے اور انگوٹھوں کو چوم کر لگائے اسے کبھی بیماری نہ آئے گی، اور آنکھیں آشوب نہ کریں گی، ابن طاہر اس کے بارے میں بھی فرماتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے اور شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی مقاصد حسنہ فی الاحادیث المشتہرہ علی الالسنہ میں چند روایات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کوئی حدیث صحیح مرفوع نہیں ہے، اور ملا علی قاری نے تذکرۃ الموضوعات میں یہی لکھا ہے "

سوال :- جو شخص مذہب (فقہی) کا انکار کرے اور کسی مذہب کے اختیار کرنے کو برا سمجھے اور کتب حدیث کے اتباع کا دعویٰ کرتے تو ایسا شخص مبتدع ہے یا نہیں۔

جواب :- اصحاب مذاہب خواہ ابو حنیفہ ہوں، یا شافعی، امام مالک اور احمد حنبل ہوں، کسی نے بھی تدوین مذاہب اور استخراج مسائل خلاف شرع نہیں کئے ہر ایک امام کے پاس مستند دلائل موجود ہیں اور اُن کے اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ آیات قرآنی و احادیث سمجھنے میں اختلاف ہوگیا۔ ورنہ کسی تعصب یا قیاس کو شریعت پر مقدم کرنے کی وجہ سے ایسا نہیں ہے اور تمام ائمہ تقدیم قیاس علی الشرع سے منزہ و مبرا ہیں، اگر کوئی شخص اس کی نسبت (اُن سے) کرتا ہے تو وہ کاذب اور افتراء پرواز ہے، بعض متعصبین اصحاب حنفیہ کو اصحاب الرائے کہتے ہیں مگر ان کا قول سراسر غلط ہے اور اگر اصحاب الرائے ہیں تو میرے خیال میں یہ تو حنفیہ کی تعریف ہوئی، کیونکہ یہاں رائے سے خاص رائے دقیق مراد ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی مجمع کوسس فی المعجم المفہرس میں اقرار کرتے ہیں مذہب حنفیہ میں اصول وقواعد جس طرح ضبط کئے گئے ہیں ہمارے مذہب شافعی میں نہیں ہیں ـــــ حاصل کلام یہ ہے کہ مذاہب مدونہ مروجہ آیات قرآنی، سنت رسول اور اجماع و قیاس کے مخالف نہیں ہیں ہر ایک مسئلہ کی اصل ان ادلہ اربعہ میں مل جائے گی :

حضرت شاہ ولی اللہ "انصاف فی بیان سبب الاختلاف" میں فرماتے ہیں ـــــ لما مهد و الفقه ـــــ انتہی . . . . لہٰذا اگر کوئی شخص مذاہب اربعہ کو صرف اس وجہ سے برا سمجھتا ہے کہ یہ مذاہب خلاف شرع اور خلاف نصوص ہیں تو وہ یقیناً کافر ہے . . . . . .

اب ذرا غور کرنا چاہئے کہ ائمہ مجتہدین مسائل موجودہ کی تحقیق اور تدوین نہ کرتے تو تمام عالم گمراہ ہوجاتا اور کسی کو احکام شرع کی ہوا بھی نہ لگتی، کیونکہ بہت سے احکام ظاہر نصوص و آیات سے مستنبط نہیں ہوتے پس ان مذاہب کو برا سمجھنا درحقیقت احسان فراموشی ہے . . .

کاش! یہ حقائق مولانا عبدالستار دہلوی امام غرباء اہل حدیث کی نگاہ سے گزر جاتے !

اس کتاب میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جن کو پڑھ کر خلجان پیدا ہوا، مثلاً مولانا عبدالحی لکھنوی "بدعت" کی اقسام کے قائل ہیں، یا اہل تصوف کے یہاں خلافت و سجادہ نشینی کی جو رسم پائی جاتی ہے، اس میں وہ کوئی کھٹک تک محسوس نہیں کرتے "استواء علی العرش" کے مسئلہ میں انہوں نے دوسروں کے اقوال نقل کردئے ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ کی "مکانیت" کا وہم پیدا ہوتا ہے، حالانکہ اللہ جسم و مکان سے منزہ ہے، سبحٰن اللہ عما یصفون۔

کوئی شک نہیں "فتاویٰ عبدالحی" دینی علوم و معلومات اور فقہی مسائل کی نہایت جامع کتاب ہے، اس کے ترجمہ نے اردو ادب میں اضافہ کیا ہے۔

ماہنامہ افکار کا فیض نمبر مرتبہ:۔ صہبا لکھنوی اور کشش صدیقی، ضخامت ۴۰۰ صفحات (زرسالانہ ۱۲ روپے) اس خاص نمبر کی قیمت بارہ روپے (فیض احمد فیض کی متعدد تصاویر، فوٹو گروپ اور اُن کے عکس تحریر کے ساتھ) سرورق دیدہ زیب، جو فیض کی جاذب توجہ کارٹون نما تصویر سے مزین ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ افکار، رابسن روڈ، کراچی

اس سے پہلے ماہنامہ افکار کے "جوش نمبر" اور "حفیظ نمبر" بڑی شان اور آن بان کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں اور فیض نمبر تو ان دونوں خاص نمبروں سے بازی لے گیا، غالباً اس کا سبب وہ خلوص و عقیدت ہے جو صہبا لکھنوی صاحب ترقی پسندوں کے امام فیض سے رکھتے ہیں ترقی پسند ہوں یا نیم ترقی پسند ان سب کے یہاں کسی نہ کسی حد تک وحدتِ فکر و مزاج بھی پائی جاتی ہے۔

یہ خاص نمبر اس اعتبار سے کامیاب بلکہ یوں کہیے کامیاب ترین ادبی پیشکش ہے کہ فیض کی زندگی اور شاعری کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تشنہ رہ گیا ہو یا ناقدین کی نگاہ اُس تک نہ پہونچی ہو، شاعر کی پوری شخصیت اپنے تمام خد و خال کے ساتھ اس آئینہ میں نظر آتی ہے، دس بیس اور چالیس پچاس نہیں سینکڑوں ادیبوں اور شاعروں نے فیض صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، ماہر القادری کے مقالہ ——— (فیض کی شاعری اور زبان و بیان) کے علاوہ تمام مقالے مدحیہ اور تحسین آمیز ہیں، ہاں! کہیں کہیں بعض مضامین میں فیض صاحب کے بعض شعروں پر ہلکی سی گرفت ملتی ہے، متعدد مقالے دلچسپ اور معلومات آفریں ہیں، سید ابوالخیر کشفی صاحب کا مقالہ ہمیں خاص طور سے پسند آیا، نظموں میں جوہر سعیدی کی نظم ——— دیدۂ بیدار ——— بہت جاندار اور دلکش نظم ہے، وہ کہتے ہیں:۔

فیض انساں کو حقائق کا وطن کہتا ہے فیض خوابوں کے جزیروں میں نہیں رہتا ہے

——— اور ———

؎ فیض زنجیر کے حلقوں کو زباں دیتا ہے

"فیض نمبر" دس ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب اپنے آغوش میں رنگا رنگ مضامین اور مقالے رکھتا ہے، فیض کی تحریر کے جو نمونے دئے گئے ہیں ان میں سب سے اچھا مضمون ——— داغستان میں چند روز ——— ہے! یہ مقالہ ان کی نثر نگاری کا شاہکار ہے، اس مضمون سے معلوم ہوا کہ علاقہ مذکور کی درسی زبان ماضی قریب تک عربی تھی، مگر اب وہاں کی درسیات و نصاب سے عربی زبان کو خارج کر دیا گیا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سوویٹ روس نے اسلام اور مسلمانوں کی روایات و خصوصیات کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور اسلامی عقائد و تمدن اور روایات کے جو آثار باقی رہ گئے ہیں۔ اُن کی سخت جانی وہاں کے ماحول کا دیکھئے کب تک مقابلہ کرتی ہے۔

اسلامی اخلاق کی معجز نمائی دیکھئے کہ اشتراکی افکار و تہذیب کے تسلط اور غلبہ کے باوجود مسلم آبادی کے بعض علاقوں کا اب تک یہ حال ہے:

> "برہنہ سر پھرنا مردوں اور عورتوں دونوں میں معیوب سمجھا جاتا ہے! اگرچہ داغستانی گھروں میں زنانہ اور مردانہ کی تقسیم نہیں، لیکن عام طور سے عورتیں مردوں کی محفل میں بہت کم شرکت کرتی ہیں بلکہ مرد مہمان گھر میں ہوں تو کھانے کی میز پر بھی اُن کے ساتھ نہیں بیٹھتیں۔" (ص ۶۹۱)

کاش ہمارا پاکستان کی تعلیم یافتہ بیگمات داغستان کی مسلمان عورتوں ہی سے کچھ سیکھ سکتیں!

فیض صاحب جن شخصیتوں سے متاثر ہوئے ہیں، اور جن کی تخلیقات سے افادہ کیا ہے، اُن میں اُردو اور فارسی شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ انگریزی، عربی، روسی اور سنسکرت کے شعراء کے نام بھی ملتے ہیں! اس سے اندازہ ہوتا ہے اُن کا مطالعہ خاصہ وسیع اور ہمہ گیر ہے! وہ سنسکرت کے سورداس اور بھبوتی وغیرہ سے بھی متاثر ہیں۔ فیض صاحب سنسکرت تو نہیں جانتے، سورداس اور بھبوتی وغیرہ کا کلام غالباً انہوں نے انگریزی میں پڑھا ہوگا! اس بات کی ہم تحقیق نہ کر سکے کہ سنسکرت کے ان شعراء کا کلام انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے یا نہیں۔ اُردو میں تو کالیداس کے مشہور ناٹک شکنتلا کا ترجمہ ہماری نظر سے گزرا ہے ـــــ عربی شاعروں کا کلام فیض صاحب نے براہ راست عربی میں پڑھا ہے، تو اُن کے قلم سے "بے نیل ومرام" کیسے نکل گیا!... کہتے ہیں ـــ

یوں بہار آتی ہے اس بار کہ جیسے قاصد کوچۂ یار سے بے نیل و مرام آتا ہے

عنایت الٰہی کی کتاب "راگ رنگ" پر فیض نے جو دیباچہ لکھا ہے وہ پورے کا پورا یا اُس کا اقتباس صفحہ ۹۰، پر نظر آیا وہ لکھتے ہیں:-

"اور جس موضوع پر عنایت الٰہی ملک نے قلم اُٹھایا ہے اس پر تو اُردو میں کوئی کتاب شاید ہے ہی نہیں"

فیض صاحب کو شاید اس کا پتہ نہیں ہے کہ اب سے تقریباً چالیس سال پہلے راجہ نواب علی خاں (تعلقدار اور وہ موسیقی پر بڑے معرکہ کی کتاب (معارف النغمات) لکھ چکے ہیں!

فیض کا جو منتخب کلام ادارہ "افکار" اور مضمون نگاروں نے پیش کیا ہے اس میں "یتیم لہو" بڑی کامیاب نظم ہے ـــ "دلفگار چلو" کا بھی آہنگ اور انداز بہت خوب ہے ۔ ـــ

چشمِ نم جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو
دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہر جاناں چلو
خلوتِ خاص بھی، مجمع عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبح ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی
ان کا دمساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے
رختِ دل باندھ لو، دلفگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

فیض کے وہ اشعار جو ہمیں پسند آتے :—

باغباں ہوش! کہ برہم ہے مزاجِ گلشن　　　ہر کلی ہاتھ میں تلوار لیۓ پھرتی ہے[1]
وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے　　　اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو
ہر اک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی　　　نگاہیں بجھ رہی ہیں راستہ زرکار ہے تک
رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی　　　جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم　　　جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائیگی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

میری خاموشیوں میں لرزاں ہے　　　میرے نالہ کی گمشدہ آواز
اُن کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے　　　کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

(فیض کے اس شعر کے ساتھ ہی صہبا اختر کی نظم —— لال قلعہ —— کا یہ مصرعہ ہمیں یاد آیا -
دھوپ دیوار کو چھو لے تو گلابی ہو جائے)

گداز جسم قبا جس پہ سج کے ناز کرے　　　دراز قد جسے سروِ سہی نماز کرے

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم
حدیث بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرام ابر سرِ کوہسار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم

---

[1] کلی کہاں گھومتی پھرتی ہے۔ تلوار لیے بیٹھی ہے " کہنا چاہیے تھا۔ کاش یہ مصرعہ یوں ہوتا۔ جیسے صحرا میں دبے پاؤں چلے بادِ نسیم

پھر سے بجھ جائیں نہ شمعیں جو ہوا تیز چلی — لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے — اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ڈھونڈ لیتے ہیں یوں ہی شوق نے آسائشِ منزل — رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

دل نا امید تو نہیں ناکام ہی تو ہے — لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں — دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں — اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگذر بھی نہیں

حدیثِ بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف — خرامِ ابرِ سرِ کوہسار کا موسم

نصیبِ صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے — یہ رقصِ سایۂ سرو و چنار کا موسم

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

بہت عزیز ہو لیکن شکستہ دل یارو! — تم آج یاد نہ آؤ کہ جشن کا دن ہے

دوسرا رخ : ———

آج پھر اپنے غیروں سے سر جوڑ کر — تیری عصمت کا بھاؤ لگانے چلے (ص ۴۳)

"بھاؤ" کا لفظ اس شعر میں نطق و وجدان کو کس قدر ناگوار گزرتا ہے "تیری عصمت کی قیمت" کہا جا سکتا تھا۔

سن تو لو، دیکھ تو لو، مانو نہ مانو اے دل — شام غم سینکڑوں اقرار لئے پھرتی ہے (ص ۴۶)

پورا شعر مبہم نہیں مہمل ہے۔ "شام غم کا سینکڑوں اقرار لئے پھرنا" آخر یہ بات کیا ہوئی! "اے دل" واحد ہے اس لئے "سن تو لے" "مان نہ مان" کہنا چاہتے تھا، فعل (امر) کو جمع لانے کی وجہ سے شعر میں شترگربگی پیدا ہو گئی۔

نہ دید ہے نہ سخن اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
اُمیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اُداس بہت ہے (ص ۵۰)

دونوں شعروں کے پہلے مصرعے دوسرے مصرعوں سے مختلف الوزن ہیں —

آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم — زندگی زرنگار کر لیں ہم (ص ۵۶۵)

پہلا شعر بچکانہ ہے۔

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفلِ ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی — بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے (ص ۵۶۵)

"نیم شب" اور "چاندنی کے بعد" خود فراموشی کس قدر اکھڑا اکھڑا لگتا ہے! پھر آدھی رات کو جب چاند نکل رہا ہے تو محفل بہت دیر آخر کیوں ویران ہے!

نہ نجوم، کہیں چاندنی کے دامن میں ہجوم شوق سے اک دل ہے بے قرار ابھی (ص ۵۶۷)

یہ کیسا دل ہے جو ستاروں کی تہ میں یا اُن کے نیچے جا پہنچا ہے؟

اُداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں دلِ حزیں میں کئی جاں بلب دعائیں ہیں

دوسرے مصرعے میں کوئی لطف نہیں، ایسے مصرعے نومشقی کے زمانے میں کہے جاتے ہیں۔ "کئی" اور زیادہ کھٹکتا ہے!

فیض کی ایک نظم ہے:—

"آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ"

اس نظم کے بعض مصرعے شگفتہ ہیں اور بعض بے لطف ہیں۔

فکرِ فردا اتار دے دل سے عمرِ رفتہ پہ اشکبار نہ ہو

عہدِ غم کی حکایتیں مت پوچھ ہو چکیں سب شکایتیں مت پوچھ (ص ۵۶۸)

اس طرح کوئی نہیں بولتا کہ اُس نے دل سے غم کو اُتار دیا، یا بھئی! اپنے دل سے فکرِ فردا کو اُتار دو، اتارنے کے ساتھ "بارِ غم یا بار فکر" بولا جائے گا تو بات بنے گی! دوسرا شعر پڑھ کر آدا بدایونی کی مشہور غزل کا یہ مصرعہ ذہن میں اُبھرا:—

گزر چکی ہیں جو دل پر قیامتیں مت پوچھ

نظم "ایک منظر" کا ایک شعر:—

چاند کا دکھ بھرا فسانہ نور شاہراہوں کی خاک میں غلطاں (ص ۵۶۹)

چاند کا "افسانہ نور" آخر کس لئے دُکھ بھرا ہے؟ بات کہنے کا کوئی قرینہ اور سوچنے کا کوئی ڈھنگ بھی تو ہوتا ہے،

اُن کی مشہور نظم ہے:—

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

یہ زبان روزمرہ نہیں ہے، یوں کوئی نہیں بولتا کہ فلاں شخص، فلاں شخص سے محبت، مانگ رہا ہے شاعر کہنا یہ چاہتا ہے اور اسی طرح کہنا بھی چاہیے تھا — کہ میرے محبوب مجھ سے پہلی سی محبت کی امید نہ رکھ، یا اگلے دوستانہ روابط کا تقاضا نہ کر!

اس نظم کا سب سے اچھا شعر یہ ہے:—

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اور اس نظم کا اختتام جاذبِ توجہ ہے! باقی پوری کی پوری نظم پست اور سطحی ہے، اس کا پہلا بند ہے:—

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے، تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دُنیا میں کیا رکھا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا ۔۔۔

تیرا غم ہے تو غم دہر کی پروا کیا ہے ؟

یہ مصرعہ ۔۔۔ تیری آنکھوں کے سوا دُنیا میں رکھا کیا ہے

بھلا کسی مشاق شاعر کو زیب دیتا ہے ! پھر اس میں "دُنیا" کا الف کس بری طرح دب رہا ہے ۔

یوں تو سب کہتے ہیں کہ فلاں کام ہو جانے سے تقدیر جاگ اُٹھی، قسمت کھل گئی، نصیبہ نے یاوری کی مگر اس طرح کوئی نہیں بولتا کہ محبوب کے مل جانے یا کسی مرحلہ میں عاشق کے کامیاب ہو جانے سے تقدیر سرنگوں ہو گئی اور مقدر شرمندہ ہو گیا ! پھر ٹیپ کا یہ مصرعہ ۔۔۔

یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

شاعری کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہے ۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بُنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

"طلسم کا ریشم و اطلس و کمخواب میں بُنوانا" یہ آخر کیا اندازِ بیان اور اسلوبِ اظہار ہے پھر اطلس و کمخواب تو کپڑوں کے نام ہیں اور کوئی چیز تاروں اور دھاگوں سے بُنی جاتی ہے، کپڑوں سے نہیں بُنی جاتی !

"کوچہ و بازار میں جسم بکتے ہوئے" سے نہ جانے شاعر کی کیا مراد ہے' بازار میں جسم بکنے کا مطلب تو عصمت فروشی ہوتی ہے مگر جن عورتوں کے جسم خاک میں لتھڑے ہوئے اور خون میں نہائے ہوئے ہوں اُن کا کوئی ہوس پرست مول تول نہیں کر سکتا ! اگر اس سے مزدور مراد ہیں تو یہ منتہائی مبالغہ آمیز ہے' ایسا کہیں دیکھنے میں نہیں آیا کہ مزدور خاک و خون میں لتھڑے اور نہائے ہوئے سرمایہ داروں کے جبر سے کام کر رہے ہیں ۔

نظم "رقیب سے" کا بھی یہی رنگ ہے ۔۔۔

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لئے کہتا ہے

آخر دنیا کے کس بازار میں مزدور کا گوشت بکتا ہے ـــــ یہ کیا رمز، علامت، اشاریت، تلمیح اور انداز بیان ہے۔
ـــ توبہ! پھر "توند کا سیلاب" کیا ہوتا ہے! ہر بات کہنے کی کوئی تک اور قرینہ ہونا چاہئے، دوسرا مصرعہ نرا بچکانہ ہے۔ "سرمایہ و محنت کی جنگ و تصادم اور سرمایہ داری کے مظالم کا اس طرح اظہار کس قدر بے جان بلکہ مضحکہ انگیز ہے! "عظیم شاعر" تو ایک طرف ہے معمولی درجہ کے شاعر بھی ایسے بے تکے، غلط اور پست شعر نہیں کہا کرتے۔

"چند روز اور مری جان" ـــــ کے دو شعر ہیں:۔

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں	ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم	آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد	اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار (ص ۵۷۵)

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ کس قدر کمزور اور ڈھیلا ہے اور دوسرے شعر میں "اجنبی" اور "بے نام" نے شعر کی معنویت میں کوئی اضافہ نہیں کیا بلکہ اُسے اور اُلجھایا اور مبہم بنایا ہے ـــ تیسرے شعر میں کوئی لطف اور خوبی نہیں پائی جاتی!

بھولے سے مسکرا تو دئے تھے وہ آج فیض	مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے (ص ۵۸۶)

"دلِ ناکردہ کار" کی ترکیب سے شعر کی معنویت کا آخر کیا تعلق ہے!

اک تری دید چھن گئی مجھ سے	ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

مفہوم تو واضح ہے مگر کہنے کا انداز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!

اب سعی کا اِمکاں اور نہیں پرواز کا مضموں ہو بھی چکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چکے مہتاب پہ شبخوں ہو بھی چکا (ص ۵۹۱)

"پرواز کا مضموں ہو بھی چکا" زبان اور بیان ہر اعتبار سے ناپسندیدہ ہے!

جینے کے فسانے رہنے دو اب ان میں اُلجھ کر کیا ہوگا
اک موت کا دھندا باقی ہے جب چاہیں گے نپٹا لیں گے
یہ تیرا کفن، وہ میرا کفن، یہ میری لحد، وہ تیری لحد

اس تُک بندی پر ہم کن الفاظ میں تنقید کریں، کوئی اوسط درجہ کا شاعر بھی اس قسم کے پست شعروں کی اپنی ذات سے نسبت گوارا نہیں کر سکتا۔

ہستی کی متاعِ بے پایاں جاگیر تری نہ میری ہے	اس بزم میں اپنی مشعلِ دل بسمل ہے تو کیا رخشاں ہے تو کیا

" نہ "کو" ناں" پڑھنے سے شعر کا وزن پورا ہوتا ہے اور "ناں" رسیا، بارہ ماسہ جیسے بولوں اور دیہاتی گیتوں کی زبان ہے! غزل اور نظم میں " ناں" کا استعمال اس صورت میں پسندیدہ ہوگا، جب کہ دوسرے الفاظ بھی اسی انداز کے ہوں اور یہی لہجہ اختیار کیا گیا ہو! مشعلِ دل" کو "بسمل" کہنا جدت ہے مگر ناگوار جدت!

بنی بساطِ غزل جب ڈبو لئے دل نے — تمہارے سایہ رخسار ولب میں ساغر و جام (ص ۵۹۴)

"بنی بساطِ غزل" اس شعر کا یہ پہلا ٹکڑا ہی عجیب ہے، غزل کی بساط اور پھر اس کا بننا، اور اس کے بعد یہ کہ دل کے پاس کچھ جام و ساغر ہیں، جو اس نے محبوب کے سایہ رخسار ولب میں ڈبو لئے ہیں ـــــ اس شعر کی کوئی چول بھی سیدھی نہیں ہے! زلفوں اور پلکوں کا سایہ تو بولتے ہیں، مگر لب و رخسار کا سایہ پہلی بار نگاہ سے گزرا اور پھر سایہ میں پیالوں کا ڈبو لینا اس پر مستزاد! فیض صاحب کی "جدت" کی تقلید میں اب نئے کہنے والے "کان کا سایہ" اور "ناک کا سایہ" کہا کریں گے۔

اب ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے — اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدر (ص ۵۹۶)

" درد کا نجر" "درد کا چاند" "درد کے ستارے" آخر یہ کیا اندازِ بیان ہے؟ ذوقِ سلیم اسے کس طرح برداشت کرسکتا ہے دوسرا مصرعہ بھی بس گوارا ہی کہا جاسکتا ہے۔

غیرتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں — سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی (ص ۵۹۷)

اس شعر میں کس قدر ابہام بلکہ اہمال پایا جاتا ہے، "صحتِ داماں" نے شعر کا رہا سہا حلیہ بگاڑ دیا ـــــ

عکسِ جاناں کو ودع کرکے اٹھی میری نظر — شب کے ٹھیرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر (ص ۶۰۷)

" وداع" کی جگہ "ودع" نظم کیا گیا ہے، الف کا اس طرح سقوط جائز نہیں ہے، ہاں یو۔پی کے قصبات میں "وداع" کی جگہ "بدا" بولتے ہیں، اس طرح ـــــ "بیٹی والے نے برات کو شام کے وقت بدا کیا"

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں — تیری آواز کے سائے ترے ہونٹوں کے سراب (ص ۶۰۸)

کہنے کو ہر بات کہی جاسکتی ہے ـــــ جذبات کا کنواں، محسوسات کی گرد، تصور کی کیاریاں اور خیالات کی کیچڑ ـــــ اسی طرح اس شعر میں "آواز کے سائے" اور "ہونٹوں کے سراب" نظم کئے گئے ہیں۔

حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں — تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں (ص ۶۱۲)

اس شعر میں اہمال کے سوا کیا رکھا ہے! ایک تو حدیثِ یار کے عنوان پھر ان کا نکھرنا، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے نکھرنے سے ہر حریم میں گیسو کیوں سنورنے لگتے ہیں!

دلبری ٹھیرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام — اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام

اس شعر کا وہی رنگ ہے جو اس سے اوپر کے شعر کا ہے،

وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں — وہ اک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں (ص ۶۱۵)

شعر کیا ہے چیستاں ہے! توبہ

یہ رات اُس درد کا شجر ہے — جو بعد سے مجھ سے عظیم تر ہے

رات کیسے درد کا شجر بھی ہوتا ہے ـــــ یا للعجب!

نظم "رقیب" کا بھی یہی رنگ ہے۔ ـــ

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لئے کہتا ہے

آخر دنیا کے کس بازار میں مزدور کا گوشت بکتا ہے! یہ کیا رمز، علامت، اشاریت، تلمیح اور اندازِ بیان ہے ـــ تو یہ پھر "توند کا سیلاب" کیا ہوتا ہے! بات کہنے کی کوئی تک اور قرینہ ہونا چاہئے! سرمایہ و محنت کی جنگ و تصادم اور سرمایہ داری کے مظالم کا اس طرح اظہار کس قدر بے جان بلکہ مضحکہ انگیز ہے۔

دلبری ٹھیرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام — اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام (ص ۶۱۳)

شعر ایک "پہیلی" ہے کہ بس بوجھتے ہی رہئے!

"ملاقات" طویل نظم ہے مگر پوری کی پوری نظم بے لطف ہے، جگہ جگہ ابہام اور اہمال! ذرا اس نظم کا آغاز دیکھئے۔

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب اس کے سائے
میں اپنا سب نور رو گئے ہیں

رات کو یہ کہنا کہ وہ "اُس درد کا شجر" ہے، کتنی بے تکی اور غیر شاعرانہ بات ہے! پھر یہ رات جس میں ستاروں کے کارواں کھو گئے اور ہزار مہتاب اس کے سائے میں اپنا نور ضائع کر گئے ہیں' اپنی اس خصوصیت کے سبب۔

"مجھ سے تجھ سے عظیم تر"

آخر کیوں ہے؟ رات اور انسان میں کوئی وجہ شبہ و مماثلت تو ہونی چاہئے! اس نظم کا آغاز جس طرح ایک مہمل شعر سے ہوا تھا اس کا اختتا بھی اسی طرح کے ایک شعر پر ہوا ہے۔

یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

اس "کریم تر" کا بھلا کوئی جواب ہے!

فیض صاحب کی نظم ہے ـــ

"ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے"

یہ نظم فیض صاحب خود اپنی پسند اور شوق سے بھی مشاعروں میں سناتے ہیں اور بعض لوگ فرمائش بھی کرتے ہیں!

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے

"دار کی خشک ٹہنی" کیا ہوتی ہے! لفظوں کا اس قدر عجیب انتخاب! ؟

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی

اس طرح لفظوں کو جوڑ دینا، شاعری کی توہین ہے! لفظوں کی نشست، مصرعوں کا دروبست، شاعر کا بنیادی خیال اور پیرایۂ اظہار.... ان میں سے ہر چیز اپنی جگہ "مضحکہ خیز" ہے۔

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم

"راہوں میں شامِ ستم کا گھلنا" آخر یہ کس دیس کی زبان ہے؟ یہ کیا جو الم غلم خیال جی میں آیا اُسے نظم کر دیا۔

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علَم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جان گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

ان مصرعوں میں کوئی شاعرانہ لطف؟ کوئی سمجھ میں آنے والا پیام! کوئی ڈھنگ اور قرینہ کی بات؟ ایک شخص جو جی میں آتا ہے اور اس کے اظہار کے لئے جیسے بھی بُرے بھلے الفاظ ملتے ہیں، انہیں جوڑتا چلا جاتا ہے اور اس طرح ایک نظم کھڑی ہو جاتی ہے! قتل گاہوں میں علَم" آخر کہاں سے آ گئے، یہ "علَم" کس پیام اور مقصد کی آخر علامت ہے! پھر اُن کا "چننا" اس پر مستزاد اس لفظ سے دو مفہوم ذہن میں آتے ہیں، ایک یہ کہ قتل گاہوں میں بہت سے علَم نصب ہیں، اُن میں سے بعض علموں کو منتخب کیا گیا، یا پھر یہ کہ "علَم" قتل گاہوں میں زمین پر بکھرے پڑے تھے، اُن کو چنا گیا (یعنی اٹھایا گیا)! تیسرے مصرعہ میں حرف "جار" (سے) کا استعمال سب سے زیادہ کھٹکتا ہے! "درد کے فاصلے" کیا ہوتے ہیں! تیسرے اور چوتھے مصرعوں کی نثر کر کے دیکھئے تو مفہوم اور الفاظ کی کوئی چول سیدھی نہیں بیٹھ سکتی! —
پھر محبوب کی دلبری کے بھرم" کو جان گنوا کر" جہاں گیر" بنا دینا کتنا غیر شاعرانہ اندازِ بیان ہے —

ایک نظم ہے "درد آئے گا دبے پاؤں" فرماتے ہیں ۔

اور کچھ دیر میں جب پھر مرے تنہا دل کو
فکر آ لے گی کہ تنہائی کا چارہ کیا ہے
درد آئے گا دبے پاؤں لئے سُرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے
شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اُٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اُٹھے گا

کیا شاعر کا دل درد سے خالی ہے! جو یہ کہا گیا ہے کہ درد دبے پاؤں سُرخ چراغ لے کر آئے گا! پھر یہ کیسا درد ہے جو دل کی سرحد سے دور کہیں دھڑکتا ہے؟ کیا "درد" دھڑکا بھی کرتا ہے "سُرخ چراغ" سے اشتراکیت مراد ہے یعنی وہ اشتراکیت جو روس میں "درد" بن کر دھڑک رہی ہے ——— یہ اندازِ بیان کتنا عجیب ہے!!

اس نظم کا یہ بند واقعی خوب ہے ———

حلقۂ زلف کہیں گوشۂ رخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں گلشنِ دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں

مگر "ہجر کا دشت" ان حسین مصرعوں میں بے جوڑ لگتا ہے جب پیار، لطف، دیدار اور زلف و رُخسار کا ذکر چھڑا ہے تو "ہجر کا دشت" کہنے کی کیا تُک تھی؛ یہ مصرعہ ہو سکتا تھا ۔

؎ چمنِ شوق کہیں، گلشنِ دیدار کہیں

ایک "رجز" ہے ——— "AFRICA COME BACK" ———

آ جاؤ میں نے سُن لی ترے ڈھول کی ترنگ
آ جاؤ مست ہو گئی میرے لہو کی تال
"آ جاؤ افریقا"

"ڈھول کی آواز کو" "ڈھول کی ترنگ" تو نہیں کہتے اس طرح کوئی نہیں بولتا کہ ڈھول کی ترنگ کانوں میں آ رہی ہے یا میں باجے اور تاشے کی ترنگ سُن رہا ہوں! پھر لہو کی تال کیا ہوتی ہے؟ ان کمزوریوں کے علاوہ "آ جاؤ" کے بعد "ترے" نے شعر میں شترگربگی بھی پیدا کر دی۔

آ جاؤ میں نے دھول سے ماتھا اٹھا لیا
آ جاؤ میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال　　(ص ۶۲)

غم کی چھال کیا ہوتی ہے، پھر اُسے شاعر نے اپنی آنکھوں سے چھیل کر بھی پھینک دیا؟ یہ تصور چھال کے لئے کس قدر اذیت دہ اور کیا انگیز —
جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین　　دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال

بھالوں کے "مرگ نین" اور ہجر اُن کا کچھاروں میں چلنا، یہ کیا اندازِ اظہار اور پیرایہ بیان ہے!

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے (ص ۶۴۳)

عاشق کے اشک محبوب کی عاقبت آخر کس طرح سنوار چلے! کوئی ثبوت! بات کہنے کا کوئی قابلِ فہم قرینہ!

اٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

اس شعر کے پڑھتے ہی جناب حفیظ ہوشیارپوری کی غزل کا مطلع یاد آیا۔

یوں دل شگفتہ ہم تری محفل سے آئے ہیں
آنکھوں میں اشک بھی بڑی مشکل سے آئے ہیں

بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
جھلک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ تمام

"بساطِ رقص" سے شاید ڈانسنگ ہال مراد ہے! شرق و غرب تو سب بولتے ہیں مگر یہ "صد شرق و غرب" کیا ہوتا ہے! پھر "دوستی" کی جگہ محبت، لطف و عنایت اور تعبیر یا کوئی لفظ لانا تھا۔

ابھی سے یاد میں ڈھلنے لگی ہے صحبتِ شب ہر ایک روئے حسیں ہو چلا ہے بیش حسین

صحبتِ شب کے یاد میں ڈھلنے سے اُس محفلِ رقص و سرود کا ہر ایک "روئے حسین" "بیش تر" کیوں نظر آنے لگا۔

جو ترے حسن کے فقیر ہوئے اُن کو تشویشِ روزگار کہاں
درد بیچیں گے گیت گائیں گے اس سے خوش وقت کاروبار کہاں (ص ۶۴۴)

"درد بیچنے" سے آخر شاعر کی کیا مراد ہے؟ غم و درد کس بازار میں مول لئے جاتے ہیں کہ انہیں بیچ کر گزر اوقات ہو سکتی ہے! چوتھا مصرعہ بھی الجھا ہوا ہے! "حسن کے فقیر" بھی مہمل ترکیب ہے؟

"کہاں جاؤ گے" ـــــ کے عنوان، اور اُس کے ذیل میں یہ اشعار درج ہیں ـــــ

اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر بام پہ چاند عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدۂ نمناک سے باری باری سب ستارے سرِ خاشاک برس جائیں گے

آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی (ص ۶۴۶)

چاند کے غروب ہو جانے کو "لٹ جانا" کون کہتا ہے! عرش کا دیدہ نمناک کیوں ہے! کیا چاند غروب ہوتا ہے تو عرش کو اس سے تکلیف ہوتی ہے؟ پھر "شبستان" کیا چرند پرند ہیں جن کو "تھکے ہارے" کہا گیا ہے! ان تمام بے تکی باتوں کی کسی نہ کسی طرح "فرض کر لیجئے" تاویل بھی کر لی جائے لیکن اس مصرعہ ـــ

اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی

کی کیا توجیہ کی جائے گی ؟ تنہائی کا سمٹنا اور بچھنا یہ کہاں کی زبان ہے کیا انداز بیان ہے ! شاعر کہنا کیا چاہتا ہے ! زبان وادب اور شاعری کی اس صفائی کو کوئی اہلِ ذوق کس طرح گوارا کرسکتا ہے !

"جب تیری سمندر آنکھوں میں"
(گیت)

یہ دھوپ کنارا شام ڈھلے
ملتے ہیں دونوں وقت جہاں
جو رات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں
اس دھوپ کنارے پل دو پل
ہونٹوں کی لپک
باہوں کی چھنک
یہ میل ہمارا جھوٹ نہ سچ
کیوں راز کروں، کیوں دوش دھرو
کس کارن جھوٹی بات کرو
جب تیری سمندر آنکھوں میں
اس شام کا سورج ڈوبے گا
سکھ سوئیں گے گھر در والے
اور راہی اپنی راہ لے گا　　　(ص ۶۴۹)

جب دھوپ ڈھل کر شام کا جھٹ پٹا ہوتا ہے تو ایسے وقت کو "آج" کیوں نہیں کہہ سکتے ! ہونٹوں کے ساتھ "لپک" فیض صاحب بار بار لاتے ہیں، محبوب کے ہونٹوں کا "لپکنا" اس میں کتنی ہوسناکی اور بازاری پن پایا جاتا ہے !- "کیوں راز کرو" اگر اس میں کتابت کی کوئی غلطی نہیں ہوئی تو یہ بالکل مہمل جملہ ہے ! "کیوں دوش دھرو" یعنی کیوں کسی پر تہمت جوڑو اور الزام دھرو، یہ مفہوم اس نظم میں کوئی معنی نہیں دے رہا ہے ! محبوب کی آنکھوں کو "سمندر" کہنا، ذوقِ جمال کی توہین ہے، پھر اُس کی سمندر آنکھوں میں شام کا سورج کس طرح ڈوبے گا ؟ یہ کیا اشاریت ہے، اور کیسی منظر آرائی اور مشاہدات کی عکاسی ہے ! اس طرح کون بولتا ہے "وہ سکھ سو رہا ہے" چین سو رہا ہے یا آرام سو رہا ہے، سکھ کی نیند سو رہا ہے، چین اور آرام سے سو رہا ہے، یہ ہے روزمرہ اور صحیح زبان ! اس نظم کے اختتام پر "راہی" ایک دم کہاں سے آگیا، شام ہونے کے بعد مسافر ستایا کرتے ہیں "اپنی راہ نہیں لیا کرتے" یعنی سفر نہیں کیا کرتے۔

بہت سنبھالا وفا کا پیماں، مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے، تمام پیغام بجھ گئے ہیں　　　(ص ۶۵۲)

۔ وفا کا پیمان سنبھالا" یہ کیا اندازِ بیان ہے ! برکھا کس چیز کی برکھا ہے کہ جس سے ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے۔ اقرار کیا کوئی زمین پہ بنایا ہوا پیکر اور نقش ہے، جسے برسات کے پانی نے دھو دیا اور مٹا دیا ہے۔ "پیغام بجھ گئے ہیں" یہ مہمل ہے مگر وجدان اور ذوقِ سلیم کے لئے کس قدر اذیت کوش ہے !

غروب آ اے مہِ شبِ غم ! نظر یہ کھلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے کون سے نام بجھ گئے ہیں

چاند کا بجھنا، پیغام کا بجھنا، نام کا بجھنا ... یہ فیض صاحب کی "طرزِ ایجاد" ہے مگر اہلِ ذوق کے حلقوں میں اسے قبول اور پسندیدگی حاصل نہیں ہو سکتی ! ہاں ! ترقی پسند اس کا خیر مقدم کریں گے ! کہ اُن کے ذوق اور فکر و خیال کا یہی رنگ ہے !

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی، ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہگذار چلے گئے (ص ۶۵۴)

سر کو طلب کون کرتے تھے ؟ پھر "سرِ رہگذار چلے گئے" سے شاید یہ مراد ہے کہ فٹ پاتھ پر یعنی راستہ کے کنارے کنارے چلے گئے ! دوسرا مصرعہ خیال و اظہار کی بری مثال ہے !

نہ سوالِ وصل نہ عرضِ غم نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

مصرعہ ثانی مکروہ ہے، "سبھی اختیار چلے گئے" خاص طور سے محلِ غور ہے ۔

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا (ص ۶۵۵)

غزل کا مطلع اور اس قدر بے کیف، بے لطف، کانا کا اور غلط و مبہم ! مصرعہ اولیٰ میں "گنواؤ" کی تکرار ناگوار و قبیح محسوس ہوتی ہے ! شاعر غالباً محبوب سے یہ کہتا ہے کہ میرے پاس جو دل ریزہ ریزہ تھا وہ میں نے کھو دیا، اب تم اُس کی جانب ناوکِ نیم کش پھینک کر اپنے تیر کا کیوں ناحق نقصان کرتے ہو ! بات تو سمجھ میں آگئی مگر بات کس بُرے انداز میں کہی گئی ہے، مصرعہ ثانی نرا مہمل ہے ! کوئی معمولی درجہ کا شاعر سوتے میں بھی ایسے غلط اور مہمل مصرعے نہیں کہہ سکتا، پھر یہ "سنگ" کہاں سے آگئے، شاید فیض صاحب کا محبوب کمان سے ناوک اندازی کے ساتھ غلیل یا گوپھن سے پتھر بھی پھینکتا جاتا ہے ! "تنِ داغ داغ لٹا دیا" اس ٹکڑے نے شعر کو اور زیادہ بے آبرو کر دیا ۔

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن، پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

پیشانی پر کلاہ کا کج کرنا تو شان و تمکنت کی علامت ہے مگر کفن کا کنارا اگر پیشانی پر ٹیڑھا کر دیا اور جھکا دیا گیا تو اس سے کیا مُردہ کی شخصیت کا طمطراق ظاہر ہو سکتا ہے، "غرورِ عشق" تو درست ہے مگر "غرورِ عشق کا بانکپن" کیا ہوتا ہے ! پورا شعر سطحی اور پست ہے !

ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے دھوکے دیئے کیا کیا ہمیں بادِ سحری نے (ص ۶۵۶)

اُس بزم میں دیکھے تو کوئی مری حیرانی — کیا سوچ کے آیا تھا کیا منہ سے نکلتا ہے

اس مقالہ میں فیضؔ کا یہ شعر بھی نظر آیا۔

یا یوں ہی بجھ رہی ہیں شمعیں — یا شب ہجر ٹل چلی ہے

"ٹل چلی ہے" نے شعریت کو خاک میں ملا دیا۔

جناب جمیلؔ جالبی فرماتے ہیں ۔

"فیضؔ کی شاعری کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ خیالات کی پختگی شخصیت کا توازن پن، ذہنی ٹھہراؤ اور شعری اعتدال ہے" (ص ۳۷۵)

"شخصیت کا متوازن پن" کس بلا کا نام ہے، "ذہنی ٹھہراؤ" سے آخر کیا مراد ہے، "شعری اعتدال" کیا چیز ہے ـــــ فیضؔ صاحب کے مبہم اور مہمل شعروں کا رنگ اس عبارت میں جھلک رہا ہے۔

"اس کی شاعری براہِ راست جذبات سے اپیل نہیں کرتی، بلکہ آہستہ آہستہ دل و دماغ میں اپنا گھر کرتی ہے اور قاری کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور خاموش رہنے پر مجبور کر دیتی ہے" (ص ۳۷۶)

کس شاعر کی شاعری ذہن قاری کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی! پھر یہ عجیب بات بیان کی گئی ہے کہ فیضؔ کی شاعری "خاموش رہنے پر مجبور کر دیتی ہے" یعنی دوسرے شاعروں کی شاعری چیخنے چلانے پر اکساتی ہے۔ !

"اس کی شاعری ایک ایسے چور کی طرح ہے جو رات کی بہت افزا تاریکی میں دروازے پر بیٹھے ہوئے خونخوار کتے کو گوشت کا ٹکڑا ڈال کر مکان میں داخل ہو جاتا ہے . . ."

وہ شاعری کیا ہوگی، جو خونخوار کتے کو گوشت کا ٹکڑا ڈال کر مکان میں داخل ہو جائے! یہ مدح ہے یا ذم اور تجزیہ ہے! یہ شعر کے بارے میں سوچنے کا یہ انداز!

ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

جمیلؔ جالبی کے اس اسلوبِ تنقید سے متاثر ہو کر آنے والے نقاد یوں لکھا کریں گے ـــــ غالبؔ کی شاعری ایسی ہے، جیسے کوئی شخص گلی میں کھیلتے ہوئے بچے کے ہاتھ پر ریوڑیوں کا دونا رکھ کر کسی فلیٹ کے زینہ پر چڑھ جائے ـــــ مومنؔ کی شاعری ایسی ہے جیسے مرغی کے سامنے چارہ ڈال کر کوئی چھپ جائے

"فیضؔ نفسیات کا شاعر ہے" (ص ۳۷۷) کسی ایسے شاعر کا نام بتا دیجئے جو "نفسیات" کا شاعر نہ ہو! پھر فرماتے ہیں ۔ —

"فیضؔ لطیف جذبوں کا شاعر ہے"

اور بعض شعرا دبیز جذبوں کے شاعر ہوتے ہیں! واہ میاں جالبیؔ!؟

". . . وہ یہ بات ضرور ذہن نشین رکھے کہ بحیثیت انسان وہ شاعر بھی ہے اس لئے اپنے جذبات میں سیاسی، ملکی و قومی تاثرات کو شاعرانہ لہجہ میں ڈھالے، تاکہ بیک وقت شعر و سیاست کا بہترین امتزاج اور مکمل اختلاط کا رابطہ استوار رہ سکے" (ص ۳۷۷)

و عبارت میں کس قدر کچا پن" پایا جاتا ہے! جمیل جالبی صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں ـــــ

"فیض کے سیاسی اشعار میں شعریت، شاعرانہ بہاؤ، رنگین لہجہ، لطیف و خوشگوار احساسات، دائمی ارتسامیت

درھم جذبات اور منطقی سلجھاؤ، کامیاب امتزاج کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے ہیں . . ."

شاعرانہ بہاؤ" اور پھر " دائمی ارتسامیت" اس اسلوبِ نگارش کا بھلا کوئی جواب ہے! اتنا کچھ فرمانے کے بعد "منطقی سلجھاؤ" ایک ترکیب ذہن میں آئی وہ بھی جھٹ سے لکھ ڈالی! اُن کے ذوقِ ادب اور شعر فہمی کا یہ عالم ہے کہ فیض صاحب کے علاوہ علی جواد زیدی کے یہ پست اشعار بھی مثال کے طور پیش کئے ہیں ـــــ تقابلی انداز میں!

مفقود و فنا ہو جائیں گے جو ظلم و ستم کے خوگر ہیں

افلاس بچائے گا اُن کو جو نادار کے یاور ہیں

مزدوروں نے کی ہے صدیوں سے دنیا بھر میں تیاری

ہٹ جائے گی یہ فسطائیت شاہنشاہی سرمایہ داری

ایسا ہی زمانہ آتا ہے ایسا بھی زمانہ آئے گا (ص ۳۷۹)

مفقود" نظم کیا جا سکتا ہے مگر سلیقہ کے ساتھ!" افلاس بچائے گا ان کو" ـــــ پھر دوسرا ٹکڑا " جو ناداروں کے یاور ہیں" اس مصرعہ میں کوئی لطف اور جان نہیں! یہی حال بعد کے دونوں مصرعوں کا ہے! اس کے بعد جمیل جالبی نے فیض کے وہ شعر درج کئے ہیں، جن کو کوئی صاحبِ ذوق نقاد منتخب کر ہی نہیں سکتا۔

ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب

بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت

شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے

یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے

فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لئے کہتا ہے

دوسرے دو شعروں پر ہم تنقید کر چکے ہیں! شعر نقل کرتے ہوئے ان کے دوسرے عیوب سامنے آئے ـــــ مثلاً یہ کہ شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو اسی وقت بہتا ہے جب بازار میں مزدور کا گوشت بکتا ہے . . . ! حالانکہ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ ایک طرف مزدور کا گوشت بازار میں فروخت ہوتا ہے، دوسری طرف غریبوں کا لہو سڑکوں پر بہتا ہے!

جمیل جالبی نے اشتراکی شعراء میں فیض کے علاوہ مخدوم محی الدین، علی جواد زیدی، ساحر لدھیانوی اور علی سردار جعفری وغیرہ کا ذکر کیا ہے! اسی ضمن میں وہ لکھتے ہیں ـــــ

"کوئی شاعر براہِ راست یا بالواسطہ روس کے نظریات سے متاثر ہو یا نہ ہو یہ خیالات جزوِ شاعری بنا ہے

کیونکہ یہ زمانہ کی سب سے بڑی ضرورت، وقت کی سب سے بڑی پکار اور تاریخی تقاضا ہے۔ (ص ۳۷۹)"

نی کتاب "پاکستانی کلچر" میں وہ اسلام کو ایک انقلاب آفریں امانت و ابدی دین اور دستورِ حیات بنا کر پیش کرتے ہیں — آخر یہ تضاد
یں جمیل جالبی نے ساحر لدھیانوی کی نظم "تاج محل" کا یہ بند بھی اپنے مقالہ میں نقل کیا ہے —

میری محبوب پسِ پردۂ تشہیرِ وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مُردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا (ص ۳۸۰)

تشہیر بُری شہرت کو کہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں بادشاہوں کے حکم سے بعض مجرموں کو گدھے پر بٹھا کر اور اُن کا منہ کالا کر کے گلی کوچوں میں — مروں کو عبرت حاصل کرنے کی غرض سے گھمایا جاتا تھا، اسے تشہیر کہتے تھے۔ حیدرآباد دکن میں البتہ یہ لفظ تشہیر ——— ADVERTISEMENT کے معنی میں بولا جاتا ہے، بہرحال ساحر لدھیانوی "تشہیر" کے صحیح معنی نہیں جانتے، اُن کا یہ مصرعہ —

تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوگا

قدر کمزور ہے۔ فیض صاحب بھی "سطوتِ اسباب" نظم کیا ہے، جو بے معنی ہے، ہم اس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔ الفاظ کے اب و استعمال کے معاملہ میں "ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں" کا قریب قریب ایک ہی جیسا مزاج اور ذوق ہے۔

فیض کی جو اچھی نظمیں ہیں، اُن میں بھی خاصے کمزور مصرعے آگئے ہیں اور الفاظ کا استعمال سلیقہ کے ساتھ نہیں ہوا مثلاً یل جالبی نے اُن کی ایک نظم نقل کی ہے —

ہزار فتنے تہِ پائے ناز، خاک نشیں
ہر اک نگاہ خمارِ شباب سے رنگیں
شباب جس سے تخیل پہ بجلیاں برسیں
ادائے لغزشِ پا پر قیامتیں قرباں
وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اترائے
زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے
وہ ہونٹ فیض سے جن کے بہارِ لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش (ص ۳۸۷)

س نظم میں یہ مصرعہ —

زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے

وئی شک نہیں لاجواب ہے، مگر دوسرے مصرعہ میں انھوں نے "نگاہ" کو "چشم" کے معنی میں استعمال کیا ہے، خمار سے نگاہ نہیں آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ جلیل رام پوری کا شعر ہے —

ہوا چلی کہ جو بادل چھا گئے ہیں مری آنکھوں میں ڈورے آ گئے ہیں

چند مصرعوں "دوار کی رفاقت میں جو نقوش خیال برساتی ہیں" آپ دیکھیں کس قدر تکلف پایا جاتا ہے اس مصرعہ میں۔

وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اترائے

"بناؤ" کی جگہ "بناوٹ" موزوں تر لفظ تھا فیض صاحب "بناؤ" اور "گھاؤ" کو ... بُری طرح شعروں میں استعمال کرتے ہیں جن کا تلفظ لطف پر گراں گزرتا ہے! غالب کا شعر ہے —

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

"بناؤ" شعر میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے!

"فیض کے یہاں بھی بہت سی تراکیب و استعارات اور تصویریں ایسی پائی جاتی ہیں جو بالکل نئی اور جدید ہیں! اس قسم کی تراکیب اور تصویروں میں شعریت اپنے سولہ سنگھار کے ساتھ جلوہ افروز نظر آتی ہے ... " (ص ۳۹۰)

نقاد کے ذوق کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہے کہ —

"تاریک بیمانہ طلسم، بے خواب کواڑ، بے نام گراں بار ستم، چشم تن آسان، پراسرار کڑی دیواریں، آتش مہر گزیدہ ... "

جیسی بے مزہ اور وجدان کو کھٹکنے والی ترکیبوں میں شعریت کا سنگھار نظر آتا ہے! ہم ہر ترکیب پر گفتگو کریں گے تو بات بہت طول ہو جائے گی مگر جب بات چھڑی ہے تو کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑے گا — "کڑی دیوار" کیا ہوتی ہے؟ غالباً سخت دیوار مراد ہے۔ مگر عام طور پر دیوار یا مکان کو جو سخت اور مضبوط ہو "کڑا" نہیں بولتے، پھر "کڑی دیوار" یا "کڑا" — "کڑی دیوار" یہ نئی ترکیب کیا ہوئی؟ "بے نام گراں بار ستم" مہمل ترکیب ہے! "اجنبی خاک" ایسی ترکیب نہیں ہے جس کی تحسین کا سہرا فیض کے سر باندھا جائے! "چشم تن آسان" ایسی ترکیب ہے جو مشکل ہی سے گوارا کی جائے گی، مقبول ہونا تو بڑی بات ہے۔ احسن صاحب کو کون بتائے کہ نئی ترکیبوں کا کیا مزاج اور کیا ہیئت ہوتی ہے!

میرا ایک شعر ہے —

الجھیں ترے رخسار سے گستاخ نگاہیں
تو اور ہو مجروح تماشا مرے آگے

"مجروح تماشا" اردو زبان و ادب میں یہ بالکل نئی ترکیب ہے، جس کے قبول کرنے میں ذوقِ سلیم ذرہ برابر تامل نہیں کر سکتا — اس شعر کو مثال میں پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نئی ترکیبیں اس نہج و انداز پر بنائی جاتی ہیں۔

بعض جگہ انہوں نے فیض صاحب کے چند مصرعوں میں زبان کی غلطیاں بھی نکالی ہیں، کاش وہ ان مقامات سے آنکھ بچا کر جلدی سے نہ گزر جاتے!

"مریض کی داخلیت زندگی کے تجربے سے آزاد اور اپنے خول میں بند ہوتی ہے، زندگی کی وسعت بے پایاں سے آنکھیں چرا کر وہ ایک ایسی نفرت کا شکار ہو جاتی ہے جو اندر ہی اندر خود اپنے خالق کا

کفن بنتی ہے، لیکن فیض کی داخلیت پسندی اُردو شاعری کا واضح سمیہ ہے جو اُسے شعراء کے ایک خاص
گروہ سے منسلک کرتا ہے۔ (ص ۲۲۴)

یہیں انجم اعظمی صاحب ان کے مقالہ کا آغاز ہی اس عبارت سے ہوتا ہے، جو ژولیدگی اور ابہام کا "ترقی پسندانہ" نمونہ ہے! ——
صفحہ ۲۲۷ پر لکھتے ہیں ——

"— فیض اس سطح کا شاعر نہیں ہے، وہ ایک خوب صورت لہجہ کا شاعر ہے، اس کے یہاں ادراک کے بجائے
سیاسی شعور کی منزل ہے"

لہجہ اور آواز کی چونکہ کوئی صورت نہیں ہوتی، لہٰذا اُسے خوب رُو اور خوب صورت "نہیں حسین" کہنا چاہئے! اس فکر کا اور اظہار بیان کا بھی بھلا کوئی جواب ہے کہ فیض کے "یہاں ادراک کی بجائے "سیاسی شعور کی منزل ہے"! ترقی پسندوں نے تنقید اور شاعری کو اِس طرح الجھا دے میں ڈالا اور اُن کا حلیہ بگاڑا ہے —— کوئی صاحب سابق میجر اسحٰق محمد صاحب ہیں، وہ لکھتے ہیں ——

"..... اسی لئے ایسے کنائے جو کسی یا تشبیہی طور پر مستعمل ہوتے رہتے ہیں جیسے خدا، شیطان،
جبرئیل، جنت، دوزخ، آدم و حوا اور اسی قبیل کے دوسرے استعارے آج کی دنیا کے لئے ناقابل فہم ہیں (ص ۴۴۳)

ابھی نہ جانے یہ منحوس وقت اور سخت گھڑی نہیں آئی ہے کہ خدا، جبرئیل اور جنت و دوزخ کے استعارے دُنیا کی سمجھ میں نہ آسکتے ہوں، سابق میجر صاحب کی یہ نافہمی ہے جو وہ ایسا سمجھتے ہیں!

احتشام الرحمٰن صاحب نے اپنے مقالہ میں فیض کی ایک نظم "ملاقات" درج فرمائی ہے ——

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے
وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
(وہ غم جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں کی آنچ
میں تو یہی شرر ہے　　　(ص ۵۴۴)

"نہرِ خوں" سے آخر شاعر کی کیا مراد ہے؟ پھر وہی نہرِ خوں شاعر کی صدا بھی ہے! اس پر مستزاد یہ کہ اسی نہر کے سائے میں، محبوب کی نظر جو "موجِ زر" ہے نور گر بھی ہے! پھر باہوں کا کوئی گلستاں ہے، جس میں کوئی غم بھی سلگ رہا ہے! یہ ابہام نہیں اہمال بلکہ یاوہ گوئی ہے!

امجد کنیانی صاحب لکھتے ہیں ——

"فیض بنیادی طور پر احساسات و تاثرات کے شاعر ہیں" (ص ۵۴۳)

"منظوم" یا "طبعاً" اور "مزاجاً" کی بجائے ترقی پسند ادیب اور نقاد کچھ دنوں سے "بنیادی" لکھنے لگے ہیں! اور یہ غلط رواج پڑ گیا ہے:

دیارِ یار تری جوششِ جنوں پہ سلام
جلال فرقِ سرِ دار کو نظر نہ لگے　　　　(ص ۵۴۴)

یہ لغو و مہمل شعر بھی آہنگ کندیانی صاحب نے اپنے مقالے میں نقل فرما کر اپنی بد مذاقی کا ثبوت دیا ہے۔

"وہ ان سب حالات پر غور کرتے ہیں، ان سے متاثر ہوتے ہیں، لیکن ضبطِ محبت، شرطِ اولین محبت ہے، وہ جھنجھلاہٹ اور چیخ و پکار میں یکسر مصروف نہیں ہوتے، بلکہ اسے ایک سنجیدہ اور ملائم انداز میں ادا کرتے ہیں، اُن کے اسلوب میں ٹھہراؤ کے ساتھ متانت بھی ہوتی ہے . . ." (ص ۵۵۲)

یہ ساحر الہ آبادی کے مقالے کی عبارت کا اقتباس ہے، جس میں کس قدر الجھاؤ پایا جاتا ہے، جو لوگ خود اس قسم کی الجھی ہوئی کاواک عبارتیں لکھتے ہیں اور اپنے مفہوم کو اچھے پیرایہ میں ظاہر کرنے کا سلیقہ نہیں رکھتے، انہیں کسی شاعر کے کلام میں ژولیدگی، ابہام اور اہمال کا کیا احساس ہو سکتا ہے، یہ تو ان کا مرض ہے مگر میں یہ امتیاز نہیں کر سکتا۔

محمد حسین آزاد، حالی اور شبلی شاعر بھی تھے اور نقاد بھی تھے، ہمارے اس دور کے بیشتر اہلِ قلم نقاد ہیں مگر شاعر نہیں ہیں، اس لئے نہ تو شعر کے اصل جوہر اُن کو نظر آتے ہیں اور نہ شعر کے عیوب پر اُن کی نگاہ جاتی ہے، اُن کا قلم انگریزی لٹریچر کے مطالعہ کا سہارا لے کر چلتا ہے، اس لئے ان کے مضامین میں بعض مقامات پر تو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ مضمون نہیں لکھ رہے ہیں ترجمہ فرما رہے ہیں! مولانا الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی کی تنقید پڑھتے ہوئے طبیعت کو کس قدر شگفتگی اور فرحت و انبساط محسوس ہوتا ہے، شعر کا صحیح تجزیہ، محاسن کی دلنشین تشریح، معائب پر واقعی گرفت! مگر ان جدید تنقید نگاروں کے مضامین میں ذوق و وجدان کو کہیں حیرانی ملتی ہے، کسی جگہ طبیعت گھٹاوٹ محسوس کرتی ہے اور کہیں دماغ تشویش میں مبتلا ہو جا

فیض نمبر کے کتنے ہی لکھنے والوں کی شعر فہمی اور ذوقِ شعری کا یہ رنگ ہے کہ انہوں نے فیض کے سطحی اور مہمل اشعار تک کو نمونہ بنا کر پیش کیا ہے، اُن جوہریوں کو کیا کہیے، جن کی نگاہ لعل و گہر اور خزف ریزوں میں تمیز نہ کر سکے، نئی نسل اس قسم کے مضامین اور شاعری کو پڑھ کر شعریت اور ادبیت سے عاری ہوتی چلی جا رہی ہے اور زبان و بیان اور اظہار کے نقص کو لوگ خوبی سمجھنے لگے ہیں، اس طرح فکر و نظر کے زاویے ٹیڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔

فیض کی ایک پوری نظم کا ہم ذیل میں تجزیہ کرتے ہیں:—

"اے روشنیوں کے شہر"

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے، تنہائی کا زہر
دور افق تک گھٹتی بڑھتی، اٹھتی گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر

"دھوپ کے سوکھنے سے آخر شاعر کی کیا مراد ہے؟ کیا دھوپ بھیگا بھی کرتی ہیں؟ پھر دھوپ کا ذکر کرتے کرتے یہ "تنہائی" کہاں سے آ گئی جس کا زہر دیواروں کو چاٹ رہا ہے! اول تو تنہائی کا زہر ہی محلِ نظر ہے پھر اُس کا دیواروں کو چاٹنا اور زیادہ کھٹکتا ہے۔

تیسرے مصرعہ کے آخری ٹکڑے ـــــ گرتی رہتی ہے ـــــ میں اُس لہجہ اور آہنگ نے دم توڑ دیا، جو "دو بہر" اور "ہر میں" پایا جاتا ہے۔ "سد" کی جمع "سددوں" اردو میں نہیں آتی، ہاں! اردو نظم کے لئے یوں بولتے ہیں ـــــ اُس عورت کے سدہو رہے ہیں ـــــ ! "سددوں" نظم کی جدت نما رہا ہے! پھر سددوں کی گرد لہر کیا ہوتی ہے! اچھی ترکیب! کیا سد کی لہر دکھائی دیتی ہے جو گدلی ہو کر کہر کی مانند بے رونق ہو گئی ہے

بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

اے روشنیوں کے شہر
کون کہے کس سمت سے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے، ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ
آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر

نہ جانے "روشنیوں کے شہر" سے کس رمز و علامت کا اظہار مقصود ہے! خیر! پھر اُس روشنیوں کے شہر سے اس طرح خطاب کیا جا رہا ہے۔

کون کہے کس سمت سے ہے تیری روشنیوں کی راہ

شاعر نہ جانے کیا کہنا چاہتا ہے یہ کہ اُس شہر کی روشنیوں کو اس کہر آلود فضا میں آنے کی راہ نہیں ملتی، یا اس فضا کے رہنے والوں اور ہجر و تنہائی کے مارے ہوؤں کو روشنیوں کے شہر میں پہونچنے کی سبیل نظر نہیں آتی!

"شوق کی ماند سپاہ" ـــــ نری مہمل ترکیب! نہ ماندہ یا تھکی ماندی سپاہ کہنا چاہئے تھا، یہ "ماند سپاہ" کیا ہوتی ہے! ـــــ نور اللغات ہمارے سامنے ہے اس میں "ماند" کے حسب ذیل معنی لکھے ہیں ۱۔

"ماند، (مؤنث) گوبر کا ڈھیر، سرگیں، جیسے اُپلوں کی طرح جلاتے ہیں ۲۔ غار، بھٹ، کھوہ ۳۔ صفت وہ چیز جس کی آب و تاب جاتی رہی ہو۔"

نظم کا آخری بند ہے ـــــ

بخشے میں سونے روپے کے جھلے حضور میں
ہے جس کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند

شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی ان سب سے کہہ دو
آج کی شب دیئے جلائیں اونچی رکھیں لو

نظم کے تمام بندوں میں "تنہائی کا زہر" دل اور سددوں کو چاٹ رہا تھا، آخری بند میں "شب خوں" نہ جانے کہاں سے آ گیا؟ آخر یہ "شب خوں" کون مار رہا ہے! روشنی، پھر کہاں کا ارمانوں کی رو، شب خوں سے منہ پھیر جائے...! کس قدر پھس پھسا انداز بیان ہے! پھر اس بند کے دوسرے مصرعہ میں "لیلاؤں" کہاں سے ٹپک پڑیں! اس نظم کا آخری مصرعہ بس اچھا ہے، باقی تمام نظم بے روح، بے جان ہے اور بے لطف ہے، خیال، اظہار، لفظوں

ن اور ہندوستان کی اُردو داں نئی نسل اس سے متاثر اور مرعوب ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ فیض کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے ۔

انگریزی دورِ حکومت میں سیاسی آزادی کی غیر مسلح جنگ میں ہزاروں کارکنوں، لیڈروں، عالموں، مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں نے قید و بند
یں جھیلی ہیں، اُردو شاعروں میں صرف احمق پھپھوندوی کو یہ عزت حاصل ہوئی کہ انگریزی سامراج پر اپنی شاعری میں انہوں نے جو طنز اور چوٹیں کی تھیں
پاداش میں انہیں دھر لیا گیا اور کئی سال کی قید انہیں کاٹنی پڑی ۔ فیض صاحب کو پاکستان میں کسی اصلاحی یا انقلابی نظم یا مضمون لکھنے کی
نار نہیں کیا گیا، وہ راولپنڈی سازش کیس میں ماخوذ تھے اور اس سلسلہ میں انہیں چار سال جیل خانہ میں رہنا پڑا، یہ سازش اگر خدانخواستہ کامیا
تو شہید ملت لیاقت علی خاں مرحوم یا تو گرفتار ہو جاتے یا قتل کر دئے جاتے اور اس کے بعد اس ملک میں جو انقلاب آتا وہ نہ پوچھئے کہ کتنا خوفناک
ہوتا! مشہور کمیونسٹ لیڈر سجاد ظہیر بھی اس سازش میں ملوث تھے ۔ اس اعتبار سے فیض صاحب کی یہ قید و بند کی زندگی کمیونسٹوں کی نگاہ
ں "کارنامہ" ہو تو ہو مگر ہر پاکستانی محبِ وطن کا ضمیر اس میں خلش اور بیزاری محسوس کرے گا اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

فیض صاحب کے جو اشعار تحسین و ستائش کے مستحق ہیں اُن کا انتخاب ہم اوپر دے چکے ہیں، ان میں سے بعض اشعار ہم نے کئی بار لطف لے کر
، مگر مشہور اشتراکی شاعر ظہیر کاشمیری کے اس شعر،

یہ جانتے ہیں کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

ے ذوق و وجدان کو جتنا متاثر کیا ہے، فیض کے کسی شعر نے اتنا متاثر نہیں کیا ۔

کراچی میں بعض ایسے شاعروں کو ہم جانتے ہیں، جن کو شہرت کے مواقع میسر نہیں آئے اور جن کے منتخب اشعار، ہم فیض صاحب کے اچھے شعروں کے
ہیں بلا دریغ پیش کر سکتے ہیں، مثلاً وفا راجپوری کا یہ شعر ——

جاؤ تو روک سکتے نہیں، آؤ تو فرشِ راہ
ہم بچھ رہے ہیں سایۂ دیوار کی طرح

ن میمنی کی غزل کا یہ مطلع ——

فریبِ وقت نے گہرا حجاب ڈالا ہے — وہاں بھی شمع جلاؤ جہاں اُجالا ہے

فیض کی غزلوں اور نظموں کا جو خاص رنگ اور آہنگ ہے اُسی انداز پر ہم نے یہ مضمون لکھتے ہوئے ایک ہی مختصر سی نشست میں فی البدیہہ مندرجہ
اشعار موزوں کئے ہیں ۔

آج زنداں کے در و بام پہ پھیلی تھی سحر
لیکن اس طرح کہ جیسے کسی مدفون کی چال
روزنِ در سے جو چھن کر تری یاد آتی ہے
آج بکھرایا ہے آنکھوں نے عبیر اور گلال

وہ ظلم و ستم، جور و جفا کرتے رہیں گے — ہم فرضِ محبت کو ادا کرتے رہیں گے
یہ لالہ و گل ہیں وہ شفق ہے یہ مرا دل — کس کس کو وہ رنگین قبا کرتے رہیں گے

اس دھا کے ہم لوگ خداوند جو ٹھہرے
ہم پہ درشن اور درس دیا کرتے رہیں گے

اہلِ دل کے کارنامے چھپ نہیں سکتے کبھی
ان کو ہونا ہے فروزاں ماہ و انجم کی طرح
باغبانوں کے بگڑتے تیوروں کو دیکھ کر
ہیں ابھی پھول خاموش کلیوں کے تکلم کی طرح
روزِ فردا کی ابھی سے پڑھ رہا ہوں سرخیاں
صبح ابھرے گی سمندر کے تلاطم کی طرح

گنگناتی ہوئی آئی ہوں کہ مجھے کہنا ہے
جھلملاتی ہوئی رہی ہوں کہ مجھے کہنا ہے
کیف برسائی نگاہوں کے مجھے کہنا ہے
پارسائی کے گناہوں کے مجھے کہنا ہے
ایک پیغام کہ جس کا کوئی عنوان نہیں، نام نہیں، کام نہیں
یہی پیغام ہے خنجر یہی پیغام صلیب
یہی مقتل یہی گلزار یہی کوئے حبیب
آرزوؤں کا پیمبر وہ تمنا کا نقیب
غم کا پالا ہوا آغوشِ محبت کا ربیب
ایک پیغام جہاں صبح نہیں، شام نہیں، بادہ نہیں، جام نہیں

درد کا چاند بجھا خسم کا ستارہ ٹوٹا
کتنی بے رنگ سی ہے رات کی زرتار جھنک
نرمیِ دستِ حنا اپنی جگہ خوب مگر کیا کیجے
وہی سینہ میں خلش ہے وہی سانسوں میں کھٹک
میرے محبوب ابھی اور ذرا دور رہو، دور رہو، دور رہو

دہر میں اور بھی غم ہیں غمِ جاناں کے سوا
الجھنیں اور بھی ہیں زلفِ پریشاں کے سوا
سنگریزے بھی ہیں یاں لعلِ بدخشاں کے سوا
اور خطرے بھی ہیں رسوائی داماں کے سوا
میرے محبوب ابھی اور ذرا دور رہو، دور رہو، دور رہو

یہ شام اُس شاخ کا ثمر ہے
جو مجھ سے تجھ سے بلند تر ہے
بلند تر ہے کہ اُس کے سائے
میں کتنی دھوپوں کے آبگینے

بدل گئے ہیں، پگھل گئے ہیں
افق سے آگے نکل گئے ہیں

یہ شام اُس شاخ کا ثمر ہے
جو مجھ سے تجھ سے بلند تر ہے

فلک ہمیں کیا پیام دے گا
زمیں ہی سب کچھ ہے تیرے پیارو
یہیں کے ہر نقش کو اُبھارو

یہ دھوپ چھاؤں یہ نور و ظلمت
ابھی فسانہ، ابھی حقیقت

اسی کو کرنا ہے جاودانی
کہ زندگی موڑ پر کھڑی ہے
جنوں کو آواز دے رہی ہے

ب)

تمام حسن کو حسنِ خیال کہتے ہیں — یہ بدر ہے مگر اس کو ہلال کہتے ہیں
عجیب شہر ہے شہرِ سمن براں کہ جہاں — نگاہِ شوق کو دستِ سوال کہتے ہیں
وہ آئے طوق و سلاسل کے لے کے گلدستے — جو نسل نگاہ کو دشتِ غزال کہتے ہیں
بنامِ یادِ نگاراں برنگِ غنچہ و گل — خموش رہتے ہیں اور اپنا حال کہتے ہیں

یہ واعظانِ قبا پوش و مفتیانِ کرام
عروجِ مہر کو وقتِ زوال کہتے ہیں

ہیں کہ اردو کے ادب و صحافت پر ترقی پسندوں اور نیم ترقی پسندوں کو بہت کچھ تسلط و غلبہ حاصل ہے ہماری اس تنقید پر نہ جانے کد
نکن آلودہ ہو جائیں گی۔ مگر ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے عواقب سے بے پروا ہو کر ہمیشہ حق گوئی کا فرض ادا کیا ہے اور اس تنقید کی صورت
س فرض سے سبکدوش ہو رہے ہیں!